
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

سب رنگ

مُدیر ـــــ شکیل عادل زادہ

اِدارۂ تحریر

حسن ہاشمی ـــ شاہد اسماعیل اعوان

نائب مُدیر ـــــ انور شعور

اِشتہارات

صابر حسین ـــــ یوسف میمن

طباعت ـــــ معروف حسین صدیقی

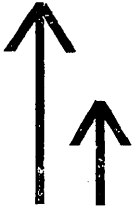
اِشاعت ـــــ محمد یوسف

قانونی مُشیر ـ مُبارک حسین صدیقی ایڈووکیٹ



صفحہ	مصنف	عنوان	تعارف
۱،۹	اداریہ / شکیل عادل زادہ	کمیت / ذاتی صفحہ	
۲	محبوب اظہر	زرکن	ایک دل چسپ اور انوکھے مقدمے کی رُوداد ایک حسین عورت کی کہانی جس پر حسبِ دستور بے وفائی کا الزام تھا
۲۰	سعادت حسن منٹو	مسٹر معین الدین	نوشتۂ حیاتی اُردو کے زندۂ جاوید ادیب سعادت حسن منٹو کے قلم سے ایک عبرت انگیز کہانی
۲۶	شاہد جعفر	گوشہ	ایک نرم و نازک اور حساس کہانی
۳۳	جوگندر پال	قبضہ سچا	ایک مسئلہ ، ایک کہانی ممکن ہے آپ بھی اس مسئلے سے دوچار ہوں
۳۵	احمد ندیم قاسمی	ہذا من فضلِ ربی	سب رنگ کی منتخب کہانیاں اُردو ادب کا عطر ہیں اس ماہ کے لیے اُردو کی دُوسدا بہار کہانیاں نئے عہد کی ایک کہانی
۴۱	خواجہ احمد عباس	پس ماندگان	اُس شخص کا قصہ جو ایک جزیرے میں رہتا تھا اُردو کی دُوسری منتخب کہانی
۴۴	کینول سوری	شہ مات	وہ تیسرا آدمی جو ہر جگہ موجود رہتا ہے ایک ریٹائرڈ کرنل کی داستانِ زندگی
۵۲	ابوالمنصور سرمدی	حق باہُو یاہُو	اندھیری دُنیا کی روشن باتیں سُلطان باہُوؒ سوانح ، کرامتیں
۶۸	فوزیہ ناہید	شہتیر	سمندر پار سے ۳ نمکین رنگین مختصر مختصر کہانیاں ایک پُرانا قصہ جو ہمیشہ لوگ بھول جاتے ہیں
۷۲	عطیہ نسرین علوی	چارہ گر	ایک افریقی جزیرے میں پیش آنے والا عبرت رنگ واقعہ سمندر پار سے دُوسری مختصر مختصر
۷۵	آفتاب محمود	قرض	ایک با اصول ادیب کے ایک شخص کی کہانی سمندر پار سے تیسری ، مختصر مختصر
۷۷	میر جمشید عالم	امبر بیل	سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ میر جمشید عالم کی زندگی کے عجیب غریب واقعات فرض کیجیے اگر آپ اس نوجوان کی جگہ ہوتے !
۱۱	اشرف صبوحی	پاگزشت	کوئی زمانہ کے بعد اُجڑے دیار کی ایک دُوسری عبرت اثر تاریخی داستان ایک مُغل شہزادے کے عشق کی رُوداد
۱۱۲	انور خواجہ	اکل حلال	ہزارہ کے جنگلوں کا دل چسپ واقعہ شکر حرام کے بعد انور خواجہ کی دُوسری کہانی
۱۲۱	بابر زمان خان	بازی گر	سینہ فگار دلوں کے لیے ایک آدمی کی عبرت ناک سرگزشت بابر زماں خاں کی آپ بیتی ، جگ بیتی
۱۵۲	نفیس انصاری	آخری کھیل	ایک سرکش نوجوان کا قصہ مغرب سے درآمد ، تازہ تر ، کم وقت بالا اثر تحریریں
۱۵۷	اظہر کلیم	بازیچہ	خوش ذوق قارئین کے لیے اس ماہ کی خاص کہانی

پبلشر ایڈیٹر شکیل عادل زادہ نے حسین زکریا کے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس سے چھپوا کر ۵ سی ۲/۱۴ ناظم آباد سے شائع کیا ♥ پتہ ۴۷-۴۸ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ♥ ڈیلی ڈسٹ لطیف ہاؤس کرشن پورہ پشاور
شمارہ ۱ ♥ جلد ۷ ♥ فی پرچہ ۳ روپے ♥ زرسالانہ ۴۰ روپے ♥ فون نمبر ۲۱۱۹۴۴-۲۱۱۹۶۱ ♥ تار کا پتہ سب رنگ ♥ سرورق ، ایلیٹ پبلشرز کراچی ♥ رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی



کمیّت

فرض کیجیے کہ الف، بے سے یہ کہے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ محبت کوئی ایسی چونکا دینے والی بات نہیں۔ الف کو بے سے ہو سکتی ہے، بے کو شین سے ہو سکتی ہے، شین کو پے سے ہو سکتی ہے مگر ایک مسئلہ ہے جب ایک شخص دوسرے سے اس قسم کا اظہار کرتا ہے تو ایک سوال بار بار ذہن میں ڈنک مارتا ہے کہ آخر الف کو بے سے کس قدر محبت ہوگئی ہے، یہ سوال یوں بھی اُبھرتا ہے کہ محبت کوئی ایک مستحکم، نہ گھٹنے، نہ بڑھنے والی چیز نہیں۔ یہ کم بھی ہو سکتی ہے زیادہ بھی، ہلکی بھی ہو سکتی ہے بھاری بھی اور شدید بھی ہو سکتی ہے، معتدل بھی۔ الف کو یہ یقین دلانے کے لیے بے کو لمبے چوڑے خطوط لکھنے پڑتے ہیں۔ ہزارہا لفظوں کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے پھر بھی دھکڑ پکڑ ہوتی رہتی ہے کہ آیا الف کو اتنی ہی محبت ہے جتنی وہ اظہار کر رہا ہے؟ ہمیشہ ایک مبہم صورتِ حال رہتی ہے کیونکہ لفظوں کا تاثر قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔ مثلاً الف بے سے کہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے، شدید محبت ہے، بے پناہ محبت ہے، میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ چار دس مختلف کیفیتیں ہیں۔

امریکہ میں ایک صاحب تھے۔ نام تھا لوگارڈس، انھوں نے یہ مشکل حل کرنے کے لیے ایک پیمانہ ایجاد کیا تھا، شدت اور کیفیت کو کمیت میں تبدیل کرنے کا پیمانہ، اسے لوگارڈس کا پیمانۂ شدت کہتے ہیں اگر انٹینسٹی کا ترجمہ شدت ہی کیا جائے۔ لوگارڈس صاحب نے مثال کے طور پر امریکی سیاہ فاموں سے سفید فاموں کی نفرت اسی پیمانے کے ذریعے ناپنے کی کوشش کی تھی، فرض کیجیے میں سیاہ فاموں سے نفرت کرتا ہوں، اسے ۲۵ درجے کی نفرت قرار دیا جائے، میں اُن سے شدید نفرت کرتا ہوں، ۵۰ درجے کی نفرت، میں اُن سے بے پناہ نفرت کرتا ہوں، ۷۵ درجے کی نفرت اور میں سیاہ فاموں کو برداشت نہیں کر سکتا کو ۱۰۰ درجے کی نفرت قرار دیا جائے تو اوسط آسانی سے نکل آتی ہے اور بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ امریکی سیاہ فاموں سے سفید فاموں کی نفرت کس درجے کی ہے۔ ہلکی ہے یا بھاری؟ قوی ہے یا کمزور؟

یہ اعداد و شمار کا زمانہ ہے، کمپیوٹر نے انسانی ذہن کے مصائب ایک حد تک اپنے دماغ میں سمیٹنے شروع کر دیے ہیں چنانچہ الف کو بے سے اظہار کرتے وقت بھی پرانا طریقہ بدل دینا چاہیے، جیسے جیسے محبت بڑھتی رہے، پیمانۂ شدت بڑھاتے رہیے۔ کم ہوتی رہے، گھٹاتے رہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب ہر الف ہر بے کو یہ یاد کرانے کی کوشش کرے کہ وہ بے سے ۱۰۰ درجے کی محبت کرتا ہے، ظاہر ہے، الف عددوں کے بے دریغ استعمال سے محتاط رہے گا کہ آیندہ بڑھی ہوئی شدت کے اظہار کے لیے کون سے عدد رہ جائیں گے۔ دوسری طرف بے بھی اعداد و شمار ہی کی دُنیا میں رہتی ہے، خود کمی بیشی کر دے گی۔

محبت کی بات دیگر، سمجھیے تب بھی بہت سی کیفیتوں اور بہت سی شدتوں کی پیمائش میں اس قسم کا طریقہ کار اختیار کیا جائے تو بہت سی اُلجھنوں کا حل نکل آئے، بہت سی دُھندلی کیفیتیں اپنے صحیح خدوخال میں نظر آنے لگیں۔ لفظوں کا اثر کسی پر کچھ، کسی پر کچھ ہوتا ہے۔ آدمی کی مختلف داخلی و خارجی حالتوں میں ان کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں۔ تحریر میں تو بطورِ خاص ایسا سقم ہوتا ہے۔ کرشن چندر جی اگر یہ لکھا کریں کہ الف کو بے سے ۷۵ درجے کی محبت تھی تو بہت سے لفظ بچ جائیں، پڑھنے والے کے وقت کی بچت بھی ہو اور کہانیاں بھی وہ جلدی جلدی لکھا کریں۔ اُدھر شاعری میں فیض صاحب لکھا کریں، مجھ سے ۷۰ کی محبت مری محبوب نہ مانگ۔

ہر چیز میں بچت ہو رہی ہے، عدد لفظ کی جگہ لے رہے ہیں۔ کیا عجب کہ آیندہ صدیوں میں لفظ ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ لوگارڈس کی دریافت فی الحال کتابوں میں محدود ہو کے رہ گئی ہے لیکن اس سلسلے میں کام نئے سرے سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

ذرا بے کو لکھ کے تو دیکھیے کہ آپ اُس سے آج کل نوّے درجے کی محبت محسوس کر رہے ہیں، دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔

یہ پُرسکون مُسکراہٹ







اس مسکراہٹ کا راز کوہِ نور کی وہ تمام معیاری مصنوعات ہیں
جو سال ہا سال کی تحقیق کے بعد تیار کی جاتی ہیں،
کوہِ نور کی بہتر سے بہتر کپڑا بنانے کی جستجو میں مگن ماہرین
اور جدید ترین مشینیں، ہر موسم میں آپ کے لیے نت نئے
ملبوسات تیار کرنے میں مصروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج
'میگنولیا اور ہر گھر میں جانے پہچانے نام ہیں۔
کوہِ نور کی تمام مصنوعات، لٹھا، لان، کریپ، وائل،
کیمبرک، پاپلین اور سلے سلائے کپڑے ایک مسلسل تحقیق کا
ثمر اور اعلیٰ معیار کی ضامن ہیں۔

معیاری پارچہ جات کا مرکز

کوہ نور

KIL(1)1-75

SCAN



وہی مرحلہ جواب دہی کا مرحلہ، بس اب کچھ نہ کہیے گا۔ وضع نبھائیے، پھر کس سے کہیے گا اور کیا کہیے گا۔ غصے میں آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا اور خوف میں اُس سے بھی کچھ نہ کہا جائے گا جس کی نظریں پہلے ہی جھکی ہوئی ہیں، یہی بہت ہے، پندار کی بات ہے، چھیڑ نہ کریں تو بہتر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اب اس ضمن میں کوئی اشارہ ہی نہ کیا جائے کیسا دلچسپ مشورہ دیتے ہیں کہ نظریں بھی نہ جھکائی جائیں گویا اُس نازکی اور لطافت سے دست کش ہوا جائے جس کے لیے دو آدمی اپنے دن خوابیدہ، اپنی راتیں بے خواب کر لیتے ہیں۔ یہ ایک نادیدہ، نامرئی اور ناقابلِ بیان ریشم کا سا، پھولوں کا سا دھاگا باندھنے اور قائم رکھنے کے لیے زندگی صَرف کرنی پڑتی ہے۔

میں اپنے عذر کیوں نہ پیش کروں کہ راستے میں ایک لمحے کے لیے بھی کہیں قیام نہیں کیا حالانکہ سبھی در کھلے ہوئے تھے۔ شامیں رونق جگ مگاتی تھیں اور مدھم روشنیوں میں روز ساز بجائے جاتے تھے۔ اُسی طرح نازنینوں کے پرے گلیوں اور کوچوں میں خوش خرام رہے جو اُن کا شیوہ ہے، سرد ہوائیں چلیں تو دل میں چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ خوش بو کا کوئی جھونکا آیا تو مشامِ جاں میں سرمیں جھن جھنانے لگیں، کہیں صراحیاں ٹوٹ رہی تھیں، کہیں پیالے کھنک رہے تھے، کہیں پھول کھل رہے تھے، کہیں رنگ بکھرے ہوئے تھے، ہر سُو زندگی کا تماشا جاری تھا۔

اور میں اپنے زنداں میں سفر کر رہا تھا۔ میرا سفر! جتنا راستہ طے کیجیے، راستہ اُتنا ہی کھنچ جاتا ہے۔ کہیں سیری نہیں ہوتی کہ بس اب وہ سامنے جو ایک چھوٹا سا مکان ہے، وہ جو دُور ایک روشنی نظر آ رہی ہے، وہیں سے مرادِ شوق ملتی ہے، وہیں سے سندِ وفا ملتی ہے، وہ اعتبار کی منزل ہے۔ پتہ چلا کہ اعتبار کے لیے تو ہر گام پہ ایک آزمائش ہے، ہر لمحے ایک دلیل درکار ہے۔

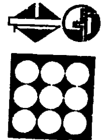
سو میں اپنی دلیل، اپنے ثبوت کے ساتھ حاضر ہوں۔ وہ ایک لمحہ جس نے کئی بار پھن اُٹھانے کی کوشش کی، اُسے بھی سنگسار کر دیا مگر معلوم نہیں کیوں دیر ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو کئی دن پھر چھنے ہوئے تھے۔

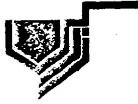
اگر سینے میں لچک ہو اور آنکھ میں نمی تو بہت سی باتیں یوں ہی طے ہو جاتی ہیں، یہاں کئی طرح کے اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ کوئی روزنامہ ہے تو کوئی سہ روزہ، کوئی ہفت روزہ ہے تو کوئی پندرہ روزہ، کوئی ماہنامہ ہے تو کوئی سہ ماہی، اب ایک اور رسم چل پڑے تو کیا حرج ہے۔ اِسے فی الحال آپ ۳۵، ۳۶ روزہ کیوں نہ سمجھیں۔ میرا اصرار ہے کہ یہ جنوری کا شمارہ ہے، جنوری ۷۶ ہی کا۔ سب رنگ کے ساتویں سال کا پہلا شمارہ، ۷۳ واں شمارہ۔ جو دن گزر گئے ہیں، انھیں اُدھار سمجھیے، قرضِ حسن میں، باقاعدہ اُدھار۔ زندگی کے بہت سے اُدھار آپ پر بھی ہوں گے اور آپ بھی کسی کے قرض خواہ ہوں گے۔ مجھ پر بھی ۳۵، ۳۶ روز اُدھار سمجھیے لیکن اُدھار وقت پر ادا کرنے کے تقاضے میں ربطِ خاطر کا خیال ضرور رکھیے۔ لوگوں کی زندگیاں اُدھار ہوتی ہیں، آنے والے لاکھ وعدوں کے بعد بھی نہیں آتے، بہت سے آنے والوں کو خیال ہی نہیں رہتا کہ کوئی کس قدر شدت سے اُن کا منتظر ہو گا۔

ایسے میں، جب کوئی ایسا خط آتا ہے، کوئی ایسا فون، جو شکوک اور شبہات سے آلودہ ہو، کہا جائے کہ اب اُونچی اُڑان ہو گئی ہے، نگاہیں بہکنے لگی ہیں، وہی مرض لاحق ہوا جس کا شکار عموماً لوگ ہو جاتے ہیں تو جی اُداس ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ منافقت چھپی نہ رہتی، سب رنگ چغلی کھاتا، اِن لفظوں پہ لرزہ ہوتا، اِن باتوں میں اثر نہ ہوتا۔

ذرا دل پہ ہاتھ رکھیے۔

شکیل عادل زادہ عفی عنہ





ہنری سیسل ⭑ محبوب اظہر

ایک دلچسپ اور انوکھے مقدمے کی روداد

اُس حسین عورت کی کہانی جس پر اپنے شوہر سے بے وفائی کا الزام تھا

برطانیہ سے ایک نئی کہانی۔ عالمی شہرت یافتہ ادیب ہنری سیسل کی زبانی

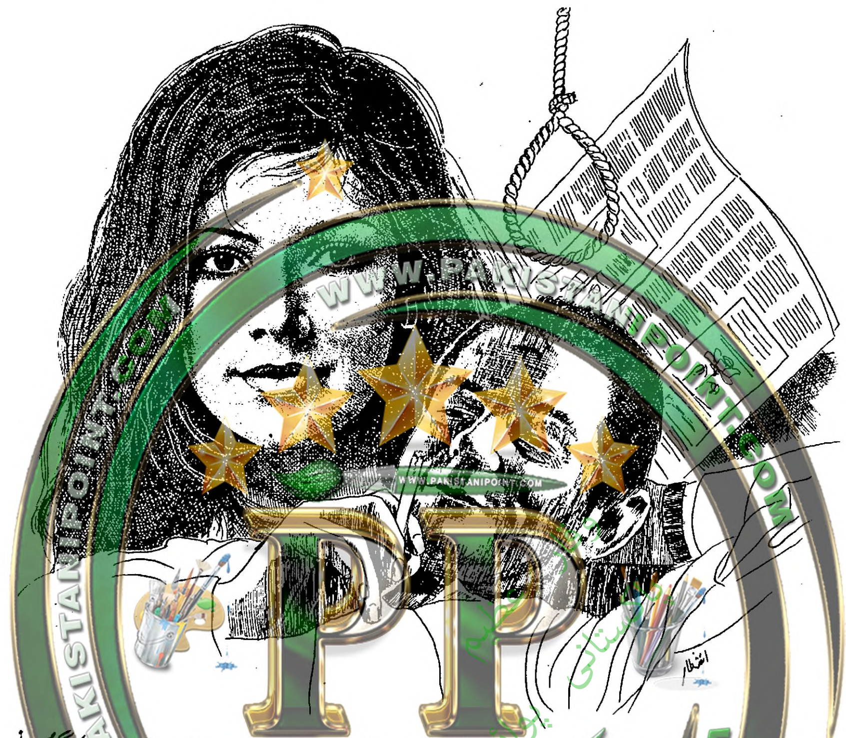
عدالت کا کمرہ حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ کٹہرے میں ایک بہت خوب صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جج مقدمے کی روداد دہرا رہا تھا۔ اُس نے جیوری کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اب میں شہادتوں کا سرسری جائزہ لوں گا۔" اُس نے جائزہ لینا شروع کیا۔ "ملزمہ اس وقت اپنے شوہر کی قاتل ہونے کے الزام میں یہاں موجود ہے۔ اس کا شوہر آج سے چھ ہفتے پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ اُس کی گم شدگی سے پہلے یہ دونوں ایک خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، بیشتر شادی شدہ جوڑے بظاہر خوش و خرم نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں اُن کی زندگیاں مسرتوں سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی حال اس جوڑے کا ہو مگر جہاں تک شہادتوں کا تعلق ہے بظاہر ان دونوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ملزمہ کا شوہر فروری کی نو تاریخ کو اچانک غائب ہو گیا تھا پھر کسی کو دکھائی نہیں دیا البتہ ایک لاش ملی تھی۔ اس لاش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ملزمہ کے شوہر کی لاش تھی۔ میں لاش کے متعلق بعد میں بحث کروں گا۔"

"ملزمہ کے شوہر کی گم شدگی کا احساس سب سے پہلے اُس کی چچی کو ہوا۔ اُس نے ملزمہ سے باز پرس کی کہ اُس کا شوہر کہاں ہے؟ ملزمہ نے جواب دیا کہ وہ ایک کاروباری کام سے اسکاٹ لینڈ گیا ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ملزمہ نے جھوٹ بولا تھا۔ خود ملزمہ نے اقرار کر لیا ہے کہ اُس نے غلط بیانی کی تھی۔"

"ملزمہ کے دوسرے رشتے داروں نے بھی اُس سے اُس کے شوہر کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ملزمہ نے سب کو مختلف جوابات دیے۔ یہاں وہ جوابات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ملزمہ کا بیان عدالت کے سامنے ہے۔ اُس نے صاف گوئی سے اقرار کر لیا ہے کہ اُس کے تمام جوابات سراسر غلط تھے۔ ملزمہ عدالت کو بتا چکی ہے کہ اُس نے اور اُس کے شوہر نے متفقہ طور پر طے کیا تھا کہ وہ دونوں کچھ دنوں تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے غلط بیانات اس لیے دیے تھے کہ وہ شوہر کے غائب ہونے کی اصل وجہ منظرِ عام پہ لانا نہیں چاہتی تھی۔ ملزمہ کا دعویٰ ہے کہ اُس کا گم شدہ شوہر اب بھی زندہ ہے۔ ملزمہ کے وکیل نے بھی عدالت کو یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ملزمہ کا شوہر مقدمہ ختم ہونے سے پہلے پہلے کسی وقت بھی عدالت میں آ سکتا ہے۔ اُن کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ علیحدگی کی مدت میں وہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی رابطہ قائم نہیں رکھیں گے۔ پولیس اس امر کی مکمل تحقیق کر چکی ہے کہ ملزمہ کا گم شدہ شوہر زخمی تو نہیں ہوا ہے؟ پولیس نے ملک کے تمام چھوٹے بڑے اسپتالوں اور خیراتی اداروں سے رابطہ قائم کیا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔"

"ملزمہ کا شوہر غائب ہے اور ملزمہ یہ وضاحت نہیں کر سکتی کہ وہ اس مصیبت کے وقت میں اُس کی مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟ علیحدگی کے بارے میں ملزمہ کا بیان ہے کہ اُن کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ کچھ مدت تک ایک دوسرے سے دور رہنا اُن کے لیے مفید ثابت ہو گا کیونکہ فراق میں محبت بڑھ جاتی ہے۔ تشہیر بہت وسیع پیمانے پر ہو چکی ہے لہٰذا یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ملزمہ کا شوہر زندہ ہوتا تو اب تک عدالت میں آ جاتا ورنہ وہ کہیں سے بھی کم سے کم یہ اطلاع تو دے سکتا تھا کہ اُس کی بیوی بے گناہ ہے۔ عدالت یہ بھی دیکھ چکی ہے کہ ملزمہ مقدمے کے دوران میں متوقع نظروں سے بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہی ہے۔ کیا یہ محض تصنع تھا؟ یا واقعی اسے یقین ہے کہ اس کا شوہر آ جائے گا؟ ممکن ہے باقی کارروائی میں اس بات کا حتمی علم ہو جائے۔"

"آپ حضرات کو پہلی گواہی یاد ہو گی۔ پہلی گواہ گم شدہ شخص کی چچی تھی۔ جیوری کے ارکان کو اُس کا بیان یاد ہو گا۔ اُسے اپنے بھتیجے کے متعلق کوئی دھیان ہی نہیں تھا لیکن ایک خواب کی وجہ سے وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اُس نے اُسے خواب میں دریا کے قریب دیکھا تھا۔ شہادت کے قوانین کی رو سے اُسے یہ اجازت نہیں دی گئی تھی کہ وہ اپنے خواب کی تفصیلات



بیان کرے لیکن اُس نے خواب دیکھنے کے بعد ہی پولیس سے درخواست کی تھی کہ دریا میں جال پھینکے جائیں۔ پولیس یہ بیان دے چکی ہے کہ اُس نے اِس بات پر پہلے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن ایک اور خاتون گواہ مسز لارکنز کا بیان سن کے وہ دریا کی طرف توجہ دینے کے لیے مجبور ہو گئی تھی۔

"مسز لارکنز عدالت کے سامنے بیان دے چکی ہے اُس نے وکیلِ صفائی کی بحث کے باوجود اصرار کیا تھا کہ اُس نے جو کچھ کہا ہے وہ قطعی درست ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ وہ فروری کی ابتدائی تاریخ میں ملزمہ سے ملی تھی۔ اُسے صحیح تاریخ یاد نہیں رہی۔ ملزمہ اُس خاتون کی پڑوسن ہے۔ خاتون گواہ نے ایک رات دیکھا کہ ملزمہ کسی شخص کی مدد سے کوئی وزنی چیز کار سے نکال رہی ہے۔ کار دریا کے کنارے کھڑی کی گئی تھی۔ ملزمہ کے ساتھ کوئی آدمی تھا، گواہ اُسے پہچان نہیں سکی لیکن اُس کا بیان ہے کہ وہ آدمی قد و قامت میں ملزمہ کے شوہر کی طرح تھا۔ گواہ اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔"

"اس گواہی کے بعد صورتِ حال عجیب ہو گئی تھی۔ وکیلِ صفائی نے مسز لارکنز پر شدید جرح کی لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہی پھر بعد میں خود ملزمہ نے بھی اقرار کر لیا کہ گواہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ملزمہ کا بیان ہے کہ اُس رات اُس کے ساتھ اُس کا شوہر ہی تھا۔ اُس نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ دونوں مل کر کون سی وزنی چیز اُٹھا رہے تھے۔ ملزمہ کا بیان ہے کہ اگر اُس نے یہ بات بتا دی تو اُس کا شوہر کسی مصیبت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ایک عجیب بات ہے۔ ملزمہ محسوس کر چکی ہے کہ اُسے شوہر کو قتل کرنے کے الزام میں موت کی سزا بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ اس نازک مرحلے پر بھی یہ راز فاش کرنا نہیں چاہتی۔ معزز اراکینِ جیوری! اس معاملے میں ہم سب اندھیرے میں ہیں کہ اُس رات ملزمہ اور اُس کا شوہر کیا کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں صرف ملزمہ کوئی روشنی ڈال سکتی تھی لیکن وہ یہ راز فاش کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا وہ شخص اُس کا شوہر ہی تھا؟ کیا وہ اپنے شوہر ہی کی مدد کر رہی تھی؟ یا اپنے آشنا کی مدد سے شوہر کی لاش ٹھکانے لگا رہی تھی؟"

"ممکن ہے مقدمے کی باقی شہادتوں سے یہ مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد مل سکے۔ بہرحال یہ تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ دریا سے ایک آدمی کی لاش ملی تھی۔ وہ لاش شناخت نہیں کی جا سکی۔ لاش کے جسم پر صرف لباس تھا، باقی ہر شناختی چیز غائب کر دی گئی تھی۔ لباس پر لانڈری کا نشان باقی تھا۔ لانڈری والے کا بیان ہے کہ وہ لباس ملزمہ کے شوہر کا ہے۔ اُس نے حلف اُٹھا کے بتایا ہے کہ وہ یہ لباس بارہا دھو چکا تھا۔"

"میں نے عدالت کی توجہ ایک اور مسئلے کی طرف بھی دلائی تھی کہ گم شدہ شخص اور ملزمہ کہیں بیمے وغیرہ کی رقم وصول کرنے کے لیے تو کوئی ڈھونگ نہیں رچا رہے ہیں؟ اس سلسلے میں بھی تحقیق ہو چکی ہے ملزمہ کے گم شدہ شوہر کے پاس کوئی بیمہ پالیسی تھی ہی نہیں۔"

"لانڈری والے کا بیان درست ثابت ہو چکا ہے۔ خود ملزمہ نے تائید کی ہے کہ وہ لباس اُس کے شوہر ہی کا ہے۔ دریا سے جو لاش نکالی گئی تھی اُس کا طبی معائنہ ہو چکا ہے۔ معائنے کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اُس شخص کی کھوپڑی پر کوئی وزنی چیز مار کر اُسے ہلاک کیا گیا تھا اسی لیے لاش شناخت نہیں کی جا سکی۔ لاش کا قد گم شدہ شخص کے قد کی طرح تھا۔"

"ملزمہ نے اس الزام کی شدت سے مخالفت کی ہے کہ اُس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے یا اُس کے قتل میں کسی کی مدد کی ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ اُس کا شوہر ابھی زندہ ہے اور دریا سے برآمد ہونے والی لاش کسی دوسرے شخص کی ہے۔"

"اب میں مقدمے کی آخری شہادت کی طرف آتا ہوں۔ اب تک عدالت کے ذہن میں جو شکوک پیدا ہو چکے ہیں، غور کیجیے کہ وہ آخری شہادت سے دور ہوتے ہیں یا نہیں؟ پولیس کو ملزمہ کے قبضے سے آنے والا ایک سبز رنگ خط دستیاب ہوا تھا۔ اُس خط کا مضمون یہ ہے: "میں کام کر چکی ہوں۔ جلدی آ جاؤ۔" یہ خط جس شخص کے نام بھیجا گیا تھا اُس نے اسے ڈاک خرچ ادا کر کے وصول کرنے کی زحمت نہیں کی۔ تحریر کے نیچے کسی کے دستخط موجود نہیں ہیں لیکن تحریروں کے دو ماہرین کا بیان ہے کہ خط کی تحریر ملزمہ کی تحریر کے عین مطابق ہے۔ خود ملزمہ نے اس امر سے انکار کیا ہے کہ وہ تحریر اُس کی ہے پھر وکیلِ صفائی کی درخواست پر ایک اور ماہر تحریر عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ یہ تحریر ملزمہ کی تحریر سے ملتی جلتی ہے ضرور لیکن یہ نقل بھی ہو سکتی ہے۔ عدالت نے ملزمہ سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ کسی شخص پر اپنی تحریر کی نقل کا شبہ کر سکتی ہے؟ ملزمہ نے جواب دیا تھا کہ اُس کا کوئی دشمن نہیں ہے اور وہ کسی پر الزام تراشی نہیں کر سکتی۔"

"استغاثے کا کہنا ہے کہ اگر ملزمہ بے گناہ ہے تو عدالت کو اُس کے شوہر کی گم شدگی، ملزمہ کے جھوٹے بیانات اور دریا کا ناقابلِ توجیہہ واقعہ، لاش، ملزمہ کے شوہر کا لباس اور آخر میں اس خط کو بھی محض اتفاق سمجھنا چاہیے؟"

"اس کے برعکس وکیلِ صفائی کا کہنا ہے کہ ملزمہ اپنے حلفی بیان کے مطابق بے گناہ ہے۔ وکیلِ صفائی نے کارروائی کے دوران میں عدالت کی توجہ ملزمہ کی بھولی بھالی صورت کی طرف مبذول کی اور کئی بار دعوت دی کہ ملزمہ کو غور سے دیکھا جائے۔ کیا ایسی عورت اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے؟ گویا وکیلِ صفائی نے کسی حقیقی شہادت کے بجائے محض ملزمہ کی ظاہری حالت کو بنیاد بنانے کی کوشش کی۔"

"بہرحال ارکانِ جیوری! مقدمے کا فیصلہ شہادتوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے پھر بھی آپ کو چاہیے کہ ملزمہ کی پریشانی اور اُس کی ظاہری حالت سے اُس کے خیالات کا اندازہ لگائیں؟ لیکن کیا آپ محض صورت دیکھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملزمہ قاتل ہے یا نہیں؟ میں یہ یاد دہانی بھی کرانا چاہتا ہوں کہ آپ نے ملزمہ کو صرف شہادتوں کی بنیاد پر مجرم ثابت کرنے کا حلف اٹھایا تھا۔ جہاں تک وکیلِ صفائی کا موقف ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ ملزمہ اپنے چہرے سے کوئی سفاک عورت نظر نہیں آتی لیکن شہادتیں اس قیافے کی نفی کرتی ہیں۔ اب میں جیوری کے ارکان کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ تبادلۂ خیال اور غور و خوض کے لیے چلے جائیں تاکہ مقدمے کا فیصلہ آج ہی سنا دیا جائے۔"

جیوری کے ارکان اپنے کمرے میں چلے گئے اور نصف گھنٹے بعد واپس آئے۔ انھوں نے عدالت میں اپنی اپنی کرسیاں سنبھالنے کے بعد متفقہ طور پر رائے دی کہ ملزمہ قاتل ہے۔

جج نے فیصلہ سنانے سے پہلے ملزمہ سے دریافت کیا کہ اُسے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟ ملزمہ نے ہموار لہجے میں کہا: "صدرِ عدالت! مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں اپنے شوہر کی قاتل نہیں ہوں۔ یقین کیجیے، میں اُس سزا سے خوف زدہ نہیں ہوں جو معزز عدالت مجھے سنانے والی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پھانسی کے تختے پر پہنچنے سے پہلے ہی میرا شوہر آ کے مجھے بچا لے گا۔ وہ یہ ثابت کرے گا کہ میں بے گناہ ہوں۔ آپ شوق سے مجھے سزا سنائیے۔ میں کہتی ہوں کہ وہ آئے گا، ضرور آئے گا اور آپ کی سنائی ہوئی سزا پر کبھی عمل نہیں ہو سکے گا۔"

جج نے موت کی سزا کا فیصلہ سنا دیا۔ گیلری میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے یہ فیصلہ سن کر اپنی داڑھی سہلائی اور کمرۂ عدالت میں ایک عورت کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ یہ سسکیاں مجرمہ کی نہیں تھیں بلکہ گم شدہ شخص کی بچی کی تھیں۔



بیس سال بعد دو خوش حال آدمی ایک ریستوران میں رات کا کھانا ختم کر رہے تھے۔ کھانے کے ساتھ اُن کے درمیان ایک کاروباری گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کا نام ہبارڈ تھا، دوسرے کا نام ولیم۔

ہبارڈ ادب اور موسیقی کی طرح انسانی زندگی کے لیے لذیذ کھانے بھی نہایت ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ کئی ریستورانوں کا مالک تھا۔ اُس نے پہلا ریستوران بیس سال پہلے کھولا تھا۔ اُس کے ریستوران لذیذ کھانوں اور اچھی خدمت کے لیے دور دور شہرت رکھتے تھے۔ اُس کے پہلے ہی ریستوران نے لذیذ کھانوں اور اچھی خدمت کی ایک مثال قائم کر دی تھی۔ اسی سبب سے وہ بیس سال میں بہت سے ریستورانوں کا مالک بن گیا تھا۔ اُس کے تمام ملازم فن کارانہ انداز میں کام کرتے تھے۔ باورچیوں سے ویٹروں تک اُس نے ہر شخص کو فن کارانہ نقطۂ نظر سے پرکھنے کے بعد ملازم رکھا تھا۔

عظیم جنگ کے بعد مہنگائی میں اضافہ ہوا تو ہبارڈ کے ریستوراں عام آدمی کی رسائی سے دُور ہو گئے پھر بھی ملک میں کون شخص ہوگا جس کے دل میں اُس کے ریستوراں کا کھانا کھانے کی خواہش نہ پیدا ہوتی ہو۔ کم آمدنی کے لوگ خواب میں بھی اُس کے کسی ریستوراں کا منظر دیکھ لیتے تو دن بھر اُن کی طبیعت شگفتہ رہتی تھی۔ ہبارڈ خود اچھے کھانوں کا بہت شوقین تھا۔ پکانے کے فن اور کھلانے کی خدمت میں اُسے مہارت حاصل تھی۔ آج ہبارڈ ولیم سے اپنے پچاس ریستورانوں کا سودا کر رہا تھا۔ ولیم اُس کا قریبی دوست نہیں تھا لیکن اُن کے تعلقات محض کاروباری نوعیت کے بھی نہیں تھے وہ کاروباری معاملات کے علاوہ بھی ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ہبارڈ اور اُس کی بیوی نے کاروبار فروخت کرنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھی تھی کہ اُن کا خریدار بھی فن کار ہونا چاہیے۔ ولیم فن کار تو نہیں تھا لیکن لذیذ کھانوں اور اچھی خدمت سے اُسے گہری رغبت تھی۔ ہبارڈ اُس کی یہ خوبی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

ولیم کا ذہن سودے کی قیمت میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہبارڈ نہ جانے اُس سے کتنی رقم کا مطالبہ کرے گا لیکن جب ہبارڈ نے ولیم کے اندازے سے دس ہزار ڈالر کم بتائے تو اُسے حیرت ہوئی۔ اُس نے شراب کا جام ٹکرا کے فوراً پچاس لاکھ ڈالر کے عوض سودا پکا کر لیا اور خالی جام ایک بار پھر بھرتے ہوئے کہا، "ہبارڈ! مجھے یقین تھا کہ سودے کے لیے ہمارے درمیان زیادہ تکرار نہیں ہوگی۔"

"تم نے کاروباری گفتگو بہت احتیاط سے کی ہے ولیم!" ہبارڈ نے کہا۔ "میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس سودے کو جلد از جلد عملی صورت دے دو۔ تم حساب کتاب پر نظرِ ثانی کے لیے اپنا محاسب کب بھیجو گے؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ولیم نے مسکرا کر کہا۔ "تم نے مجھے ہدایت بتادی ہے۔ میں تم پر اعتبار کرتا ہوں اور یہ باور کرنے کے لیے تیار ہوں کہ تمام رقمیں درست ہیں۔ میں محاسب بھیج کے وقت برباد کرنے کی حماقت کیوں کروں؟"

"بہتر ہے ولیم! میں نے تمھیں جو رقمیں بتائی ہیں وہ تمام حساب کتاب دیکھ کر ہی بتائی ہیں اور اُن میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے پھر بھی میں چاہتا تھا کہ تم نظرِ ثانی کرا لیتے تاکہ اگر کوئی کمی بیشی نکلے تو وہ ہمارے تعلقات پر اثرانداز نہ ہو سکے۔ پچاس لاکھ ڈالر معمولی رقم نہیں ہوتی۔"

"میں اس سلسلے میں اب ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔ ہمارے درمیان پہلے بھی کچھ سودے ہو چکے ہیں۔ میں نے ہر سودے میں تمھیں ایک دیانت دار شخص پایا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں کسی وکیل کے پاس جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ سودے کا معاہدہ ہم خود کیوں نہ لکھ لیں۔ ذرا شراب کی







صراحی بڑھانا۔"

"ولیم! مجھے یقین ہے کہ اس کاروبار میں میری طرح تم بھی ترقی کرو گے۔" ہبارڈ نے کہا۔ "کیونکہ تم غذائی معاملات میں گہری دلچسپی لیتے ہو۔ اس کام کے لیے تجربات اور مسلسل سفر کی ضرورت ہے اور تم ان باتوں کے عادی ہو۔ یاد رکھو، جب بھی اور جہاں بھی کوئی نئی چیز نظر آئے، اُسے اپنے ریستوراں میں ضرور آزمانا۔ یہ اس کاروبار کی کامیابی کا ایک اہم راز ہے۔"

"مجھے اس کاروبار کا بہت شوق ہے۔ تم دیکھنا میں اسے مزید وسعت دوں گا اور اس سے اتنا منافع کما لوں گا کہ آیندہ زندگی آرام سے گزر سکے پھر تمھاری طرح میں بھی اسے فروخت کر کے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے یہ کاروبار آج سے بیس سال پہلے شروع کیا تھا؟"

"ہاں، تقریباً بیس برس پہلے۔"

"غالباً تمھیں اس کاروبار کا ابتدائی مرحلہ سب سے زیادہ دشوار محسوس ہوا ہوگا؟ کھانے اور بہترین خدمت، زیادہ کرائے دینا، اور اتنی تشہیر کرنا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ متوجہ ہو سکیں۔ یہ امور اچھے خاصے مال دار لوگوں کو بھی دیوالیا کر دیتے ہیں۔ تم نے انھیں انجام دینے کے لیے زبردست ہمت کا ثبوت دیا ہوگا۔ تشہیر کا مسئلہ سب سے مشکل مسئلہ ثابت ہوا ہوگا۔ شروع میں تمھارے پاس تشہیری اخراجات کے لیے

خاطر خواہ رقم بھی نہیں ہوگی ؟"

"نہیں تھی۔" ہبارڈ مسکرانے لگا "مگر یقین کرو میں نے اپنے کاروبار کی بہت بھاری تشہیر کی تھی۔"

"قرض کی رقم سے ؟"

"ارے نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں قرض ورض کبھی نہیں لیا۔"

"پھر یہ سب کچھ کیسے ہوا ؟ کیا تمھارا کوئی مال دار چچا تھا جس نے ....؟"

"نہیں، میرا کوئی مال دار چچا بھی نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک غریب اور آوارہ گرد آدمی کی بدولت ہوا۔ کاروبار شروع کرنے کی ابتدائی ضروریات اُسی نے پوری کی تھیں۔"

"صراحی میری طرف بڑھاؤ اور یہ بات ایک بار پھر کہو۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ ایک غریب آوارہ گرد کی بدولت ہوا۔"

"کیا وہ کوئی امیر آدمی تھا ؟"

"میں نے کہا نا کہ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ وہ مرا تھا تو اُس کے پاس کپڑے بھی نہیں تھے۔ اگر تم مجھ سے رازداری کا وعدہ کرو تو میں تمھیں یہ بات تفصیل سے بتا سکتا ہوں۔" ولیم ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ہبارڈ نے کہا "اگر یہ معاملہ پولیس کے علم میں آجائے تو مجھے اور میری بیوی کو چھ مہینے کی قید ہوسکتی ہے۔"

"بہت عجیب اور دلچسپ بات ہے۔ مطمئن رہو میں تمھارا راز فاش نہیں کروں گا اس کے علاوہ یہاں کوئی گواہ نہیں ہے لہٰذا اگر میں پولیس کو تمھاری گفتگو بتا بھی دوں گا تو اسے ثابت نہیں کرسکوں گا تم بڑے اطمینان سے مجھے سب کچھ بتا سکتے ہو۔"

"چونکہ میں یہ کاروبار تمھیں فروخت کر رہا ہوں اس لیے مجھے یہ راز بھی تم پر ظاہر کردینا چاہیے میرے اور میری بیوی کے بعد تم تیسرے شخص ہو جسے یہ راز معلوم ہوگا۔"

"میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھوں گا۔"

"آؤ، دفتر میں چل کے بیٹھیں، وہاں نسبتہً خاموشی اور سکون ہے۔ ویٹر! صراحی اور گلاس میرے دفتر میں پہنچا دو۔"

وہ دونوں دفتر میں پہنچ کے آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "قریب آجاؤ۔" ہبارڈ نے کہا۔ "میں زیادہ چیخنا نہیں چاہتا۔"

انھوں نے کرسیاں اس طرح رکھ لیں کہ اُن کے ہاتھ صراحی تک آسانی سے پہنچ جائیں اور گفتگو میں بھی کوئی دشواری نہ ہو۔ ہبارڈ گہری سوچ میں ڈوب گیا جیسے اُسے مناسب الفاظ کی تلاش ہو یا وہ یہ سوچ رہا ہو کہ آغاز کہاں سے کرے۔ کچھ دیر بعد اُس نے نگاہ اُٹھا کے ولیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا تمھیں بیس سال پہلے کا وہ مقدمہ یاد ہے جس میں ایک خوب صورت عورت اپنے شوہر کی قاتلہ قرار دے دی گئی تھی ؟"

"بہت عرصہ ہوگیا۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔"

"بہرحال، میں تمھیں بتاتا ہوں کہ اُس قتل کی ملزمہ میری بیوی تھی۔"

"اوہ، کیا یہ حقیقت ہے ؟"

"ہاں اُسے موت کی سزا بھی سُنا دی گئی تھی۔"

"کسے قتل کیا تھا اُس نے ؟" ولیم نے حیرت سے دریافت کیا۔

"مجھے۔" ہبارڈ نے مسکرا کے کہا۔

ولیم نے تیزی سے شراب کی صراحی تھامی اور ہبارڈ کی طرف دیکھا۔ "کیا میں ہنسنا شروع کردوں ؟" اُس نے پوچھا۔

"تمھاری مرضی۔" ہبارڈ نے متانت سے کہا "لیکن یہ حقیقت ہے۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو۔ آج ہم نے بہترین کھانا کھایا ہے اور کھانے کے بعد شراب کے صرف چند جام پیے ہیں صرف چند جاموں سے تمھاری ذہنی حالت بے ترتیب نہیں ہوسکتی۔ میں نے پچھلے ہی ہفتے دیکھا تھا تم اپنی بیوی کے ساتھ تھے تم دونوں مطمئن اور خوش و خرم تھے اور ان اچھے حالات میں تمھیں خوش و خرم ہونا ہی چاہیے۔"

"خیر۔" ہبارڈ نے ایک طویل سانس لی "معلوم ہوتا ہے تم سننا نہیں چاہتے۔"

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟" ولیم ششدر تھا۔

"یقیناً۔ میں سنجیدہ ہوں۔ میں تمھیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم اسے سُننا پسند کرو۔"

"میں پورے اشتیاق سے تمھاری طرف متوجہ ہوں لیکن تم خود سوچو کہ یہ معاملہ کتنا ناقابلِ فہم محسوس ہوتا ہے۔" ولیم نے معذرت چاہی۔

"یقیناً لیکن میں تمھیں حقائق سناتا ہوں حقائق۔ ایک بات بھی غلط

نہیں ہوگی۔"

"جب تمھاری بیوی پر مقدمہ چلایا گیا تھا، کیا اُس وقت تم وہیں تھے؟ لیکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ تم وہاں مقیم نہیں ہو گے۔"

"میں وہیں تھا۔" ہتبارڈ نے کہا۔ ولیم کی آنکھوں سے اُلجھن ظاہر ہونے لگی۔ ہتبارڈ نے صراحی اپنی طرف سرکائی اور جام بھرنے لگا۔ ہلکی ہلکی چسکیوں کے درمیان اُس نے اپنی بیوی کے مقدمے کی رُوداد شروع کی۔ درمیان میں ولیم کی بھاری سانس پھنکار کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ رُوداد سُنانے کے بعد، ہتبارڈ نے کہا۔ "مقدمے نے بہت دلچسپ فضا قائم کردی تھی۔ اس قسم کے بیشتر مقدمے عموماً دلچسپی حاصل کر ہی لیتے ہیں، خصوصاً ایسی صورت میں لوگوں کی دلچسپی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب قتل کی ملزمہ ایک دل کش اور خوب صورت عورت ہو۔ مقدمے کی کارروائی اور میری بیوی کی تصویریں اخبارات میں وسیع پیمانے پر شائع ہوئی تھیں۔ بیشتر لوگوں نے میری بیوی کی ظاہری شکل و شباہت دیکھ کر اسے قاتلہ سمجھنے سے انکار کردیا تھا۔ اُن میں سے کئی نے میری بیوی کو شادی کی پیش کش بھی کی تھی۔ جب وہ رہا کی گئی تو اُس کے قدردانوں کی تعداد بے اندازہ تھی۔"

"میرا منصوبہ یہ تھا کہ اگر عدالت نے میری بیوی کے خلاف فیصلہ سنایا تو میں ڈرامائی انداز میں عدالت کے سامنے پیش ہو جاؤں گا لیکن جب میں نے حقائق کا عدالتی خلاصہ سُنا تو یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی ہے حالانکہ اسے میں نے کبھی پیشے کے طور پر نہیں اپنایا۔ میں نے حقائق کے عدالتی خلاصے سے کئی راہیں نکالنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی کئی ملزموں نے ماتحت عدالت کے غلط اندازے اور فیصلے کے خلاف اعلا عدالت میں اپیل کر کے رہائی حاصل کی تھی۔ میں اعلا عدالت میں اپیل کے موقع پر ظاہر ہو کے اپنی بیوی کو بچا سکتا تھا گویا میرے پاس ابھی ایک موقع اور تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔"

"میں نے خفیہ اشاروں میں اپنی بیوی کے وکلا کے ذریعے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وکلا اُس تک میرے پیغام پہنچاتے رہے حالانکہ انھیں خود معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے بھی میری بیوی کے بڑھتے ہوئے قدردانوں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ میں غائب ہونے سے پہلے کلین شیو تھا مگر جب مقدمے کا فیصلہ ہوا تھا تو میری داڑھی اور مونچھیں بڑھ آئی تھیں، عام لوگ مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔ دُور سے تو میرے عزیزوں کے لیے بھی مجھے شناخت کرنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے بال بھی رنگ لیے تھے اور اسی بہروپ میں گیلری سے مقدمے کی کارروائی سُنتا رہا۔"

"پھر اعلا عدالت میں اپیل دائر کی گئی۔ اپیل کے سلسلے میں، مَیں نے ملکی قانون پر بہت زیادہ دماغ سوزی کی تھی۔ اُس قانون کا ایک اصول یہ تھا بلکہ ہے کہ ایک بے گناہ ملزم کو رہا کر دینا سو مجرموں کو سزا دینے سے بہتر ہے۔

ہندوستان

کے باجبروت بادشاہ علاالدین خلجی نے ایک مرتبہ قاضی مغیث سے سوال کیا کہ "ہم نے سلطنت کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے دیوگرھ سے جو دولت حاصل کی تھی، وہ بیتُ المال کی امانت اور رعایا کی ملکیت ہے یا ہماری ملکیت ہے؟"

قاضی مغیث نے جواب دیا "اُس دولت میں بادشاہ کا حق بھی اُن لوگوں کے برابر ہے جنھوں نے دولت حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔"

یہ جواب علاالدین خلجی کو ناگوار گزرا۔ اُس نے کہا "وہ دولت ہم نے اپنی امارت کے زمانے میں حاصل کی تھی اور اُسے شاہی خزانے میں داخل نہیں کیا تھا پھر وہ بیت المال کی امانت کس طرح سمجھی جاسکتی ہے؟"

قاضی مغیث نے جواب دیا "جو دولت بادشاہ اپنی محنت سے حاصل کرے وہ اس کی ہے اور جو دولت لشکر کی مدد سے جمع کی جائے۔ اُس میں لشکر والوں کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا بادشاہ کا۔"

علاالدین نے کہا "میرا دستور ہے کہ جو سپاہی ضرورت کے وقت طلبی پر حاضر نہیں ہوتے، میں اُن سے تین سال کا معاوضہ واپس لے لیتا ہوں اور باغیوں کو اُن کی اولاد کے ساتھ قتل کرنے کے بعد اُن کی تمام دولت شاہی خزانے میں داخل کر لیتا ہوں۔ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟"

قاضی مغیث اپنی جگہ سے اُٹھے اور دُور جا کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے پھر سر پر ہتھیلی رکھ کے بولے "یہ تمام باتیں انصاف اور شریعت کے خلاف ہیں۔"

علاالدین اس جواب سے سخت ناراض ہوا اور غیظ و غضب کے ساتھ حرم سرا میں چلا گیا۔ قاضی مغیث فوراً اپنے گھر روانہ ہوئے تاکہ اپنے اہل و عیال سے آخری بار رخصت لے لیں۔ گھر پہنچ کے انھیں یہ انتظار تھا کہ بادشاہ کا کوئی سپاہی آئے گا اور انھیں قتل کر دے گا۔ اُن کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ علاالدین نے انھیں حق بات کہنے کی سزا دینے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ دوسرے دن اُس نے انھیں اپنے دربار میں بلا کے غیر معمولی انعام و اکرام سے نوازا۔

میری بیوی کا مقدمہ بہت عجیب تھا۔ میرے اور میری بیوی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس کے باوجود اعلا عدالت ماتحت عدالت کا فیصلہ بہت باریک بینی سے دیکھ رہی تھی۔"

"میں تمھیں قانونی اصطلاحوں کا حوالہ دے کر اکتاہٹ میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ صرف ایک روز کی بحث کے بعد اعلا عدالت نے ماتحت عدالت کا فیصلہ منسوخ کر دیا اور کہا کہ ماتحت عدالت کے فیصلے میں کچھ غلطیاں تھیں اس لیے میری بیوی کو موت کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ چند قانونی نزاکتوں کے تحت اُسے رہا کر دیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ مجھے کچھ نہ کرنا پڑے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ اپیل کے بعد صورتِ حال میری خواہش کے مطابق ہو جائے گی۔"

"بری ہونے کے بعد میری بیوی نے ایک ریستوراں کھولا تھا۔ میرا پہلا ریستوراں وہی تھا۔ اس سلسلے میں تمام انتظامات پہلے ہی کیے جاچکے تھے۔ جب وہ رہا ہوئی تھی تو اخباری نمایندوں اور ٹی وی والوں نے میری بیوی کی سیکڑوں

صلیبی جنگ

زوروں پر تھی۔ صلاح الدین ایوبی روپے کا سخت ضرورت مند تھا لیکن روپے کہیں سے فراہم نہیں ہو رہے تھے۔ کسی نے ایک دولت مند یہودی کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ یہودی دارالسلطنت کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے بلوایا۔ یہودی فہم و فراست میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ صلاح الدین نے اُس سے سوال کیا "یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں سے کون سا مذہب افضل ہے؟"

یہودی بہت سٹ پٹایا، اگر وہ یہ جواب دیتا کہ اسلام افضل ہے تو صلاح الدین کہتا اگر تم اسلام کو افضل سمجھتے ہو تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے اور اگر وہ عیسائیت یا یہودیت کو افضل قرار دیتا تو ممکن تھا کہ صلاح الدین بُرا مان جاتا اور نہ معلوم اُسے کیا سزا دیتا۔ چنانچہ یہودی نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "معزز سلطان! اس سوال پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی۔ ایک مال دار شخص تھا۔ اُس کے کئی بیٹے تھے اور سب کے سب نہایت فرماں بردار اور خدمت گزار تھے۔ باپ کو ویسے تو سب بیٹوں سے بے حد محبت تھی لیکن ایک بیٹے پر اُس کی توجہ زیادہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنی یہ توجہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس کا برتاؤ سب سے ایک جیسا تھا۔ ایک بار وہ اپنے سب سے پسندیدہ بیٹے کو ایک خاص انگوٹھی دینا چاہتا تھا مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے بیٹے اپنے اُس بھائی کو خود سے فائق سمجھیں اور اُس سے حسد کرنے لگیں۔ باپ نے یہ عقدہ اس طرح حل کیا کہ اصل انگوٹھی کے نمونے کی کئی انگوٹھیاں بنوائیں پھر اصل انگوٹھی اپنے پسندیدہ بیٹے کو دے دی اور نقلی انگوٹھیاں دوسرے بیٹوں میں تقسیم کر دیں۔ اُس کا کوئی بیٹا یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے پاس جو انگوٹھی ہے وہ نقلی ہو سکتی ہے اسی طرح مذہب کے متعلق بھی کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا کہ اُس کا مذہب کم تر ہو سکتا ہے۔"

صلاح الدین یہ حکایت سُن کے بہت محظوظ ہوا۔ اُس نے یہودی کو خلعتِ فاخرہ دے کے رخصت کیا۔ بعد میں یہودی کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا کہ صلاح الدین نے اُسے دراصل روپے کے لیے بلایا تھا۔ اُس نے کئی خچروں پر اشرفیاں لدوا کے صلاح الدین کے پاس بھجوا دیں۔ صلاح الدین اُس کا بے حد ممنون ہوا۔ جنگ کے اختتام پر اُسے کامیابی ہوئی۔ اُس نے اپنے محسن یہودی کا تمام قرض ادا کر دیا اور اُسے انعامات سے نوازا۔ وہ یہودی جب تک زندہ رہا، اُس پر صلاح الدین کی عنایات جاری رہیں۔

کراچی سے فضل الرحمان صدیقی کا مطالعہ

تصویریں اتاری تھیں۔ میری بیوی نے انھیں خاص طور پر ایک انٹرویو بھی دیا تھا۔ اُس نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا: "اب میں آزاد ہوں اور اب اُس پروگرام پر عمل کروں گی جس کی تکمیل میرے شوہر کی آرزو تھی۔ میں ایک ریستوران کھولنا چاہتی ہوں۔ میرا ریستوران بلانک کے چوراہے پر ہو گا۔" اُس نے کہا: "عارضی علیحدگی سے پہلے میرے شوہر نے ریستوران کھولنے کے سب انتظامات کر لیے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ اس مصیبت کے وقت میں آپ سب نے مجھ سے جس ہمدردی کا مظاہرہ کیا، اُس کے لیے میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔ کیا آپ سب لوگ ریستوران کی افتتاحی رات کو ایک جام کے لیے وہاں نہیں آئیں گے؟ کل افتتاح ہے۔ مجھے آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

"ایک ایسی حسین عورت کے ساتھ جام کی چسکیاں لینا کس قدر خوش گوار ہوتا ہے جسے اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں پہلے قید کیا گیا ہو پھر رہا کر دیا گیا ہو۔ مفت میں بھلا اس سے زیادہ تشہیر کس طرح ممکن تھی میرے دوست؟" ہبارڈ نے ولیم کی طرف دیکھا اُس کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ولیم حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ ہبارڈ نے جام ہونٹوں سے الگ کر کے کہا۔

افتتاح کی شام کو ریستوراں میں اخباری نمایندوں اور تشہیر کے دیگر ذرائع سے تعلق رکھنے والوں کا اژدہام تھا اور میری بیوی کے وہ قدردان خاص طور سے آتے تھے جنھوں نے اُسے بیوہ سمجھ کے شادی کی پیش کش کی تھی۔ اُن کے علاوہ شہر کے وہ مرد بھی آتے تھے اور وہ عورتیں بھی آئی تھیں جنھیں محض تصویریں دیکھ دیکھ کے میری بیوی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ سب میری بیوی کی خوب صورت صراحی دار گردن دیکھنے آتے تھے جس میں پھانسی کا پھندا پڑتے پڑتے رہ گیا تھا۔ میں اس دوران میں اپنے منصوبے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے لذیذ ترین کھانوں کی تیاری اور بہترین خدمت کے لیے زبردست خطرات مول لیے تھے۔ میں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی داؤ پر لگا دی تھی۔ تمھارا کیا خیال ہے ولیم! کیا ان حالات میں میرے انتظامات رائگاں گئے ہوں گے؟

وہ ریستوراں کا افتتاح موسم بہار کے بعد ہوا تھا۔ اس لیے آرائش بھی مثالی ثابت ہوئی۔ میرا خیال ہے اُس رات ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے بہترین ماحول میں بہترین خدمت کا پہلا لذیذ کھانا کھایا تھا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے اس لیے وہ سب لوگ عمر بھر کے لیے ہمارے گاہک ہو گئے۔ اُن کا حلقۂ احباب بھی محض اُن کی باتوں سے متاثر ہو کر ہماری طرف کھنچتا رہا۔"

پندرہ دن بعد میں داڑھی مونچھوں سمیت ریستوراں میں منیجر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ داڑھی مونچھوں کی وجہ سے مجھے کسی نے پہچانا نہیں البتہ لوگوں کو یہ شبہ ضرور تھا کہ میں وہی گم شدہ شخص ہوں جو اب سامنے آ گیا ہوں۔ اس سلسلے میں پولیس بھی مجھ سے باز پرس کے لیے آئی مگر میں اپنے حقوق سے واقف تھا اس لیے گھبرایا نہیں۔ پولیس نے سوالات کیے تو میں خاموش رہا۔ پولیس میری خاموشی سے مطمئن ہوئی، ہو یا نہ ہوئی ہو، بہرحال واپس چلی گئی لیکن صرف چند روز میں ہر طرف یہ چرچے ہونے لگے کہ گم شدہ شخص ظاہر ہو گیا ہے۔ اِن چرچوں نے ہمارا کاروبار خوب چمکایا۔ شہر کے باقی لوگ بھی مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑے۔ وہ سب ریستوراں میں آتے اور لذیذ کھانوں اور بہتر خدمت کے معترف ہو کے لوٹتے۔ پولیس کو مطمئن کرنا میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بہرحال اس طرح ہمیں اپنے

کاروبار کی تشہیر میں زبردست مدد ملی۔ پھر لوگوں کی دلچسپی جلد ہی ہماری طرف سے منعطف ہو کے صرف لذیذ کھانوں اور شائق خدمت کی طرف چلی گئی۔ غالباً اب تمھیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں نے بے سروسامانی میں بھی تشہیر کا کتنا زبردست اہتمام کیا تھا۔"

"ہاں مجھے اقرار ہے لیکن ہبارڈ دریا سے برآمد ہونے والی لاش کس کی تھی؟"

ہبارڈ خاموشی سے ولیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ولیم گہری دلچسپی سے اُس کی طرف متوجہ تھا۔ ہبارڈ نے اثبات میں سر ہلا کے کہا۔ "دراصل اُسی لاش کے باعث میرے ذہن میں یہ منصوبہ پیدا ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک روز ایک آوارہ گرد بھیک مانگتا ہوا ہمارے ہاں آ گیا تھا۔ وہ بیمار تھا۔ میں اور میری بیوی اُن دنوں آج کل سے زیادہ دردمند تھے۔ ہم نے اُسے اندر لے جا کے اپنے کپڑے دیے پھر ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کر کے کہا کہ اس کی حالت انتہائی خراب ہے لہٰذا اسے اسپتال بھیج دیا جائے۔ ہم نے اُسے اسپتال بھیجنے سے انکار کر دیا کیونکہ ہمارا خیال تھا اسپتال میں اس کی صحیح دیکھ بھال نہیں ہو سکے گی۔ ہم محسوس کر چکے تھے کہ یہ شخص زندگی بھر مصیبتوں میں مبتلا رہا ہے اس لیے اسے سکون و مسرت کے چند روز ضرور ملنے چاہئیں۔ یہ مقصد اسپتال میں پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب ہم نے یہ کہا کہ ہم تمھیں اپنے گھر میں رکھیں گے اور ذاتی طور پر تمھاری دیکھ بھال کریں گے تو وہ بے حد مسرور اور متشکر ہوا۔ غالباً اس سے پہلے کسی نے اُس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ ہم نے اُس کی تیمارداری محض انسانی فرض سمجھتے ہوئے اپنے ذمے لی تھی۔ پھر ہم نے اُس کی بہتری کے لیے اپنے مقدور کے مطابق سب کچھ کیا لیکن افسوس کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا۔"

"ڈاکٹر نے مجھے اُس کی موت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ میں وہ سرٹیفکیٹ متعلقہ محکمے میں درج کروانے جا رہا تھا کہ راستے میں مجھے یہ منصوبہ سوجھا۔ بلاک کے چوراہے پر ایک مکان ہماری ملکیت تھا۔ مکان کی مالیت دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں اُن دنوں بے روزگار تھا اور کوئی ایسی صورت میرے سامنے نہیں تھی جس میں کامیابی کا امکان نظر آتا۔ لہٰذا ہم نے اپنا مکان ریستوران میں بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں شروع سے لذیذ کھانوں کا شوقین ہوں۔ میری بیوی کو کھانا پکانے میں کمال حاصل ہے بلکہ وہ تو کئی عورتوں کو یہ فن سکھا بھی چکی ہے۔"

"کھانا پکانا اور دوسروں کو سکھانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ سرمائے کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ سرمائے کی کمی ہمیں سخت پریشان کر رہی تھی۔ تشہیر تجارت کی ماں ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تشہیر نہ ہونے کی وجہ سے شہر کے اکثر بڑے بڑے ریستوران ناکام ہو کے بند ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ہمارے کھانے اُن ریستورانوں کے کھانوں سے بہتر ہوتے پھر بھی اُن کی تشہیر بے حد ضروری تھی اور تشہیر کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔"

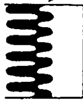
"تم کہو گے کہ یہ بہت پاگل پن کا منصوبہ تھا۔ بے شک تھا لیکن ہم ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھے اور مجھے اطمینان تھا کہ میں کسی وقت بھی ظاہر ہو کے اپنی بیوی کو بے گناہ ثابت کر سکتا ہوں اور اُس لاش کے لیے میرے پاس ڈاکٹری سرٹیفکیٹ موجود تھا۔ ڈاکٹر نے سرٹیفکیٹ میں لکھا تھا کہ موت فطری انداز میں واقع ہوئی ہے لہٰذا میں اور میری بیوی پھانسی کے تختے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہاں، اگر یہ معاملہ گڑبڑ ہو جاتا تو ہمیں ایک لاش کی بے حرمتی کرنے اور عدالت یا پولیس کا وقت ضائع کرنے کے جرم میں معمولی سی سزا ہو سکتی تھی۔"

"میں نے اپنا منصوبہ اپنی بیوی کو بتایا۔ وہ بہت مضبوط قوتِ ارادی رکھتی ہے۔ میں نے یہ منصوبہ اُس کی قوتِ ارادی ذہن میں رکھتے ہوئے بنایا تھا ورنہ یہ ایک عام عورت کے بس کی بات نہیں تھی۔ منصوبہ سُن کے وہ اُس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ میں نے آوارہ گرد کی لاش کو اپنا لباس پہنایا۔ لباس سے ہر نشانی ختم کر دی گئی تھی، صرف لانڈری کا نشان چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے لاش مسخ کر دی اور اُسے دریا میں پھینک دیا۔"

"بدقسمتی سے راستے میں میری پڑوسن مسز لارکنز مجھے نظر آ گئی۔ میں اُس وقت کسی ایسے شخص سے ملنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا جو بعد میں کوئی شہادت دے سکے کیونکہ اُس کی شہادت سے میری بیوی کے جرم کا بوجھ بڑھ سکتا تھا جیسا کہ بعد میں ہوا۔ بہرحال میں نے مسز لارکنز کو اپنا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔"

"مقدمہ چلتا رہا۔ مقدمے میں جس خط کا ذکر آیا تھا وہ اپنی بیوی کی تحریر میں میں نے ہی لکھا تھا۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ میری بیوی کو عدالت کے کٹہرے میں جرم کا اقرار کرنا پڑے اور اُس خط کی وجہ سے اُسے یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ میں وفادار ہوں اور سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کی سب باتیں تمھیں معلوم ہیں۔ صرف یہ نہیں معلوم کہ مجھے اپنا پرانا نام ترک کر کے ہبارڈ کے نام سے اپنی بیوی کے ساتھ دوبارہ شادی کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا۔ ہماری دوسری شادی پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ اُس موقع پر میں نے داڑھی مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ بہرحال یہ تھا ہمارے ریستورانوں کا پس منظر۔"

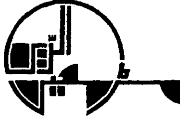
ولیم نے کوئی خیال آرائی کرنے سے پہلے غور سے ہبارڈ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بہت دلچسپ رُوداد ہے۔ بہرحال ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں اپنا محاسب بھیج کے تمھارا حساب کتاب ایک نظر دکھوا لوں؟ میرا خیال ہے، تم بُرا نہیں مانو گے۔"



نوشتۂ خاص، مرحوم منٹو کی زندہ تحریر

اردو کے مؤ لفانِ، منٹو کی کہانی

یہ کہانی بہت دن ہوئے، ٹی وی کے منٹو راما میں پیش کی جا چکی ہے۔



ایک بے قرار عورت کی داستان

مُنہ سے کبھی جُدا نہ ہونے والا سگار ایش ٹرے میں پڑا ہلکا ہلکا دُھواں دے رہا تھا۔ پاس ہی مسٹر معین الدین آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک ہاتھ اپنے چوڑے ماتھے پر رکھے سوچ رہے تھے حالانکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے۔ آمدنی معقول تھی۔ کراچی شہر میں اُن کی موٹروں کی دُکان سب سے بڑی تھی۔ اِس کے علاوہ سوسائٹی کے اونچے حلقوں میں اُن کا بڑا نام تھا۔ کئی کلبوں کے ممبر تھے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں اُن کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ صاحبِ اولاد تھے۔ لڑکا انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لڑکی بہت کم سِن تھی لیکن بڑی ذہین اور خوب صورت۔ وہ اس طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ لیکن اپنی بیوی.... مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسٹر معین الدّین کی شادی کے متعلّق چند باتیں بتا دی جائیں۔

مسٹر معین الدّین کے والد بمبئی میں ریشم کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ یوں تو وہ لاہور کے رہنے والے تھے مگر کاروباری سلسلے میں بمبئی ہی میں مقیم ہو گئے تھے اور یہی اُن کا وطن بن گیا تھا۔

معین الدین اُن کا اکلوتا لڑکا تھا، وہ بظاہر عاشق مزاج نہیں تھا لیکن معلوم نہیں کہ وہ کیسے اور کیونکر آدم جی باٹلی والا کی موٹی موٹی غلافی آنکھوں والی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی بھی جس کا نام زہرہ تھا، معین سے محبّت کرتی تھی مگر شادی میں کئی مشکلات حائل تھیں۔

آدم جی باٹلی والا جو معین کے والد کا پڑوسی اور دوست بھی تھا، بڑے پُرانے خیالات کا بوہرہ تھا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے فرقے ہی میں کرنا چاہتا تھا چنانچہ زہرہ اور معین کا پڑوسی معاشقہ بہت دیر تک بے نتیجہ چلتا رہا۔ اس دوران میں معین کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں بہت پہلے مر چکی تھی۔ اب کاروبار کا سارا بوجھ معین کے کاندھوں پر آ پڑا جس سے اُس کو کوئی رغبت نہیں تھی۔ ادھر زہرہ کی محبت تھی جو کسی حیلے بار آور ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر ہندو مسلم فسادات تھے۔ معین ایک عجب گڑبڑ میں گرفتار تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے کیا نہ کرے۔"

بے سوچے سمجھے، ایک دن اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنا کاروبار سمیٹ کر اُس کو کسی اچھے گاہک کے پاس بیچ ڈالے، چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور اپنا سارا روپیہ کراچی کے ایک بینک میں جمع کرا دیا اور زہرہ سے مل کر اُس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر کراچی جانا چاہتا ہے مگر اکیلا نہیں، زہرہ اُس کے ساتھ ہو گی۔

زہرہ فوراً مان گئی۔ ایک ہفتے بعد وہ دونوں میاں بیوی بن کر کراچی کے ایک خوب صورت ہوٹل میں تھے۔ بمبئی میں زہرہ کے والدین پر کیا گزری، اس کا انھیں کچھ علم نہیں تھا اور نہ اُنھیں اس کے متعلّق کچھ معلومات حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ دونوں اپنی محبّت کی پیاس بجھانے میں مگن تھے، اُن کو اس اہم حادثے کی بھی خبر نہیں تھی کہ ہندوستان دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

بہر حال جب لاکھوں انسانوں کا خون فرقہ وارانہ فسادات میں پانی کی طرح بہہ گیا اور کراچی میں پاکستان کے قیام کی خوشی میں چراغاں ہُوا تو مسٹر معین الدین اور مسز معین کو معلوم ہُوا کہ وہ پاکستان میں ہیں اور مسٹر آدم جی باٹلی والا اور مسز آدم جی باٹلی والا ہندوستان میں۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ اب وہ محفوظ تھے۔

جب افراط و تفریط کا عالم کسی قدر کم ہُوا تو مسٹر معین نے اپنے بمبئی کے کاروبار کے حوالے سے ایک بہت بڑی دُکان اپنے نام الاٹ کرا لی اور اُس میں موٹروں کا کاروبار شروع کر دیا جو چند ہی برسوں میں چل پڑا۔

اس دوران میں اُن کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا جب چار برس کا ہُوا تو انھوں نے اُس کو اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا جو انگلستان جا رہا تھا۔ مسٹر معین چاہتے تھے کہ اُس کی تربیت وہیں



ہو کیونکہ کراچی کی فضا اُن کے نزدیک بڑی گندی تھی۔ لڑکی جو اپنے بھائی سے ایک برس چھوٹی تھی گھر ہی میں کھیلتی کودتی رہتی۔ اُس کے لیے مسٹر معین نے ایک انگریز نرس مقرر کر رکھی تھی۔

اس بات پر زیادہ زور دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مسٹر معین کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ طبعاً وہ کم گو اور شریف طبیعت تھے، وہ زہرہ سے جب اپنی محبت کا اظہار کرتے تو بڑے مدھم سروں میں۔ بڑے وضع دار قسم کے آدمی تھے۔

کلبوں میں جاتے، زہرہ اُن کے ساتھ ہوتی مگر وہ دوسرے ممبروں کی طرح بے وجہ ہنسی قہقہوں میں کبھی شامل نہ ہوتے۔ وھسکی کے دو پیگ آہستہ آہستہ پیتے جیسے کوئی فرض ادا کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہوتا تو زہرہ کے ساتھ تھوڑی دیر ناچ کر گھر واپس چلے آتے۔ یہ گھر انھوں نے ایک ہندو سے کراچی آنے کے بعد خرید لیا تھا۔

زہرہ کبھی کبھی اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے ساتھ بھی ناچ لیتی تھی۔ اس میں مسٹر معین کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ زہرہ اُن کے ایک دوست مسٹر احسن سے جو ادھیڑ عمر کے بہت بڑے اور مال دار تاجر تھے، ضرورت سے زیادہ التفات برت رہی ہے تو اُن کو بڑی الجھن ہوئی مگر انھوں نے زہرہ پر اس کا اظہار کبھی نہیں کیا کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ احسن اور زہرہ میں عمر کا اتنا تفاوت ہے۔ پھر وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ یہ صرف رقابت کا جذبہ ہے جو اُن کی اپنی محبت کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی کہ سوسائٹی کے جن اونچے حلقوں میں اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، اُس میں بیویوں سے غیر مردوں کا التفات بری نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اسے فیشن سمجھا جاتا تھا کہ ایک کی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ ناچے اور اُس کی بیوی پہلی کے شوہر کے ساتھ، ایسی ادلا بدلی عام تھی۔

پہلے مسٹر احسن گاہے گاہے جب کوئی پارٹی دی گئی ہو، مسٹر معین کے ہاں آیا کرتے تھے مگر کچھ عرصے سے اُن کا باقاعدہ آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اُن کی غیر حاضری میں بھی وہ آ جاتے اور گھنٹوں زہرہ کے پاس بیٹھے رہتے۔ یہ انھیں اپنے ملازموں سے معلوم ہوا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے زہرہ سے کچھ نہ کہا۔ دراصل اُن کی زبان پر ایسے الفاظ آتے ہی نہیں تھے جن سے وہ شکوک کا اظہار کریں۔ وہ مجبور تھے اس لیے کہ اُن کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ایسے معاملوں میں لب کشائی معیوب خیال کی جاتی ہے روشن خیالی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہیں۔



بغداد کی تعمیر منصور عباسی کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ تعمیر پر روزانہ خطیر رقم خرچ ہو رہی تھی اور خزانے میں بہت زیادہ سرمایہ نہیں تھا۔ منصور نے اس سلسلے میں سلطنت کے وزیر ابوایوب موریانی سے مشورہ کیا۔ موریانی نے کہا کہ "اصل خرچ اینٹوں کی تیاری میں ہوتا ہے۔ اگر ایوان کسرا کا قصر ابیض توڑ کر اس کی اینٹوں سے تعمیر کی جائے تو سرمائے اور وقت کی بچت ہو سکتی ہے۔" منصور نے خالد برمکی سے رائے طلب کی۔ خالد نے یہ تجویز رد کر دی۔ اس نے کہا: "ایوان کسرا اتنی مضبوط عمارت ہے کہ اسے منہدم کرنے پر نئی تعمیرات سے زیادہ رقم خرچ ہو گی۔" منصور نے خالد کی رائے نہیں مانی اور ایوان مسمار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ابھی ایوان کا صرف ایک حصہ توڑا گیا تھا کہ خالد کی رائے صحیح ثابت ہو گئی۔ لہٰذا منصور نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ خالد کو اطلاع ملی کہ منصور نے ارادہ بدل دیا ہے تو اس نے پھر مخالفت کی اور ایوان کسرا گرانے پر اصرار کیا۔ منصور نے غصے سے پوچھا: "تمھاری کون سی رائے صحیح تسلیم کی جائے؟" خالد نے کہا: "میں انہدام کا اس لیے مخالف تھا کہ ایوان کسرا سے اس قوم کی عظمت وابستہ تھی جس نے اسے تعمیر کیا تھا اور اب ہماری قوم کی حالت سامنے آ رہی تھی جس نے پہلی قوم پر فتح حاصل کی ہے۔ آیندہ نسلیں یہ نہ سوچیں کہ ایک قوم وہ تھی جس نے اتنے مستحکم محل بنائے اور ایک قوم وہ تھی جو انھیں توڑ بھی نہیں سکی۔"

یوں تو انھوں نے ایک بڑے معرکے کا عشق کیا تھا مگر دماغ ان کا تاجرانہ تھا۔ دل و دماغ میں کوئی اتنا بڑا فاصلہ تو نہیں ہوتا مگر موٹروں کا کاروبار کرتے کرتے اور دولت کے انبار سمیٹتے سمیٹتے بہت سا چاندی سونا ان دونوں کے درمیان ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جھگڑے ٹنٹوں سے انھیں نفرت تھی۔ وہ خاموش زندگی بسر کرنے کے قائل تھے جس میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔

لڑکی تھی وہ انگریز نرس کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ جب ان کے دل میں اس کا پیار ابھرتا تو وہ اسے اپنے پاس بلا کر کچھ عرصے کے لیے اپنی گود میں بٹھاتے اور انگریزی میں پیار کر کے نرس کے حوالے کر دیتے۔

جب کاروبار سے فارغ ہو کر گھر آتے تو زہرہ کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے اور ڈنر کھانے میں مشغول ہو جاتے۔ اگر مسٹر احسن ان سے پہلے وہاں موجود ہوتے تو وہ ان کو بھی ڈنر میں شامل کر لیتے۔

ایسے موقعوں پر ضرورت بے ضرورت زہرہ، مسٹر احسن کی خاطر داری کرتی۔ ان کی پلیٹ مختلف سالنوں سے بھر دیتی اور ان کو بڑے محبت بھرے انداز میں مجبور کرتی کہ وہ تکلف نہ کریں۔ جب وہ زہرہ کا یہ نادر التفات دیکھتے تو ان کے دل و دماغ کے درمیان سونے چاندی کے ڈھیر پگھل سے جاتے اور دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کر دیتے۔

مسٹر احسن رنڈوے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کراچی میں موتیوں کے سب سے بڑے تاجر تھے، کروڑ پتی ہر سال مسٹر معین سے موٹر دل کے نئے ماڈل خریدتے تھے۔ زہرہ کی سال گرہ پر انھوں نے دو بڑے قیمتی ہار تحفے کے طور پر دیے تھے۔ جب مسٹر معین نے انھیں قبول کرنے سے اپنے مخصوص انداز میں انکار کیا تھا تو مسٹر احسن نے کہا تھا: "مجھے صدمہ ہو گا، اگر یہ ہار مسز معین کے گلے کی زینت نہ بنے۔"

یہ سن کر زہرہ نے دونوں ہار اٹھا کر مسٹر احسن کو دے دیے اور ان سے کہا: "لیجیے آپ اپنے ہاتھوں سے پہنا دیجیے۔"

جب ہار زہرہ کے گلے میں پہنا دیے گئے تو بدرجۂ مجبوری مسٹر معین کو اپنے دوست مسٹر احسن کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی کہ بحیرۂ عرب کے پانیوں میں سیپیوں نے ان ہاروں کے موتی خاص طور پر زہرہ ہی کے لیے پیدا کیے تھے۔

ایش ٹرے میں رکھا ہوا سگار آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا۔ اور نصف کے قریب خاکستری اور سفید راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پاس ہی آرام کرسی پر مسٹر معین اسی طرح اپنے چوڑے ماتھے پر ایک ہاتھ رکھے گہری سوچ میں غرق تھے۔

وہ اتنا تردد کبھی نہ کرتے مگر اب ان کی عزت کا سوال درپیش تھا۔ آج انھوں نے اپنے کانوں سے ایک ایسا مکالمہ سنا تھا، ظاہر ہے کہ زہرہ اور احسن کے درمیان، جس نے ان کی سکون پسند طبیعت کو درہم برہم کر دیا تھا۔

چوڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے دراصل وہ کسی گہری سوچ میں غرق نہیں تھے۔ ان کے کان بار بار وہ مکالمہ سن رہے تھے جو ان کی بیوی اور ان کے دوست کے درمیان بڑے کمرے میں ہوا تھا۔ دکان میں ایک موٹر کا سودا کرتے کرتے ان کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی چنانچہ یہ کام مینیجر کے حوالے کر کے وہ گھر روانہ ہو گئے تاکہ آرام کریں۔ کریپ سول شو پہنے تھے اس لیے کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ دروازے کے پاس پہنچے تو انھیں زہرہ کی آواز سنائی دی: "احسن صاحب! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ان سے طلاق حاصل کر لوں گی۔"

احسن بولے: "مگر کیسے؟ کیوں کر؟"

"میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالیں گے۔"

"تعجب ہے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے آج تک میری ہر فرمائش پوری کی ہے۔ میں اگر ان سے کہوں کہ ان پانچ منزلوں سے نیچے کود جائیں تو وہ یقیناً کود جائیں گے۔"

"حیرت ہے۔"

"آپ کی یہ حیرت دور ہو جائے گی۔ جب میں کل ہی آپ کو طلاق نامہ دکھا دوں گی۔"

یہ مکالمہ سن کر مسٹر معین اپنی ناسازیٔ طبع بھول گئے اور الٹے پاؤں

واپس دُکان چلے گئے جہاں ابھی تک موٹر کا سودا طے ہو رہا تھا مگر انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اپنے دفتر میں چلے گئے، سگار سلگایا مگر ایک کش لینے کے بعد اُسے ایش ٹرے میں رکھ دیا اور سر پکڑ کر آرام کرسی میں بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ زہرہ نے جو کچھ کہا، وہ مسٹر معین کی غیرت کے نام ایک زبردست چیلنج تھا۔ انھوں نے اپنے چوڑے ماتھے سے ہاتھ اٹھالیا اور ایش ٹرے میں سگار بجھا کر ایک نیا سگار نکالا اور اُسے سلگایا۔ آہستہ آہستہ وہ اُسے ہونٹوں سے گھمانے لگے۔ پھر ایک دم اُٹھے اور دُکان سے باہر نکل گئے۔ موٹر میں سوار ہوئے اور گھر کا رُخ کیا۔

اُن کے دوست مسٹر احسن جا چکے تھے۔ زہرہ اپنے کمرے میں سنگھار میز کے پاس بیٹھی میک اپ کرنے میں مشغول تھی۔ جب اُس نے آئینے میں معین کا عکس دیکھا تو مُڑے بغیر ہونٹوں پر لپ اسٹک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "آپ آج جلدی آگئے؟"

"ہاں، طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" صرف اتنا کہہ کر وہ بڑے کمرے میں جا کر صوفے میں دراز ہو گئے۔ سگار اُن کے ہونٹوں میں بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد بنی ٹھنی زہرہ آئی۔ مسٹر معین نے اُس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اُس کے حُسن کی تعریف کی۔ یہ تعریف وہ متعدد مرتبہ اپنے دل میں کر چکے تھے۔ دراز قد، بہت موزوں، مناسب گدرایا ہوا جسم، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، شربتی رنگ۔ اُس پر ہر لباس سجتا تھا۔ بوہری لباس بھی جس سے معین کو سخت نفرت تھی۔

جب زہرہ پاس آئی اور اُس نے ایک ادا سے اپنے خاوند کا مزاج پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ جب وہ اُس کے پاس بیٹھ گئی تو معین صوفے سے اُٹھا اور منہ سے سگار نکال کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "زہرہ! کیا تم مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہو؟"

زہرہ ایک لحظہ کے لیے بوکھلا سی گئی مگر فوراً سنبھل کر اُس نے اپنے خاوند سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے تمھاری اور احسن کی گفتگو سُن لی تھی۔" معین کے لہجے میں غم اور غصّے کا شائبہ تک نہ تھا۔

زہرہ خاموش رہی۔ معین نے سگار کا ایک لمبا کش لیا اور کہا۔ "میں تمھیں طلاق نہیں دوں گا۔"

زہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیوں؟"

معین نے کچھ سوچا۔ "میں سوسائٹی میں اپنے نام اور اپنی عزّت پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتا۔"

"لیکن...." زہرہ اٹک گئی۔ "لیکن... میں اُس سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

دلّی

سے مشہور شاعر انور صابری کراچی آئے ہوئے تھے۔ اُن کا قیام قاری زاہر قاسمی کے ہاں تھا۔ ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ مہمان، میزبان اور کئی ملاقاتی دسترخوان پر موجود تھے۔ کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب اور آگئے۔ میزبان نے اُن سے کہا۔ "آجائیے، کچھ تناول فرمالیجیے۔" وہ صاحب کہنے لگے "بھوک تو نہیں ہے لیکن تھوڑا بہت کھالوں گا تاکہ آپ کا نمک خوار ہو جاؤں۔" قاری زاہر قاسمی نے برجستہ کہا۔ "ہمارے ہاں کھانے میں نمک نہیں پڑتا۔ آپ خوار ہی خوار ہوں گے۔"

آنور شعور

سٹی کالج

کراچی کے ایک مُشاعرے میں جناب اطہر نادر نے غزل شروع کی۔ اُن کا ایک شعر سامعین نے بہت پسند کیا آواز آئی۔ "پھر پڑھیے۔" نادر صاحب نے شعر پھر پڑھ دیا۔ آواز آئی "پھر پڑھیے" انھوں نے شعر ایک دفعہ پھر پڑھ دیا۔ اب تیسری بار فرمائش کی گئی کہ "بہت اچھا شعر ہے، پھر پڑھ دیجیے۔" اس طرح اطہر نادر صاحب جب پانچ مرتبہ شعر پڑھ چکے تو مجمع نے "پھر" کی آواز نہیں لگائی۔ اطہر نادر کچھ دیر کے لیے رکے اور کہنے لگے "حضرات! شعر بہت اچھا ہے۔ ایک دفعہ پھر سن لیجیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے چھٹی مرتبہ شعر پڑھ دیا۔

نیّر ندیم

فردوس کالونی

کراچی میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شعرا باری باری آتے اور کلام سناتے۔ اناؤنسر نے ایک نوعمر شاعر کا نام پکارا۔ وہ ڈائس پر آئے اور کہنے لگے۔ "ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔"

"مجمع سے آواز آئی "کس کی غزل کے؟"

نوعمر شاعر اس دادِ بے داد سے خاصے محظوظ ہوئے مگر تحمل سے بولے "میری ہی غزل کے۔"

آواز آئی۔ "یہ تو آپ پچھلی بار بھی کہہ رہے تھے۔"

نیّر ندیم

"تو کوئی دوسری راہ تلاش کرنی چاہیے۔ طلاق میں کبھی نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ میری عزّت کا سوال ہے۔ ویسے مجھے تمھارے وعدے کا پاس ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

میاں بیوی دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ آخر زہرہ فکرمند لہجے میں بولی۔ "لیکن طلاق لیے بغیر اُس سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔"

معین نے ایش ٹرے میں سے سگار اٹھایا اور اپنی بیوی سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ "کیا تم واقعی اُس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو معین نے اُس سے سوال کیا۔ "کیوں؟" زہرہ خاموش رہی۔ معین نے ایک اور سوال کیا۔ "کیا اس لیے کہ تمھارے دل میں اب میری محبّت نہیں ہے؟"

"میرے دل میں آپ کی محبّت ویسی کی ویسی موجود ہے اور اس کے لیے میں خدا کی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں لیکن معلوم نہیں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ احسن کے ساتھ رہوں۔" یہ کہہ کر زہرہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

معین نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور کہا۔ "تم اُس کے ساتھ رہ

سکتی ہو۔" زہرہ چونک سے کھڑی ہوگئی۔

"مگر ایک شرط پر۔" معین نے سگار ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا، "کہ تم میرے پاس بھی رہا کرو گی تاکہ لوگوں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ اُن کو ایسی باتیں بنانے کا موقع نہ ملے کہ معین چونکہ اپنی بیوی کی فرمائشیں پوری نہ کر سکا، اس لیے اس نے طلاق لے کر ایک کروڑ پتی سے شادی کر لی یا یہ کہ معین کی بیوی بدکردار تھی اس لیے اس نے اُسے طلاق دے دی ہے۔"

"بدکردار تو...... میں ہوں۔" زہرہ نے اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھیں ایک لمحے کے لیے جھکا لیں۔

معین نے اُسے دلاسا دیا۔ "اس کا ثبوت صرف میرا اعتراف ہے جو میری زبان سے کبھی نہیں نکلے گا۔ اس لیے کہ یہ اپنی عزت اور میرے اپنے ناموس پر حرف لانے کا موجب ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر معین کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے سینے کا سارا بوجھ اتر گیا ہے۔

زہرہ نے احسن کو ساری بات بتا دی۔ وہ راضی ہوگیا۔ چنانچہ زہرہ اُس کے پاس کئی کئی دن رہنے لگی۔ احسن زہرہ کے جسمانی خلوص اور اُس کے خاوند کے بے مثل ایثار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے تھوڑے ہی عرصے بعد وصیت لکھ کر اپنی تمام جائداد کی وارث زہرہ کو قرار دے دیا۔

زہرہ نے اس کا ذکر اپنے خاوند سے نہیں کیا کہ اُس کے وقار کو صدمہ پہنچتا۔ وہ اپنی لڑکی کو دیکھنے اور معین سے ملنے کے لیے اکثر اوقات چند راتیں بھی گزار دیتی۔ میاں بیوی کی یہ نئی زندگی بڑی ہموار گزر رہی کہ اچانک ایک دن مسٹر احسن حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔

نمازِ جنازہ میں سوسائٹی کی اونچی اونچی ہستیوں میں مسٹر معین بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنے مرحوم دوست کی مغفرت کے لیے صدقِ دل سے دعا کی اور گھر آ کر مناسب و موزوں الفاظ میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے زہرہ کو دلاسا دیا۔ زہرہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ گن گن کر مسٹر احسن کی صفات بیان کر رہی تھی۔ آخر میں اُس نے اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ اپنی ساری جائداد اُس کے نام کر گیا ہے۔ یہ سن کر مسٹر معین خاموش رہے اور زہرہ سے اس بارے میں کوئی استفسار نہ کیا۔

عدالت کے ذریعے جب زہرہ کو مرحوم احسن کی ساری جائداد کا قبضہ مل گیا اور وہ خوش خوش گھر آئی تو دیکھا ایک مولوی قسم کا آدمی صوفے پر بیٹھا ہے، ہاتھ میں اُس کے ایک کاغذ ہے۔ اُس کو ایک نظر دیکھ کے وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔ "قبضہ مل گیا ہے۔"

مسٹر معین نے کہا۔ "بہت خوشی کی بات ہے۔" پھر انھوں نے مولوی صاحب کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور زہرہ کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو۔"

زہرہ نے کاغذ لے کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

مسٹر معین نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "طلاق نامہ۔"

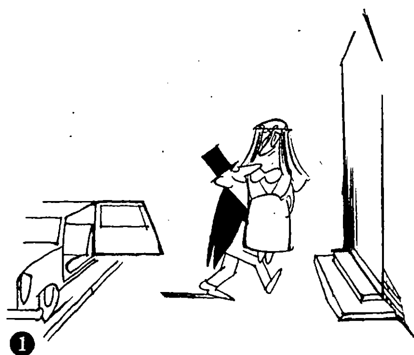
زہرہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ "طلاق نامہ؟"

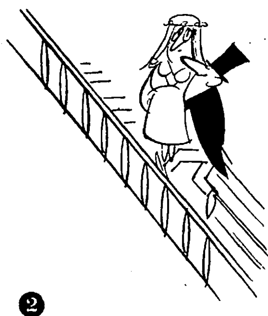
"ہاں۔" یہ کہہ کر مسٹر معین نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چیک نکالا "یہ تمھارا حق مہر ہے۔ بیس ہزار روپے۔"

زہرہ اور زیادہ بھونچکی ہوگئی۔ "مگر...... یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب یہ ہے کہ مجھے اپنی عزت اور ناموس بہت پیارا ہے۔ جب میرے جان پہچان کے حلقوں کو یہ معلوم ہوگا کہ احسن تمھارے لیے اپنی ساری جائداد چھوڑ مرا ہے تو کیا کیا کہانیاں نہیں گھڑی جائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوا۔ "آیئے قاضی صاحب!" قاضی اٹھا۔ جاتے ہوئے مسٹر معین نے پلٹ کر اپنی مطلقہ بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ بلڈنگ بھی تمھاری ہے۔ رجسٹری کے کاغذات تمھیں پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے اجازت دی تو میں کبھی کبھی تمھارے پاس آیا کروں گا۔ خدا حافظ۔"

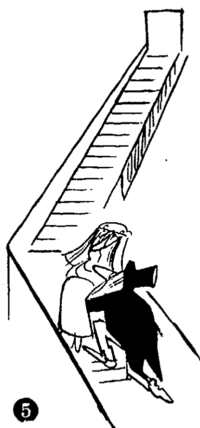


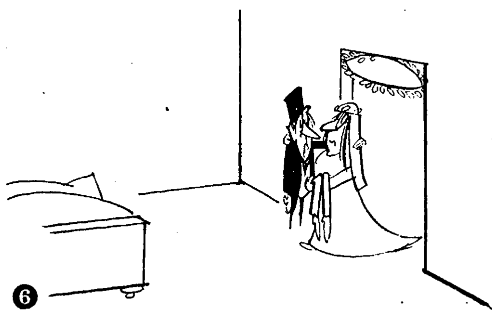
















بے نقش دلوں کے لیے

ایک سُبک، ریشمیں اور مومی تحریر

ازراہِ کرم اس تحریر پر توجہ دیجیے

بلیک ٹریور * شاہد جعفر

صُبح کا وقت تھا مسٹر نارمن نے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ مُعاً کسی نامانوس عطر کی بھینی بھینی مہک اُن کے نتھنوں سے ٹکرائی جہاں تک اُن کے علم میں تھا اُن کی بیوی کوئی عطر استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات کو کوئی محترمہ کار کے اندر خاصی دیر تک موجود رہی ہیں۔ غالباً سات بجے رات سے صبح تک ؟ نہیں آٹھ بجے رات سے صبح تک۔ ساڑھے سات بجے تک تو وہ اپنے دفتر میں اسٹاک چیک کر رہے تھے، کار بھی وہیں کھڑی تھی۔

اُنھیں اس قصبے میں منتقل ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی اور کار کھڑی کرنے کے لیے ابھی تک کوئی گیراج نہیں ملا تھا۔ وہ مجبوراً کار اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی کرتے تھے۔ اُن کی کار بہت پرانی تھی، شاید اُن کے دادا کے زمانے کی۔ اُس کے دروازے بھی مقفل نہیں ہوتے تھے۔ انھیں کھول کے کوئی بھی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ مسٹر نارمن کو اچانک عطر کی مخصوص مہک کے ساتھ سگریٹ کی تلخ بُو بھی محسوس ہوئی۔

"اوہ عطر اور سگریٹ ؟" انھوں نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے پھر کچھ سوچنے لگے۔ رفتہ رفتہ ساری بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔ اُن کے لبوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اگرچہ وہ چالیس سال کے ایک معقول آدمی تھے اور اخلاقی اقدار کی سختی سے پابندی کرتے تھے لیکن اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے باوجود متحمل، بُردبار اور معتدل شخصیت کے مالک تھے

اُن کی زندگی کا نصب العین تھا۔ "جیو اور جینے دو۔" اس وقت اُنھیں گاڑی موڑ کے اپنے گھر تک لے جانی تھی کیوں کہ اُن کی بیوی اُن کے انتظار میں کھڑی تھی مگر مسٹر نارمن کار اِن ملی جلی خوشبوؤں کے ساتھ وہاں لے جانے سے گریز کر رہے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ عطر کی مخصوص مہک بیوی کو اُن پر کوئی شبہ کرنے کی دعوت دیتی بلکہ وہ اس بات سے ڈر رہے تھے کہ بیوی کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کرے گی کہ کوئی رومانی جوڑا اُن کی کار استعمال کرے۔ وہ یقیناً اُنھیں مجبور کرتی کہ کار کے دروازے فی الفور مقفل کروا دیے جائیں اور اس پر گہری نظر رکھی جاتے۔ لہٰذا انھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ تمام دروازے کھول دیں اور ایک لمبا سا راؤنڈ لے کے گھر پہنچیں تاکہ تمام مہک اڑ جائے۔ انھوں نے یہی کیا۔

"تمھیں کیا ہو گیا تھا؟ میں تو سمجھی کہ آج تم مجھے بھول کر چلے گئے۔"
اُن کی بیوی دروازے ہی سے پکاری۔ اُس کا لہجہ ناخوش گوار تھا۔

"ذرا انجن چیک کر رہا تھا۔" مسٹر نارمن نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

یہ اُن کی ازدواجی زندگی کا پہلا جھوٹ تھا۔ جھوٹ بولنا اُن کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ مبالغہ آرائی نہ کریں لیکن جھوٹ کی ایک علیحدہ شخصیت ہوتی ہے، دل فریب اور پہلودار شخصیت جھوٹ بہت سے عجیب دلچسپ اور مکروہ چہروں کے ساتھ نئے نئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ اس کے بے شمار بہروپ ہیں کبھی انتہائی ڈراونی اور ہیبت ناک شکل میں، زندگی کی کسی کڑوی حقیقت کی طرح، کبھی ایک معصوم اور ننھے فرشتے کے مانند۔ جھوٹ اگر کسی زرخیز اور شاداب عورت کی طرح نمودار ہوتا ہے تو اُس کی کوکھ سے چھوٹے چھوٹے جھوٹ تواتر سے جنم لیتے ہیں۔

مسٹر نارمن اپنے اسٹور میں کام کر رہے تھے۔ انھیں دن میں کئی بار یہ جواز دے کر اپنا ضمیر تھپکنا پڑا کہ وہ اس چھوٹی سی غلط بیانی کے باعث ایک بڑی جواب دہی سے بچ گئے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے جھوٹ بولنے کی خلش نے اُن کے ذہن پر کچوکے لگانے شروع کر دیے۔ انھوں نے تنگ آ کے فیصلہ کر لیا کہ رات کو وہ بیوی کے سامنے سچی بات کہہ دیں گے اور اُس سے معذرت کر لیں گے۔

لیکن رات کھانے کے بعد کوشش کے باوجود وہ اپنی بیوی سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ انھوں نے سوچا کہ صبح اُن کے منہ سے جو جھوٹ نکلا تھا، اتنی دیر بعد اُس کی تشریح، تصحیح اور پھر معذرت سے بات بگڑ جائے گی خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا ہوگی۔ ممکن ہے بات سنبھالی نہ جا سکے مفت میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سب کچھ بھول جائیں۔

وہ یہ بات ایک ہفتے تک بھولے رہے مگر جب انھیں دوسری بار ذہنی جھٹکا لگا تو سب کچھ یاد آ گیا۔ ایک صبح انھوں نے اپنی کار کا دروازہ سب تک

ابھی پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا کہ عطر کی بھینی بھینی مہک اور تمباکو کی تلخ بو نے ایک ساتھ اُن کی ناک کو دعوتِ مبارزت دی۔ شاید اُس نامعلوم رومانی جوڑے نے گزشتہ رات پھر کار میں کچھ وقت گزارا تھا۔ مسٹر نارمن سوچنے لگے۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ سامنے سے اُن کی بیوی خالی ٹوکری سنبھالے ہوئے تیز تیز قدموں سے اُن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مسٹر نارمن ایک دم خوف زدہ ہو گئے۔ اُن کی زندگی میں خوف و دہشت کے ایسے لمحے بہت کم آتے تھے۔
انھوں نے کار کا دروازہ تیزی سے اس طرح جھلانا شروع کر دیا، جیسے بولٹ چیک کر رہے ہوں۔ وہ عطر کی مہک اڑانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی بیوی نے قریب پہنچ کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈیر! میں نے سوچا، تمھیں واپس آنے کی زحمت سے بچا دوں۔"

مسٹر نارمن نے صرف ایک لمحے میں ڈھیروں باتیں سوچ لیں۔ اگر بیوی کو مہک کا پتہ چل گیا تو وہ ضرور جرح کرے گی اور انھیں لامحالہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اس تجربے سے ایک بار پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ پھر بیوی لازماً اُن سے جواب طلب کرے گی کہ اتنی اہم بات وہ گول کیوں کر گئے تھے؟ اُن کے گول مول جواب سے بیوی کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ صورتِ حال بہت پیچیدہ ہو گئی تھی۔ وہ ہڑبڑائے اور بوکھلا کے کار میں بیٹھ گئے۔

دروازہ بند کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ایڈا! تم کیوں تکلیف کرتی ہو، میں واپسی میں خود تمھارا سامان خرید لاؤں گا۔"

"کیوں؟" اُن کی بیوی کے معصوم چہرے پر حیرت اُبھری۔ "تمھیں معلوم ہے کہ میں کافی اور کریم رول کے بارے میں کتنی محتاط رہتی ہوں۔ یہ چیزیں ہمیشہ کی طرح آج بھی میں خود خریدوں گی۔"

مسٹر نارمن بوکھلا گئے۔ "بات دراصل یہ ہے ڈارلنگ کہ مجھے راستے میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لینا ہے۔ میں جب تک اُس کے ہاں پہنچوں گا......"

اُن کی بیوی نے بات کاٹ دی۔ وہ مشتعل نظر آنے لگی تھی۔ "گویا تم دوست کے لیے بیوی کو چھوڑ دو گے تاکہ وہ بسوں کے دھکے کھاتی پھرے اور اُس کا زکام نمونیے میں تبدیل ہو جائے؟"

"نن..... نہیں۔" مسٹر نارمن کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے رنگ بکھر گئے۔ وہ یہ تو بھول ہی گئے تھے کہ صبح ناشتے کے وقت اُن کی بیوی نے انھیں اپنے زکام کی اطلاع دی تھی۔ انھوں نے اُس وقت کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اب اُنھیں اطمینان ہو گیا کہ شدید زکام کے سبب وہ فی الحال کچھ سونگھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ "میں تو تمھارے ہی آرام کے لیے کہہ رہا تھا۔ خیر چھوڑو، آ جاؤ۔"

اُن کی بیوی برابر کی نشست پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے کار چالیس



(ایک فائرمین نے کم سے کم ایک درجن لڑکیوں کو بچایا لیکن ترقی آج تک اُس کے حصّے میں نہیں آئی۔ اُس نے اُن لڑکیوں کو اپنے افسر کے چنگل سے بچایا تھا۔

○

نوجوان مہمان نے حسین میزبان سے کہا: "میں دیکھنے میں لمبا تڑنگا نظر آتا ہوں لیکن مزاج کے اعتبار سے بالکل بچہ ہوں۔ مجھے تو اکیلے سوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

میل کی رفتار پر چھوڑ دی خطرہ ٹل چکا تھا۔ شاید اب ایسا موقع نہ آئے مسٹر نارمن مستقبل کے بے معنی اندیشوں سے گھبرانے والے آدمی نہیں تھے، جو ہو گیا، سو ہو گیا۔

شاید اتوار تھا۔ آج اُن کی بیوی نے پہلی بار وہ خوشبو محسوس کی۔ دونوں میاں بیوی مچھلی کے شکار کے لیے باہر نکلے تھے۔ مسٹر نارمن ذہنی طور پر اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے جب بیوی نے اُن سے خوشبو کے بارے میں استفسار کیا تو جواب میں اُن کے بے ربط جملوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں نے بات بہت الجھا دی۔ انھوں نے بھونڈے پن سے موضوع بدلنے کی کوشش کی..... پھر صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے "مجھے تو کوئی خوشبو وشبو نہیں آ رہی ہے"۔ پھر خاصی دیر بعد بیوی کی خشمگیں نظروں سے آنکھیں چرا کے انھوں نے آہستگی سے اقرار کیا کہ ہاں شاید انھیں کوئی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ اُن کا چہرہ شرمندگی کی عکاسی کر رہا تھا۔ پھر وہ ہونٹ سی کے بیٹھ گئے۔ یہ ایک مجرمانہ تجاہل تھا۔ اُن کی بیوی منتظر تھی کہ وہ اُس خوشبو کے بارے میں مزید کچھ بتائیں گے "مم..... میں خود سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا معاملہ ہے"۔ وہ بڑبڑائے۔

بیوی خاموش ہو گئی مگر اُس کے ذہن میں بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں سر اُٹھانے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتیں، بہت اہم ہو کر اُس کے تصوّر میں ناچنے لگیں۔ اسٹاک کی چیکنگ، رات گئے تک باہر رہنا اور اُس دن اپنے دوست کا بہانہ کر کے اکیلے جانے کی ضد کرنا۔ نارمن اُسے کتنی سادہ لوح، بلکہ احمق سمجھتا ہے۔ گاڑی چلتی رہی۔ باہر سورج چمک رہا تھا۔ دونوں کے دل و دماغ کہیں اور تھے۔ کار کے باہر گرمی کا خوش گوار موسم تھا لیکن اندر بلا کا حبس تھا، ایک تکلیف دہ سنّاٹا تھا۔ ایسا ساکت سنّاٹا جسے بآسانی چاقو سے کاٹا جا سکتا تھا، برابر برابر بیٹھے ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت دُور تھے۔

رات کا ذکر ہے مسٹر نارمن نے دیکھا کہ اُن کی بیوی اپنے عزیز کتّے کو ٹہلانے کی تیاری کر رہی ہے۔ انھیں اچانک ایک خیال آیا۔ باہر نکلنے کا ایک معقول عذر موجود تھا اور اس وقت وہ اُس رومانی جوڑے کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے تھے۔ وہ جوڑا اُن کی پُرسکون ازدواجی زندگی میں آہستہ آہستہ زہر گھول رہا تھا۔ "ایڈا!" انھوں نے پیار کے لہجے میں آہستہ سے اپنی بیوی کو پکارا۔ "تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو" وہ ایک لحظے کے لیے رُکے، پھر بولے "اگر کہو تو کتّے کو آج میں ٹہلا لاؤں؟"

بیگم نے اسکارف باندھتے باندھتے رُک کر انھیں گہری نظر سے دیکھا صبح سے وہ اُن کی ایک ایک حرکت، ایک ایک لفظ کا تجزیہ کر رہی تھی پھر بھی اُس پر اس پیش کش کا ردِّ عمل ناخوش گوار نہیں ہوا کیوں کہ وہ صورت سے واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی ــــ کئی گھنٹوں سے وہ شدید ذہنی کرب میں گرفتار تھی۔ "اچھّی بات ہے تم چلے جاؤ۔" اُس نے آہستہ سے کہا اور مسٹر نارمن کے چہرے پر اپنے جواب کا ردِّ عمل ڈھونڈنے لگی۔

مسٹر نارمن کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ "لیکن ابھی نہیں، میں گیارہ بجے کے بعد جاؤں گا۔" انھوں نے کرسی پر پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ جتنی دیر بعد باہر نکلتے چوروں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا اتنا ہی زیادہ امکان تھا۔

اُن کی بیوی نے غور سے اُن کا چہرہ دیکھا۔ گیارہ بجے؟ کتّے کو اتنی رات گئے ٹہلانے کی کیا تُک ہے؟ اُس کے ذہن میں چھپکلیاں سی رینگنے لگیں اور مکڑی کے جالے سے بننے لگے۔ آخر وہ کون لڑکی ہے جو اُس کے شوہر پر عطر نچھاور کرتی ہے۔ ممکن ہے ان کی کوئی دفتری ساتھی ہو؟ ایڈا نے ذہن میں اٹھنے والی آندھیوں کے درمیان یاد کرنا شروع کیا کہ مسٹر نارمن کب کب رات گئے گھر سے باہر نکلے تھے۔ کبھی اگنیشن میں چابی بھول جانے کے بہانے، کبھی تازہ ہوا کھانے کے بہانے، کبھی کار میں کوئی چیز چھوٹ جانے کے بہانے۔ "نارمن!" اُس نے اپنے شوہر کی طرف پھیکی سی طنزیہ مسکراہٹ اُچھالی۔ "میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ تم آرام کرو، کتّے کو میں خود لے جاتی ہوں۔" وہ گھر سے نکل گئی۔

مسٹر نارمن اُس کی ذہنی کیفیات کچھ کچھ سمجھ رہے تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ایڈا کی قلبی واردات کتنی گہری ہو گی۔ انھیں اُس سے ہمدردی ہوئی لیکن بات اب اتنی پیچیدہ ہو چکی تھی کہ اُسے سلجھانے کی کوشش مزید خرابیاں پیدا کر سکتی تھی۔ اُن کے نزدیک اس گتّھی کا واحد حل یہ تھا کہ اُن کی کار استعمال کرنے والا رومانی جوڑا پکڑ لیا جائے۔ انھوں نے اُٹھ کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایڈا کا رُخ کار کی طرف نہیں تھا۔ وہ ایڈا کو اور اُس کے پیچھے کتّے کو دوڑتے ہوئے دیکھتے رہے۔ سڑک کے موڑ پر پہنچ کے وہ دونوں نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ مسٹر نارمن کھڑکی سے ہٹے اور تیزی سے گھر سے نکل کے پارکنگ کے مقام کی طرف بڑھے۔ کار کے پاس پہنچ کے انھیں

مایوسی ہوئی۔ کار خالی تھی لیکن موسم خوش گوار تھا اس لیے یہ امکان روشن تھا کہ نامعلوم رومانی جوڑا اپنے خلوت کدے میں پہنچنے ہی والا ہوگا۔ مسٹر نارمن کو بے ساختہ اپنا زمانہ یاد آگیا۔ وہ افسردہ ہوگئے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ اور ایڈا بھی تنہائی کے گوشے ڈھونڈتے تھے۔ زیرِ تعمیر عمارتوں کے نِسّیڈوں اور خالی گاڑیوں کی تلاش میں اُن کا بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ جگہ تلاش کرتے کرتے جب دونوں تھک جاتے تھے تو حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کے رہ جاتے تھے۔ مسٹر نارمن کے دل کی گہرائی سے ایک ٹیس اٹھی۔ انھوں نے اپنی خوش گوار زندگی کے بے شمار شب و روز ایڈا کی رفاقت میں گزارے تھے۔ اچانک کتّا بھونکا۔ مسٹر نارمن اچھل پڑے۔ نہ معلوم ایڈا کتنی دیر سے انھیں استغراق میں کھڑا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ گڑبڑا گئے۔ "مجھے بھی گھر میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ذرا کار تک چہل قدمی کرلوں۔" انھوں نے خوش دلی ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بات جمی نہیں، فضا سرد ہی رہی۔ وہ اور ایڈا منہ لٹکائے گھر لوٹ آئے۔

رات حیران کن حد تک بے نیند ثابت ہوئی۔ کم سے کم ایڈا کے لیے۔ وہ اپنے آپ سے ایک خاموش جنگ کر رہی تھی۔ اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ مسٹر نارمن کسی اور لڑکی کے چکّر میں پھنس گئے ہیں۔ سوچتے سوچتے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ مسٹر نارمن کے لیے گھر میں وہی کشش اور دل چسپی پیدا کرے گی جسے مسٹر نارمن باہر تلاش کر رہے ہیں۔

ایڈا اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے لیے بے شک کچھ نہیں کرسکتی تھی لیکن خود کو آراستہ تو رکھ سکتی تھی۔ کیا زیادہ عمر کی عورتیں سنگھار نہیں کرتیں، وہ لباس کے انتخاب میں تو سلیقہ پیدا کرسکتی تھی، پکوان تو بہتر بنا سکتی تھی۔ اُس کے نزدیک یہ حربے نارمن کی عمر کے لوگوں کو دوبارہ واپس لانے میں معاون ثابت ہوسکتے تھے اور پھر وہ مخصوص عطر، اُس نے ذہن پر زور دیا۔ وہ یقیناً گلاب کا عطر تھا۔ گلاب کا عطر آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ صبح ایڈا نے مسٹر نارمن کو بتایا کہ وہ کچھ دیر بعد بس میں بازار جائے گی۔ مسٹر نارمن اُس کا یہ اجتناب رات کے واقعے کی ایک کڑی سمجھے اور گھر سے نکل کے نہایت خوش گوار موڈ میں کار میں داخل ہوتے۔ عطر کی خوشبو اور تمباکو کی تلخ مہک نے اُن کا استقبال کیا۔ گویا رات پھر اُن کی کار نے اُس جوڑے کو اپنی آغوش میں چھپایا تھا۔ "ہونہہ، جہنّم میں جاتے۔" انھوں نے سر جھٹک کے سوچا، پولیس کو اطّلاع دینی پڑے گی۔ میں دفتر پہنچتے ہی تھانے فون کروں گا۔"

مسٹر نارمن کو معلوم تھا کہ پولیس تمام تفصیلات جاننا چاہے گی۔ اُن کی ایک دفتری ساتھی مس فلورا دفتر کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اشارے سے اُسے بلایا اور کار میں آ کے خوشبو سونگھ کے یہ اندازہ لگانے کے لیے سب رنگ کہا کہ یہ کس عطر کی خوشبو ہے۔ مس فلورا کار میں بیٹھ گئی۔ پھر جب وہ کار سے باہر نکل رہی تھی تو حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اُسی وقت ایڈا کی بس وہاں سے گزری۔ ایڈا نے اپنے شوہر کی کار سے دو سڈول، پُرکشش اور چمک دار پنڈلیاں باہر نکلتی ہوئی دیکھیں اور یہ بھی دیکھا کہ شوہرِ نامدار کار کا دروازہ کھولے، چہرے پر فدویانہ مسکراہٹ پھیلائے، تعظیمی انداز میں جھکے ہوئے کھڑے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، ایڈا نے سر جھٹکا۔ وہ اپنی ذہنی کیفیات اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اُس نے اپنے مشتعل جذبات سمیٹے اور بس سے اُتر کے جو سب سے پہلی چیز خریدی، وہ گلاب کا عطر تھا۔

اُس دن مسٹر نارمن بے حد مصروف رہے، انھیں سر اٹھانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ پولیس کو فون کرنے کا مسئلہ دھرا رہ گیا حالانکہ انھوں نے تمام تفصیلات تیار کرلی تھیں کہ عطر کا نام کیا ہے اور سگریٹ کون سی ہے؟ سہ پہر کے قریب انھوں نے ایڈا کو فون کیا اور معذرت چاہی کہ آج رات وہ دیر سے گھر لوٹیں گے، شاید نو بجے کیوں کہ آج اسٹاک کی چیکنگ کا آخری دن ہے۔ ایڈا نے نہایت سرد مہری سے "بہت اچھا" کہہ کے فون بند کردیا۔ مسٹر نارمن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ایڈا نے ایسا روکھا رویّہ زندگی میں پہلی بار ظاہر کیا تھا۔ ایڈا ایسے انتہا تھکی ہوئی چند ہی لمحے پہلے گھر لوٹی تھی۔ جدید ترین تراش خراش کے ملبوسات سے لدی پھندی وہ اپنے ڈھلتے ہوئے بدن کی عمارت پر نیا پلاسٹر چڑھا کے، وقت کی گردش پیچھے لوٹانے کی فکر میں تھی۔

مسٹر نارمن رات کو دس بجے کے قریب گھر لوٹے۔ گھر میں انھیں سخت سنّاٹے کا احساس کا ہوا۔ انھوں نے سارا گھر چھان مارا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ حتّٰی کہ اُن کے چہیتے کتّے نے بھی دُم ہلاتے ہوئے اُن کے

اُردو — کراچی سے فضلی بخاری نے بھیجا

اُردو کے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ایک ریستوراں میں چائے پینے گئے۔ چائے بناتے وقت کیتلی اُن کے ہاتھ سے گر کے ٹوٹ گئی۔ بیرا ساڑھے چار رُوپے کا بل لایا۔ آٹھ آنے چائے کے اور چار رُوپے کراکری کے۔ منٹو نے خاموشی سے بل ادا کردیا۔ دُوسرے دن وہ پھر اسی ریستوراں میں چائے پینے گئے۔ ابھی وہ چائے پی ہی رہے تھے کہ ایک دم شور ہوا۔ "سانپ۔ سانپ۔ سانپ۔" ریستوراں میں بھگدڑ مچ گئی۔ میزیں اُلٹ گئیں اور برتن ٹوٹ گئے۔ لوگ باہر بھاگنے لگے۔ بیروں نے کسی نہ کسی طرح سانپ کو مار ڈالا۔ جب بیرا منٹو کے پاس بل لایا تو وہ صرف آٹھ آنے کا تھا۔ منٹو نے اس سے پُوچھا۔ "آج آپ نے اس میں کراکری کی قیمت نہیں لگائی؟"

بیرے نے کہا۔ "صاحب اس میں آپ کا کیا قصور؟ کراکری تو سانپ کی وجہ سے ٹُوٹی ہے۔"

منٹو نے بل ادا کرتے ہُوئے کہا۔ "مگر مجھے تو کوئی بچت نہ ہُوئی۔ میں سانپ چار رُوپے میں خرید کے لایا تھا۔"

قدموں میں لوٹ نہیں لگائی۔ ہر شے جوں کی توں موجود تھی ایڈا کے سوا اور اُس کے چہل قدمی کے لباس اور ہیٹ کے سوا۔ یہ ہیٹ وہ صرف شادیوں میں پہنا کرتی تھی۔ اچانک مسٹر نارمن کے نتھنوں سے بڑی مخصوص مہک ٹکرائی۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو کے رہ گئے۔ پھر انھیں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ ایڈا تو کبھی خوشبو استعمال ہی نہیں کرتی تھی۔ کیا چکر ہے؟ پھر آہستہ آہستہ انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ وہ ایڈا سے متعلق بیسیوں باتوں سے لاعلم ہیں۔ انھوں نے شیلف پر رکھی ہوئی عطر کی چھوٹی سی شیشی ڈھونڈ نکالی اور اُسے غور سے دیکھا۔ بہت عمدہ۔ وہ طنز کے لہجے میں زیرِ لب بولے۔ تو محترمہ یہ خوشبو استعمال کرنے لگی ہیں، خوب! کس کے لیے؟ کیا میرے لیے؟ نہیں۔ انھوں نے نفی میں گردن ہلائی۔ میرے لیے نہیں۔ بلکہ میری غیر موجودگی میں کسی اور کے لیے۔ جب وہ تنہا فلم دیکھنے جاتی ہیں یا کہیں اور جاتی ہیں یا پھر رات گئے، اُس وقت جب وہ کتے کو ٹہلانے کے لیے جاتی ہیں۔ عطر کی ننھی منی شیشی اُن کے لیے زہر کی شیشی ثابت ہونے لگی۔ اُن کے ذہن میں بھی چھپکلیاں سی رینگنے لگیں، مکڑی کے جالے سے بننے لگے۔ ایڈا کتنی خوب صورتی سے مجھے احمق بناتی رہی ہے اور اُس نے کار والی خوشبو کی نشان دہی کیسے انوکھے انداز میں کی تھی تاکہ اُس پر شک ہی نہ کیا جاسکے کافی اور کریم رول کے لیے بلاناغہ اور اصرار سے جانا؟ وہ تنہا بازار جانے کا کوئی موقع کبھی ضائع نہیں کرتی۔ کل رات ہی کی بات ہے، وہ ٹہلتے ٹہلتے اُس منحوس جگہ کیوں گئی تھی جہاں کار کھڑی ہوتی ہے۔ اُن کے منہ سے ایک سسکاری اُبھری۔ شاید اب ایڈا کو پکڑے جانے کا خدشہ ہو گیا ہے اسی لیے اُس سے بوکھلاہٹیں سرزد ہونے لگی ہیں۔ وہ آخر کس قسم کی عورت ہے؟ اُن کے اعصاب پر کالے کالے اژدہے رینگنے لگے۔ وہ مُرے مَرے قدموں سے سیڑھیاں اتر گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی اقدام کریں گے۔ کیا یہ اُن کی غلطی ہے؟ کیا انھوں نے کبھی ایڈا کو کہیں، کسی موقع پر کسی طرح نظر انداز کیا ہے؟ یہ کھیل کتنی مدت سے جاری ہے؟ خیر! وہ ان باتوں کا بہت جلد سُراغ لگالیں گے۔ شاید اس وقت ایڈا شہر کے اکلوتے سینما ہال گئی ہو؟ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ وہیں پہنچ کے اُس سے اچانک ملاقات کریں گے۔ صرف اُس سے یا؟ اُن کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ کچھ بھی ہو، ایڈا اُن کی بیوی ہے، ایک طویل رفاقت کی ساتھی۔ وہ سیدھے دروازے پر پہنچے اور تیز تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھے۔

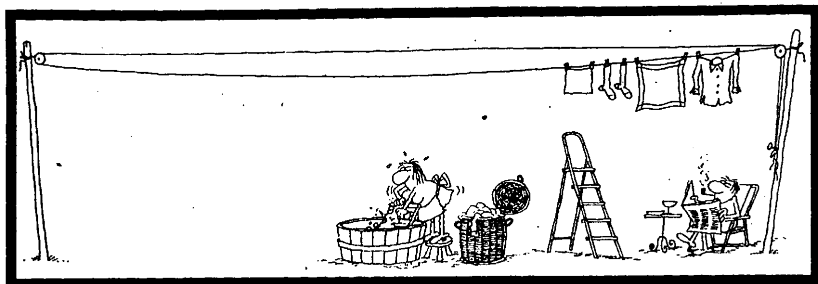
ایڈا آج خاصی تھک چکی تھی۔ آج اُس نے بہت لمبا گشت لگایا تھا۔ اس طویل گشت کے دوران میں وہ مختلف ذہنی کیفیات سے دوچار رہی تھی اور آخر تھک کے اُس نے سوچا تھا کہ سب کچھ بھول بھال کے مسٹر نارمن کو معاف کر دینا چاہیے۔ مردوں کی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرنا عقل مندی ہے۔ اچانک اُس کی نظر اپنے شوہر پر پڑی۔ مسٹر نارمن تیزی سے کار کی طرف جا رہے تھے۔ وہ رات دس بجے گھر واپس آئے ہیں پھر بھی اُن کا دل نہیں بھرا؟ مطلع صاف دیکھ کے پھر اُڑنے کے موڈ میں ہیں۔ ایڈا دوسری طرف سے آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھی۔

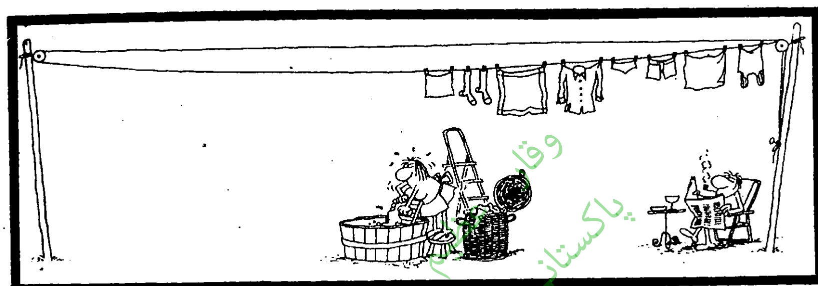
مسٹر نارمن جیسے ہی کار کے قریب پہنچے، ٹھٹک کے رہ گئے۔ کار خالی نہیں تھی۔ اب ایڈا کو سینما جا کے پکڑنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ کام وہ یہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا دیکھا۔ اُسی لمحے اُنھیں ایک دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ مزید برداشت کرنا اُن کے اختیار میں نہیں رہا۔ دوسری طرف ایڈا کے اعصاب بھی جواب دے گئے۔ وہ بھی تیزی سے کار کی جانب بڑھی۔ اطراف میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایڈا کی نظریں کار کے اندر دھنسی جا رہی تھیں۔ سگریٹ کا جلتا ہوا سرا، دبی دبی ہنسی۔ اُس کا ذہن خلاؤں میں ڈولنے لگا۔ اچانک اُس کی نظر اندھیرے کا سینہ چاک کر کے مسٹر نارمن پر پڑی۔ وہ کار کے دوسری طرف کھڑے تھے۔ اُسی لمحے مسٹر نارمن نے بھی ایڈا کو دیکھ لیا۔ کائنات کی گردش کچھ لمحوں کے لیے تھم سی گئی۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور شرمندہ ہو کر نیچے جھک گئیں۔ پھر اُٹھیں، پھر جھکیں۔ دونوں کی نگاہوں میں انفعال، تعجب اور سکون تھا۔ "ایڈا!"

"نارمن!"

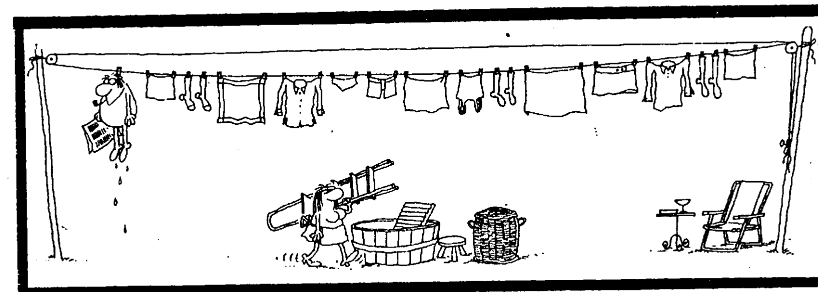
مسٹر نارمن آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایڈا کی طرف پہنچ گئے۔ انھوں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کچھ جھک کے کار کے اندر نظر دوڑائی۔ دونوں جوان جسم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہلکی ہلکی سانسیں لے رہے تھے۔ مسٹر نارمن نے کار کے ہینڈل پر آہستہ سے ہاتھ رکھا مگر ابھی وہ دروازہ کھولنے نہیں پائے تھے کہ ایڈا کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پہ پہنچ کے رُک گیا۔ وہ اشارے سے اُنھیں منع کر رہی تھی۔ مسٹر نارمن آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام کر کار کے پاس سے ہٹ گئے اور واپسی کے لیے مُڑے۔ اُن کے ہاتھ نے ٹٹول کر ایڈا کی کمر کے گرد حصار بنا لیا۔ انھوں نے سرگوشی کی: "ایڈا! یاد ہے، کبھی تم اور ہم بھی تنہائی کے گوشے ڈھونڈتے تھے۔" پھر جواب کا انتظار کیے بغیر انھوں نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور ڈھلتے بدن کی تلچھٹ منہ سے لگالی۔

عطر کی خوش بو کتنی خوش گوار لگ رہی تھی۔













مکند بھی اس مسئلے سے آپ بھی دوچار ہوئے مگر....

اُردو کی جدید افسانہ نگاری کے تجربہ ساز

جوگندر پال کی تحریر

رام سرن داس نے تلک دھاری بوڑھے پنڈت سے نظر ہٹا کے اپنے آدمی کی طرف حیرت آمیز غصے سے دیکھا۔ "تم نے تو کہا تھا کوئی بدمعاش لاؤ گے؟"

"یہی وہ بدمعاش ہے سرکار!" اس کے آدمی نے جواب دیا۔

"کوئی چھٹا ہوا بدمعاش لاؤ۔ اس بے چارے سے...."

"ان داتا۔" بوڑھے پنڈت نے دونوں ہاتھ باندھ کر اُسے ٹوکا۔ "سیوا کا موقع دیے بغیر آپ میرے گن کیسے جان سکتے ہیں؟"

"تمہارے گن بھی جان لیں گے بابا۔" رام سرن داس نے کہا۔ "یہاں تو بڑے بڑے گنی ہتھیار ڈال کے اپنی اپنی راہ ہو لیے ہیں۔"

"میرے پاس کوئی ہتھیار ہے ہی نہیں ان داتا! اس لیے میرے ہتھیار ڈالنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"سرکار۔" رام سرن داس کا آدمی بولا۔ "بڑے کام کا آدمی ہے۔ اس کا دھندا ہی یہ ہے۔"

"آپ کو اپنی تسلی کرنا ہے ان داتا۔ تو ابھی فون کر کے سیٹھ اچت بھائی سے میرے بارے میں ساری پوچھ تاچھ کر لیجیے۔"

"مگر یہ کام بڑا ٹیڑھا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا بابا؟"

"سب لوگ مجھ مورکھ کو پنڈت جی کہتے ہیں ان داتا۔" پنڈت جی نے رام سرن داس کو بتایا۔

"ہمارا پنڈت بڑا پہنچا ہوا ہے سرکار۔ آپ بے فکر ہو کر اپنا کام سونپ دیجیے۔"

"چلو ٹھیک ہے تمہیں بھی دیکھ لیتے ہیں بابا! پنڈت جی! بولو کتنے پیسے لو گے؟"

"صرف پانچ سو روپے ان داتا۔"

"بہت زیادہ رقم ہے۔"

"میں اپنی فیس سدا کام پورا ہونے کے بعد وصول کرتا ہوں میرے دانا!"

"چلو منظور ہے۔ بولو کیا اسکیم ہے؟"

"اسکیم وسکیم کچھ نہیں شری مان! آپ مجھے اپنا وہ خالی کمرہ رہنے کے لیے دیجیے اور بس؟"

"اتنا آسان کام نہیں ہے، پنڈت جی! وہ بڑا جھگڑالو آدمی ہے۔"

"مگر وہ جھگڑے گا کس سے دیالو؟ میں بالکل جھگڑالو نہیں ہوں۔ آپ بے فکر رہیے۔"

"بے فکر کیسے رہوں؟ میرا تو کھانا پینا اُس نے حرام کر رکھا ہے۔"

"آپ نشچنت رہیں دیالو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا رام رام۔"

دوسرے دن شام کو وید بھوشن دفتر سے لوٹا تو اپنی بیوی کو بے انتہا خوش دیکھ کے سوال کیا۔ "کیا بات ہے؟"

"رام سرن داس نے اپنا خالی کمرہ کرائے پر اُٹھا دیا ہے۔"

"تو اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟"

"بڑے اچھے لوگ آئے ہیں، ایک بوڑھے پنڈت جی ہیں اور ایک اُن کی بیٹی۔ اُس کا نام روپا ہے۔ اُس کا پتی پانی کے جہاز میں انجنیئر ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔"

"بڑی اچھی ہے، تم سے بھی؟"

"اتنی سندر ہے، میں آپ کو کیا بتاؤں۔"

"نہیں۔ کچھ تو بتاؤ۔"

"اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ آپ اسے دیکھیں گے تو۔"

"خالی پیٹ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، جلدی جلدی کھانا لگاؤ۔"

"میں نے اُن سے کہا تھا آج وہ کھانا یہیں کھالیں۔ بس آتے ہی ہوں گے، آپ بیٹھیے۔ میں دیکھتی ہوں، ابھی تک کیوں نہیں آئے۔"

"ہم آ گئے ہیں بیٹی!" باہر صحن سے آواز آئی۔ "لو آ گئے۔"

"یہ ہیں وہ پنڈت جی اور یہ ان کی بیٹی روپا، اور میرے پتی۔"

"نمستے۔"

"نمستے۔"

"جیو بیٹا۔ تمھاری سب کامنائیں پوری ہوں۔"

"آپ بیٹھ جائیے۔"

"لو بیٹھ گیا۔ تم بھی بیٹھ جاؤ روپا! آؤ بیٹھو۔"

"آپ کا داماد پانی کے جہاز میں انجنیئر ہے؟"

"ہاں بیٹا! ایک کمپنی کے مال لے جانے والے جہاز میں۔ تین سال ہو گئے۔ ایک مہینے کی چھٹی پر شادی کے لیے آیا تھا۔ پھر اس کی شکل نہیں دیکھی۔"

رام بھوشن کی بیوی روپا کے ہاتھ دھلا رہی تھی اور رام بھوشن روپا کے گورے گول مٹول ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو ایک ہی جان کے دو بے چین انگوں کے مانند ایک دوسرے سے جڑ کر مل مل کر اُجلے ہو رہے تھے۔ رام بھوشن بڑا نیک طینت اور اصول پرست نوجوان تھا۔ اپنے سامنے رکھی ہوئی شیشے کی ان بریک ایبل پلیٹ کی طرح، جو گر کر بھی ٹوٹنے سے بچ جاتی ہے۔

"ارے کیا کر رہے ہیں آپ؟" اُس کی بیوی نے کہا۔ "شیشے کی پلیٹ ہے، ٹوٹ جائے گی۔"

رام بھوشن نے پلیٹ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ان بریک ایبل گلاس ٹوٹتا ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خالی ہاتھ کی پشت سے آنکھ مل مل کر گویا اپنی شرافت کی چبھن نکالنے لگا۔

"چلیے کھانا شروع کیجیے۔"

دوسری شام کو پنڈت جی نے رام بھوشن اور اُس کی بیوی کو کھانے پر مدعو کیا۔ پیتل کے برتن، جن پر بڑی صاف قلعی کی ہوئی تھی اتنی صاف کہ اُن پر گندے نشان بھی پڑے ہوں تو دھلے دھلے معلوم ہوں۔

رام بھوشن کی بیوی کو تعجب ہو رہا تھا کہ اُس کا پتی سدا اپنے ہاضمے کی خرابی کو روتا رہتا ہے پھر کیوں اندھا دھند کھائے جا رہا ہے؟

"اور لیجیے نا؟"

"بس۔" کہہ کے اُس نے روپا کے ہاتھوں سے ایک پھلکا اور لے لیا۔

"پیٹ کا دھیان رکھیے۔" اُس کی بیوی نے آواز دی۔

"پیٹ کا دھیان رکھنا تو استریوں کا کام ہے دیوی!"

"پنڈت جی کا جواب سیدھا سادھا تھا پر رام بھوشن کی پتنی شرما گئی۔

"بیٹا رام بھوشن۔" پنڈت جی کو بات سے بات سوجھی۔ "ہمارا آنگن سونا سونا ہے۔ اگر بھگوان جلدی سے ہمیں ایک پوتا دے دے تو سارا سارا دن اُس سے کھیلتا رہوں۔"

رام بھوشن کی نوعمر پتنی نے اندھی اندھی خوشی سے اپنا دوپٹا ماتھے سے نیچے سرکا لیا اور رام بھوشن نے اُس کا اندھا پن محسوس کر کے روپا کی طرف نظر اُٹھائی جو تپے ہوئے سفید آلو کے مانند اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"آلو؟"

"نہیں۔" حسبِ سابق نہیں کہہ کے اُس نے آلو لینے کے لیے تھالی روپا کی طرف بڑھا دی۔

سبھی سبھی آگ پر ہانڈی پکتی رہی۔

پندرھویں روز رات کے ساڑھے دس بجے پنڈت جی رام بھوشن کی بیوی کو رامائن کی کتھا سے اُٹھا کے مندر سے باہر لائے اور سرگوشی میں اُس سے گویا ہوئے۔

"بیٹی، میری اور تمھاری عزت کی بات ہے۔ تم بھی گھر سے باہر نہیں

اور میں بھی میں اپنے وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا اور۔۔۔"

"ہوا کیا ہے پنڈت جی؟"

"آؤ میرے ساتھ چلو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

"پر ہوا کیا؟" رام بھوشن کی پتنی کو دل و دماغ میں اپنے شیشے کے ان بریک ایبل برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔

"آؤ بیٹی! ڈرو کو نہیں، چلو آؤ۔"

وہ دونوں اپنے گھر کی جانب قدم اٹھا رہے تھے۔

"اب ایک ہی اپائے ہے، اِس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، جو ہوا سو ہو گیا، معاملہ اس سے آگے نہ بڑھے، تمہارا گھر بھی بسا رہے بیٹی اور میری بیٹی کا گھر بھی نہ اجڑے۔"

"ہائے، آخر ہوا کیا ہے پنڈت جی؟"

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا، میری بیٹی اور تمہارا پتی۔"

"اپنے پتی کی شرافت کی سوگند کھانے کے لیے میں آگ میں ہاتھ ڈال سکتی ہوں۔"

"تمہارا ہاتھ جل جائے گا بیٹی اور میری روپا کا سہاگ بھی اجڑ جائے گا۔ اب ایک ہی اپائے ہے مگر آؤ پہلے تم دیکھ تو لو، میرے داماد کو خبر ہو گئی تو خون خرابے کی نوبت آ جائے گی، میں شریف آدمی ہوں بیٹی! خون خرابے سے ڈرتا ہوں، آؤ، رک کیوں گئیں۔"

وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے تو پنڈت جی نے آہستہ سے کہا۔

"دبے پاؤں چلو۔"

وہ دونوں دم سادھے پنڈت جی کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ رام بھوشن روپا سے کہہ رہا تھا "میری پتنی کی پروا نہ کرو روپا! تم مجھے جان سے زیادہ پیاری ہو۔"

"کاکا وید بھوشن!" دفعتہً پنڈت جی نے بہ آواز بلند کہا "دروازہ کھول دو۔"

خاموشی!

"کھولو کاکا! تمہاری پتنی بھی میرے ساتھ یہاں کھڑی ہے۔"

حلق میں پھنسی پھنسی خاموشی!

"اگر تم نے فوراً دروازہ نہ کھولا" وید بھوشن کی بیوی نے چلا کر کہا "تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔"

ہڑبڑائی ہوئی خاموشی۔ دروازہ کھل گیا۔ روپا نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے قدموں پر گرا کر اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

پنڈت جی نے اندھیرے میں وید بھوشن کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی تجربہ کار چور مالِ غنیمت دیکھتا ہے اور پھر بارعب لہجے سے بولے۔

"میں بڑا غریب اور شریف باپ ہوں کاکا وید بھوشن! اب ایک ہی اپائے ہے اگر تم اپنی پتنی کو لے کر کل سویرے سدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ تو ہم دونوں کی شرافت بنی رہے گی، میں ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا۔۔۔۔"

"آپ دیوتا ہیں پنڈت جی!" وید بھوشن کی بیوی نے اپنے پتی کی طرف زہر بھری نظر سے دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز سے کہا "میں اب ایک منٹ بھی ان کو اس مکان میں نہیں رہنے دوں گی۔"



سولھویں دن پنڈت جی رام سرن داس کے سامنے حاضر ہوئے "لائیے دیالو میرے پانچ سو روپلے۔"

"ہاں بھئی مان گئے تمہیں، وید بھوشن مکان کی چابی دے گیا ہے۔"

"میری فیس۔"

"ہاں دیتا ہوں بابا۔"

رام سرن داس کے آدمی نے فوراً کہا "سرکار نے کرائے داروں کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ بدمعاش مکان کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔"

اُسی وقت رام سرن داس بولے "اب میرے مکان کی پوری قیمت وصول ہو گئی، لاؤ تم بھی اپنے کمرے کی چابی، یہ لو تمہارا پانچ سو روپیہ۔"

"دھنیہ واد، دیالو۔"

"اور تمہارے کمرے کی چابی؟"

پنڈت جی نے رقم گن کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔

"ان داتا! میں نے اپنی بیٹی کو یہاں بلا لیا ہے۔ جب تک ہمارے رہنے کو کوئی اور مکان نہ ملے دیالو!"

رام سرن داس اچھل پڑا "دیکھو گرو میرے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں چلے گی، چابی لاؤ، ورنہ میرے آدمی تمہارا خون پی جائیں گے۔"

"میرا خون پی کے کسی کو آنند پراپت ہو مائی باپ تو مجھے کوئی عذر نہیں مگر میں اپنی جوان بیٹی کو لے کر کہاں جاؤں؟ ہاں ایک کام کریں تو بات بن سکتی ہے۔" پنڈت جی کی آواز بڑی سرل تھی "میں نے ایک خالی کمرہ دیکھ رکھا ہے۔ سالا مکان کا مالک پگڑی کے ڈھائی ہزار مانگتا ہے۔ اگر آپ میرے بھاڑے کے دو ہزار بڑھا دیں تو اپنے ماتھے پر آپ کی دھول کا تلک لگا لوں۔"

"میری دھول تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"دیوتاؤں کی دھول سستی تھوڑی ہوتی ہے دیالو! آپ ہی کہیے میں اپنی جوان بیٹی کو لے کر کہاں جاؤں؟"

"میرے پاس لے آؤ۔" رام سرن داس نے غصے سے لال پیلے ہو کر پنڈت جی کو گالی دی۔

"آپ ہی کے پاس لے آؤں گا مائی باپ۔" پنڈت جی نے بڑی شانتی سے اسے جواب دیا "انکار کیا تو میری شرافت گھر بار کے بغیر دبلیا لگے گی۔"





نئے عہد کے لوگوں کے لیے نئے عہد کی ایک کہانی
احمد ندیم قاسمی کی شوخیٔ تحریر
عبرت آثر، تازہ تر



اور یہ مسئلہ اب تک تصفیہ طلب ہے
کہ قاسمی صاحب زیادہ اچھے شاعر ہیں
یا زیادہ اچھے ادیب ؟

اس چھوٹی سی سڑک کو بلدیہ پام لین کہتی ہے۔ دس برس قبل میں نے اسے نخلستان کہنا شروع کر دیا اور اب کیفیت یہ ہے کہ چند روز پہلے اسی سڑک پر ایک ہرکارہ پام لین کا راستہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ کہیں یہ نہ سمجھیے گا کہ نخلستان کے بنگلوں پر کھجوروں کی چھتریاں سایہ کیے کھڑی ہیں۔ جی نہیں، یہاں یوکلپٹس ہے، شیشم ہے، نیم ہے مگر کھجور کا کوئی ایک بھی پیڑ نہیں۔ کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں کسی کا مزار تھا اور اس مزار کے احاطے میں کھجور کا ایک درخت ہر وقت آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑا رہتا تھا اور پھر جب شہر پھیلا تو مزار کے متولی نے احاطہ مزار سمیت بیچ ڈالا اور کسی دوسرے مزار میں نکل گیا۔ یہاں ایک بنگلا تعمیر ہوا۔

نہ جانے اس بنگلے کا اصل مالک کون تھا مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ابا جان مرحوم نے یہ بنگلا ایک دیوالیا ہندو سیٹھ سے خریدا اور اس کے ماتھے سے "رام نواس" کے الفاظ مٹا کر "ہذا من فضلِ ربی" لکھوا دیا۔ میں اسی "ہذا من فضلِ ربی" میں رہتا ہوں۔

کہتے ہیں اس احاطے کا خریدار بڑا خوش ذوق آدمی تھا۔ اس نے مزار تو ہموار کر دیا مگر کھجور کے درخت کو نہ چھیڑا۔ اس کی رائے میں صرف اس ایک درخت نے سارے بنگلے کے ماحول کو الف لیلوی رنگ دے رکھا تھا۔ بلدیہ نے اسی درخت کی رعایت سے اس چھوٹی سی سڑک کا نام پام لین تجویز کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں بنگلے کے کسی مالک نے وہ درخت کاٹ کر اس سے اپنے گیراج کی چھت کے شہتیر کا کام لیا۔ ابا جان مرحوم نے وہ شہتیر نکلوا

اس ماہ کے لیے اردو کی دو منفرد کہانیاں
وہ تحریریں جو ہمیشہ تازہ رہتی ہیں

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں

کر وہاں لوہے کا گارڈر لگوا دیا اور شہتیر اپنے ایک مزارعہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ مزارعہ ہماری زمینوں پر اپنے لیے ایک کوٹھڑیا کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے اباجان مرحوم سے کہا تھا کہ یہ پرانا دیمک خوردہ شہتیر ہے اور آپ نے اسے گیراج سے اسی لیے نکلوایا ہے کہ کہیں چھت گر کر موٹر کو پچکا نہ دے اس لیے بچارے کو مفت دے دیجیے۔ کڑک کر بولے "کیا وہ ہماری زمینوں کی مفت دیکھ بھال کرتا ہے کہ میں اُسے اتنی بہت سی لکڑی مفت میں دے دوں؟" خدا بخشے اباجان مرحوم بڑے دل لگی باز تھے۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ میرا بنگلا نخلستان میں ہے اور میں "ہذا من فضلِ ربّی" میں تنہا رہتا ہوں۔ تنہا ہی سمجھیے کیونکہ چار نوکروں اور اُن کی بیویوں اور بچوں کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے۔ البتہ سال ڈیڑھ سال پہلے جب میں نے خوشیا کو مالی رکھا تو میری تنہائی میں ذرا سی جھری پیدا ہوئی۔ وہ یوں کہ خوشیا نے آتے ہی میرے بنگلے کے لان اور پھول پھلواری پر یوں لگ کر محنت کی کہ اب بھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ صبح منہ اندھیرے آتا تھا اور شام کو جھٹپٹے میں واپس جاتا تھا۔ میں نے ایک دن خوش ہو کر اُسے دس روپلے انعام میں دے دیے۔ تین چار دن بعد پھر دس روپلے دے دیے۔ چند دن گزرے تو پھر دس روپلے تھما دیے۔ انعام و اکرام کی اس فراوانی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری کوٹھی کا لان بہت خوب صورت ہو گیا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کی بیوی بہت خوب صورت تھی۔ اتنی خوب صورت کہ اب بھی سوچتا ہوں تو ہاتھ سگریٹ کیس کی طرف بڑھتا ہے۔ صبح جب میں ناشتہ کر کے لان میں نکلتا تھا تو خوشیا ہاتھ اُٹھا کر اور اُس کی بیوی آنکھیں جھکا کر مجھے سلام کرتے تھے اور اپنی نظروں سے میری نظروں کا تعاقب کرنے لگتے تھے جیسے اپنی محنت کی داد مانگ رہے ہیں اور میں داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ کبھی دس کا نوٹ، کبھی پندرہ کے نوٹ۔ میں نے انھیں اتنا انعام دیا کہ وہ انعام لینے سے گھبرانے لگے مگر میں انعام دیتا رہا۔ بات یہ ہے کہ خوشیا انعام لیتا تھا تو اُس کا رنگ اُڑ جاتا تھا مگر اُس کی بیوی کے چہرے پر کتنے بہت سے رنگ آجاتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ میں لان میں ٹہلنے نکلا تو مجھے خوشیا کہیں نظر نہ آیا، صرف اُس کی بیوی ایک طرف کھرپا چلا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اُٹھی اور سر جھکائے بیٹھ گئی۔ ایسا لگا جیسے مالن نے میرے ہونٹوں سے لگا ہوا پانی کا گلاس چھین لیا ہے۔ آج میں نے اُس کی آنکھیں جھکنے کا منظر بھی نہیں دیکھا تھا نا اس لیے عجیب تشنگی سی محسوس ہونے لگی۔ سوچا شوہر کے بغیر کچھ زیادہ ہی شرما رہی ہے۔ ابھی خوشیا آئے گا اور میں اُسے انعام دوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں برآمدے میں آ بیٹھا تو ذرا دیر بعد وہ آئی۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب کے پھول تھے اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ بولی "صاحب جی! آپ کا کمرہ کون سا ہے؟"

میں نے کہا "سب کمرے میرے ہیں۔ کیوں؟"

بولی "نہیں جی۔ جہاں آپ سوتے ہیں۔ مالی آج بیمار ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ آپ کے سونے والے کمرے میں یاد سے پھول لگا دوں۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے پوچھا "پھول کہاں ہیں؟"

اُس نے پہلی بار میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ ذرا سے ہلا کر بولی۔ "یہ ہیں۔" یقین کیجیے اتنی کالی اور بڑی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میں نے صرف تصویروں میں دیکھی ہیں۔

میں نے کہا "کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مجھے تو صرف ایک پھول نظر آ رہا ہے۔" اُس کی گھگھی بندھ گئی تو میں نے کہا "مجھے تو بھئی ایک پھول نظر آ رہا ہے۔ مجھے تو صرف تم نظر آ رہی ہو۔"

اُس کے چہرے پر گلاب ہی گلاب کھِل گئے اور گلاب کے پھول اُس کے ہاتھوں سے گر پڑے۔

جی نہیں، وہ میری طرف نہیں بڑھی منطق کا تقاضا بھی یہی تھا اور میں نے انھیں انعام سے بھی مالا مال کر دیا تھا مگر وہ پگلی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ لان میں بھی نہیں گئی جہاں اُس کا کھرپا اور قینچی وغیرہ رکھے تھے۔ وہ سیدھی باہر گئی اور اس کے بعد کوئی ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے نہ وہ آئی ہے نہ خوشیا آیا ہے۔ اپنی تنخواہ تک لینے نہیں آئے۔ احمقوں کو میری کوئی بات بُری لگ گئی۔ اب بھی اُن کی یاد آتی ہے تو منہ کا ذائقہ ایسا لطیف ہو جاتا ہے جیسے الائچی کھالی ہو۔ خدا جانے آج کل کہاں ہیں۔ یہیں اسی شہر میں ہوں گے مگر نہ جانے کس بنگلے میں ہیں۔ بہر حال جہاں رہیں خوش رہیں۔ ذرا سے بیوقوف تھے ورنہ اچھے لوگ تھے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں "ہذا من فضلِ ربّی" میں تنہا رہتا ہوں۔ نخلستان چار بنگلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بنگلے ایک قطار میں ہیں۔ اُن کے سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک کے اس طرف شیشم کے درختوں کا ایک گنجان ذخیرہ ہے۔ پہلا بنگلا میرا ہے اور چوتھا سجاد کا۔ سجاد میرا پرانا لنگوٹیا یار ہے مگر اُس سے میری بول چال آج تک بند تھی اور اس کی وجہ معمولی نہیں۔ سجاد کے بنگلے سے آگے کھیت شروع ہو جاتے ہیں اس لیے یہ بنگلا نخلستان کی چھوٹی سی سڑک کا ٹرمینس ہے۔ ویسے کھیت والوں کے ساتھ اُس کے تعلقات اتنے اچھے ہیں کہ ضرورت پڑے تو کار کھیتوں سے گزار کر چار پانچ فرلانگ پرے ایک کچی سڑک تک لے جاتا ہے جو شہر کے لیے اچھے خاصے شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے مگر میں نے اُس سے ہمیشہ بحث کی ہے کہ شارٹ کٹ کی ایجاد پیدل چلنے والوں نے کی ہے اور موٹر کار والوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے مگر نہیں مانتا۔ بہر صورت دو برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن میں اپنی کار میں شہر کی طرف سے آیا۔ اپنے بنگلے میں مڑ رہا تھا کہ پیچھے سے سجاد اپنی چھوٹی سی کار میں آیا اور میری کار کے ایک پچھلے پہیے کا مڈگارڈ اُدھیڑ کر چلتا بنا۔ میں اگر حواس قائم نہ رکھتا تو میری کار اپنے بنگلے کی حد بندی سے ٹکرا کر سامنے سے بھی پچک جاتی مگر میں نے

سب تک

حدبندی سے بس کوئی ایک انچ کے فاصلے پر روک لی۔ اُترا اور کار کے پیچھے جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مڈگارڈ کاغذ کی طرح پھٹا ہوا ایک طرف لٹک رہا ہے۔ میں نے یہ کار بلیک میں خریدی تھی، بتیس ہزار کی اور اب مجھے بلیک میں اس سے کہیں زیادہ دام مل رہے تھے مگر میں اسے بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ بہت کم اتنی اچھی کاریں میرے ہاتھوں سے نکلی ہیں۔ اُدھڑا ہوا مڈگارڈ دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا۔ نخلستان کے آخری سرے کی طرف نظر اُٹھائی تو یہ دیکھ کر خوشی سی ہوئی کہ سجاد کی کار باہر ہی رُکی کھڑی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کی کار کو بھی کوئی نقصان پہنچا ہے ورنہ کیوں رُکتی مگر یکایک اس خوشی پر غصہ غالب آگیا اور میں کار سے نکل کر سجاد کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سجاد وہیل کے سامنے بیٹھا ہنسی سے بے حال ہو رہا ہے۔ اُس کا سارا خون اُس کے چہرے اور کانوں میں جمع ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، پیٹ ہاتھوں سے دبا رکھا ہے مگر ہنسے جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی سیٹ پر کود پڑا اور اس زور کا قہقہہ مارا جیسے اُس کے پھیپھڑے کی دھجیاں اُڑ گئی ہیں پھر ہاتھ باہر نکال کر اُس نے اپنی کار کو یوں تھپ تھپایا جیسے گھڑدوڑ میں اوّل آنے والے گھوڑے کو تھپ تھپاتے ہیں میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو اُس نے اپنی کار میرا مذاق اُڑانے کے لیے روک رکھی ہے! چوری بھی اور سینہ زوری بھی!

میں نے گرج کر کہا: "کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم نے میری کار کا مڈگارڈ اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے؟"

وہ بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط پاتے ہوئے بولا: "تو میں ہنس کیوں رہا ہوں؟"

"بڑے حرام زادے ہیں آپ!" میں نے کہا۔ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے گھورنے لگا اور پھر ایک دم اُسی شدت سے ہنسنے لگا۔ میں نے کہا: "بڑے اُلّو کے پٹھے ہیں آپ!"

وہ پھر سنجیدہ ہو گیا مگر اب کے سنجیدہ ہی رہا۔ کار اسٹارٹ کر کے اپنے بنگلے کے اندر یوں لے گیا جیسے کار نہیں چلائی، راکٹ چھوڑا ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ اس نے پورچ میں بریکیں لگا کر کار روکی اور پہیوں سے اتنے زور کی چیخیں بلند ہوئیں کہ اُس کے سب ملازم اُس کی طرف بھاگے۔ اُس نے کار سے نکل کر اُدھر کا دروازہ اس زور سے بند کیا کہ اِدھر کا دروازہ کھُل گیا اور وہ پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔ تیری ایسی کی تیسی! میں نے سوچا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد میں بنگلا نمبر ۴ میں آج تک نہیں گیا اور نہ سجاد میرے پاس آیا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ سجاد سے میری بول چال یوں بند ہوئی۔ بہرحال سجاد کو مارئیے گولی۔ مجھے تو دراصل باقی دو بنگلوں کا ذکر کرنا تھا۔ ان میں سے میرے بنگلے سے ملحق بنگلا ایک سابق خان بہادر کا ہے جو آزادی کے بعد اپنا خطاب تو قہرِ درویش بر جانِ درویش واپس کر چکے ہیں مگر کہلاتے خان بہادر ہی ہیں۔ بنگلا نمبر ۳ ایک ایسے صاحب کا ہے جو آزادی کی وجہ سے خان بہادر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا عصبی نظام خراب ہو گیا، پھر ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئے۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ بنگلا نمبر ۴ میں دو برس سے میرا آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ رہے باقی دو بنگلے تو وہاں میرے جانے یا وہاں سے کسی کے میرے ہاں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بنگلا نمبر ۲ کے خان بہادر صاحب سنکی سے آدمی ہیں۔ بنگلے کے ایک پچھلے کمرے میں دن رات بند رہتے ہیں اور کئی برس سے علمِ ہندسہ کی کوئی نئی شاخ ایجاد کرنے کے درپے ہیں۔ رنڈوے ہیں۔ دوسری شادی کرنے سے پہلے عشق کر بیٹھے۔ ناکام رہے اور علمِ ہندسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کبھی کبھی اپنی کئی گز لمبی کار میں ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں تو دکھائی دے جاتے ہیں مگر کار میں بھی انگلیوں پر کچھ گنتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے علاوہ اُس بنگلے میں اُن کی اکلوتی بیٹی "تابندہ" رہتی ہے۔ نفسیات میں ایم اے پاس ہے اور جب دیکھو لان پر بیٹھی پڑھتی نظر آتی ہے۔ میرے علاوہ بنگلا نمبر ۲ والوں کی طرح اُن کی بھی کئی مربع زمین ہے بلکہ اُن کے تو چند ٹرانسپورٹ کمپنیوں میں حصے بھی ہیں اس لیے چار پانچ ہزار ماہانہ آ جاتا ہے۔

بنگلا نمبر ۳ کے مالک تو چل بسے ہیں البتہ اُن کی بیوی زندہ ہیں۔ انھیں اپنی کوٹھی کے لان میں پھولوں کے بجائے سبزیاں اُگانے کا شوق ہے۔ ایک بار کدو کی ایک بیل لپک کر بنگلے کی حدِ فاصل پر چڑھ گئی اور پھیل کر سجاد کے لان میں اُتر گئی۔ ظاہر ہے کہ اُس میں بھی پھول آئے اور کدو لگے اور یہ کدو سجاد کے نوکروں نے اتار لیے۔ کسی طرح بی بی جی کو اس چوری کی اطلاع مل گئی۔ انھوں نے اس پر وہ آفت مچائی، وہ آفت مچائی کہ اپنے لان میں اپنے مالی کے کندھوں پر بیٹھ کر سجاد نے انھیں سلام کیا، کان پکڑ کے معافیاں مانگیں اور بازار سے کدو منگا کر انھیں بھجوائے۔ یوں یہ معاملہ ختم ہوا ورنہ وہ تو رپٹ کرنے چلی تھیں۔ اُن کی بھی ایک اکلوتی بیٹی ہے۔ نام شگفتہ ہے مگر ثمر فرخ تخلص کرتی رہی ہے۔ ابتدا میں برسوں تک فیل ہوتی رہی تو السنہ شرقیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اِن دنوں ہر سال ادیب فاضل کا امتحان دیتی ہے۔ پرچے میں غالب کا کوئی شعر لکھا ہو اور وہ اُسے یاد نہ ہو تو وہیں امتحان کے کمرے میں ارتجالاً شعر کہتی ہے اور غالب کے سر تھوپ کے چلی آتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ نخلستان میں کُل چار بنگلے ہیں۔ چاروں اتنے خاموش ہیں کہ اگر اپنے بنگلے میں لیٹے ہوئے کھانسی آنے لگے تو یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں باقی تینوں بنگلوں میں سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھ نہ کھُل جائے۔ چار بنگلوں کی اپنی اپنی کاریں ہیں۔ سجاد زمینداری کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتا ہے۔ اس لیے اُس کے ہاں شہر سے بھی کاریں آتی رہتی ہیں۔ باقی تینوں بنگلوں میں ہفتے میں ایک آدھ بار کوئی ملنے والا آنکلتا ہو گا۔ نخلستان میں ٹریفک بس اتنی سی ہے۔

ایک روز کسی معاشرتی ادارے کا ایک کارکن سائیکل پر میرے بنگلے میں آیا اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے ملازم نے یہ کہہ کر اُسے ٹالنا چاہا کہ

صاحب سو رہے ہیں۔ ملازم بے چارہ یہ کیسے کہتا کہ تم سائکل پر آئے ہو اس لیے ہمارے صاحب سے تمھارا کیا کام ہو سکتا ہے۔ کارکن بولا کہ وہ تو بنگلے کا نام پڑھ کر اندر آگیا تھا۔ میں نے یہ بات سن لی سچ کہوں شرم آگئی۔ آنکھیں ملتا ہوا باہر آگیا۔ اس نے مجھے سلام کیا او بے نام اور بے پتے کا ایک دعوت نامہ دے کر پوچھا کہ "کیا آپ آنسہ شگفتہ بانو پژمردہ کا پتہ بتا سکیں گے ؟"

میں نے اسے بنگلا نمبر ۳ میں جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔ یہ دعوت نامہ ایک معاشرتی ادارے کی طرف سے منعقد ہونے والے کسی ورائٹی شو میں شرکت کا تھا۔ ڈرامے، گانے اور مشاعرے کا پروگرام تھا۔ سوچا، چندے وندے کا لالچ ہوگا۔ اس لیے دعوت نامے یوں کسی نام و نشان کے بغیر بانٹے جا رہے ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ پروگرام میں ضرور شرکت کروں گا (آخر گانے کا پروگرام بھی تو تھا) اور کسی نے چندا مانگا تو دس پندرہ دے دوں گا (مجھے یہاں یکایک اپنا مالی اور مالن یاد آگئے۔ اچھے لوگ تھے بیچارے) میں یہ دعوت نامہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔ تاریخ تو یاد رہ گئی تھی مگر وقت اور پتہ کون بتائے۔ پھر یاد آیا کہ کارکن شگفتہ بانو کو بھی دعوت نامہ دے گیا تھا۔

میں سلیپنگ گاؤن اور سلیپروں سے بے پروا ہو کر بنگلا نمبر ۳ کی طرف نکل گیا۔ بنگلے کا لان کدو اور کریلے وغیرہ نے ڈھانپ رکھا تھا اور شگفتہ بانو لان کے ایک سرے پر آرام کرسی میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اس لیے آرام کرسی نے اسے چھپا رکھا تھا۔ میں نے شگفتہ کو اس کے بازو سے پہچانا۔ حسن کے معاملے میں میرا نقطۂ نظر میرا اپنا ہے۔ مجھے نہ جسم کی ساخت متوجہ کر سکتی ہے نہ چال کی باضابطہ بے ضابطگی۔ میں صرف چہرے دیکھتا ہوں مگر آج پہلی بار شگفتہ کا بازو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ حسن کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یہ منتشر قسم کی کیفیت ہے اور مجھے اس سہم جماعت کا مذاق اڑانے کا افسوس ہے جو ایک لڑکی کے پاؤں دیکھ کر اسے دل دے بیٹھا تھا۔ یہ بازو اتنا سڈول تھا کہ اگر مجھے اردو لغت مرتب کرنے کی توفیق ہوتی تو لکھتا کہ سڈول شگفتہ کے بازو کو کہتے ہیں۔ کدو اور کریلے کے پس منظر میں اس کے بازو کے چمکتے ہوئے خطوط مجھے کبھی نہیں بھول سکتے (نہ جانے وہ مالن کہاں چلی گئی بیچاری) میں نے شگفتہ کے پاس جا کر کہا: "کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں ؟"

اس نے مجھے پہچان لیا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی اور پکاری: "امی جان! یہ پہلے بنگلے والے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

میں نے کہا: "میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

"کون کس سے ملنے آیا ہے ؟" اس کی امی جان ہاتھوں میں کھرپا اور چہرے پر استفہامیہ لیے کریلے اور کدو کے ڈھیر سے نکل پڑیں۔ انھوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کھرپا زمین پر پھینک کر بڑی طویل و عریض مسکراہٹ کے ساتھ بولیں: "آئیے تشریف رکھیے۔"

مجھے کہنا تو نہیں چاہیے تھا مگر کہہ بیٹھا: "افسوس ہے مجھے کھرپے پر بیٹھنا نہیں آتا۔" پہلے تو دونوں دم بخود رہ گئیں پھر بے قرار ہو کر ہنسیں اور دیر تک ہنستی رہیں۔ آج بھی وہ اسی بے قراری سے ہنستی ہیں اور دیر تک ہنستی رہتی ہیں۔ میں جب روزانہ صبح کار لے کر شگفتہ کے ہاں جاتا ہوں تو وہ نائلون کی ہلکی سبز ساری میں ملبوس میرے انتظار میں بھنڈیاں توڑ رہی ہوتی ہے (مجھے ہلکا سبز رنگ بہت بھلا لگتا ہے) مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ ہنسی پر ضبط کے مارے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ پکارتی ہے: "امی! افضل رتی صاحب آگئے۔"

کدو کی بیلوں سے آواز آتی ہے: "تو پھر بٹھاؤ انھیں کھرپے پر۔"

پھر ہم تینوں زور زور سے ہنستے ہیں اور بڑی بی کو وہیں سبزیوں ترکاریوں میں چھوڑ کر کار میں بیٹھتے ہیں اور سڑک پر آجاتے ہیں۔ کبھی میں کار چلاتا ہوں اور شگفتہ میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہے اور میری ٹائی کی ناٹ کستی اور ڈھیلی کرتی رہتی ہے، کبھی شگفتہ کار چلاتی ہے اور میں اس کے بازو دیکھتا ہوں اور انھیں سہلاتا ہوں اور ان سے اپنا چہرہ ملتا ہوں۔ شگفتہ بہت پیاری لڑکی ہے (جب تک کسی عورت کی شادی نہ ہو جائے، میں اسے لڑکی کہنا پسند کرتا ہوں) وہ میری پہلی دریافت ہے (سوچتا ہوں زندگی میں کبھی ایک بار کہیں سر راہے اس مالن سے میری مڈبھیڑ ہو جائے تو مزا آجائے)

تو میں عرض کر رہا تھا کہ شگفتہ بنگلا نمبر ۳ میں رہتی ہے۔ ایک صبح میں روزانہ کے پروگرام کے مطابق شگفتہ کو بنگلا نمبر ۳ میں اتار کر گھر پہنچا۔ کھانا کھایا، سگریٹ پینے لگا تو سگریٹ لائٹر غائب تھا۔ یکایک یاد آیا کہ واپسی پر لائٹر شگفتہ کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے جلا جلا کر مجھے دھمکی دیتی تھی کہ "جلا دوں تمھاری مونچھیں ؟" (جی ہاں۔ میری مونچھیں ہیں)

لائٹر لینے شگفتہ کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنگلا نمبر ۲ میں تابندہ بیگم کے ہاں گئی ہے۔ گھر واپس آکر ملازم کو بنگلا نمبر ۲ میں بھیجنا چاہا مگر پھر سوچا شگفتہ محسوس نہ کر بیٹھے، خود جانا چاہیے۔ خود چلا گیا۔ ملازم نے اندر اطلاع دی پھر مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ شگفتہ وہاں ہوتی تو میرا نام سن کر فوراً آجاتی یا کم سے کم اپنی موجودگی کا ثبوت ضرور دیتی مگر دیر تک کچھ نہ ہوا۔ میں اس کے انتظار میں دروازے کے پردے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ بڑے عجیب پردے تھے۔ ان پر اوپر سے نیچے تک چھپی ہوئی تصویروں میں سے کوئی ایک بھی دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ کہیں عورت دودھ بلو رہی تھی، کہیں کمہار چاک پر کوزہ بنا رہا تھا، کہیں میراثی ڈھول پیٹ رہا تھا، ایک کسان ہل چلا رہا تھا، ایک کولھو چل رہا تھا، ایک دیہاتی لڑکی دلھن بنی بیٹھی تھی، ایک گھر وندے سے دھواں نکل رہا تھا۔ غرض قسم قسم کے دیہی مناظر کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ تابندہ نفسیات کی طالبِ علم سہی مگر آثارِ قدیمہ کی بھی دلدادہ ہے (میں دیہات کو اپنے ملک کے آثارِ قدیمہ میں شامل کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا تو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے)

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کسی نے عطرِ حنا انڈیل دیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو تابندہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک اور دروازے سے چپکے سے اندر آگئی تھی۔ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "معاف کیجیے گا، میں آپ کے پردے دیکھ رہا تھا۔"

"میرے پردے؟" تابندہ ہنس کر بولی "جی نہیں میرے ڈرائنگ روم کے پردے۔"

میں جھینپ کر مسکرایا تو وہ بولی "معاف کیجیے گا۔ آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ دراصل میں انسانی رشتوں کی نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہی تھی جس کا آخری باب ختم ہونے کو تھا اور میں ختم کر کے اٹھی (کیا لپ اسٹک لگانا اور عطرِ حنا چھڑکنا نفسیات کی ہر کتاب کا آخری باب ہوتا ہے؟) یہ نفسیات ایسا موذی علم ہے کہ ایک آدھ کڑی غائب ہو جائے تو سارا ڈھانچا بکھر جاتا ہے۔ آپ کو بھی نفسیات کے مطالعے سے یقیناً دلچسپی ہوگی۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہہ دیا حالانکہ جاسوسی ناول نفسیات میں شامل نہیں ہوتے۔

"تشریف تو رکھیے نا۔" وہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "آپ تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ یہ بتائیے کون کون سی کتابیں پسند آئیں آپ کو؟"

"یہ پوچھیے کہ کون کون سے انسان پسند آئے۔" میں نے ہنس کر کہا (جانے وہ مالن میرے دماغ میں بیٹھی کھر پے سے کیا کر رہی ہے!)

"آپ تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔" تابندہ بولی۔ "یہ بتایئے آپ نے کون کون سے انسان پڑھے ہیں؟" (پھر وہی مالن) میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے پوچھا "مثلاً کیا ہمارے اس بنگلا نمبر ۳ والے پڑوسیوں کو پڑھا ہے آپ نے؟" پھر وہ یوں قہقہہ مار کر ہنسی کہ اگر میں بھی نہ ہنستا تو بد تہذیب ٹھیرتا اس لیے میں بھی ہنسنے لگا (کہیں شگفتہ ہماری باتیں سُن نہ رہی ہو!)

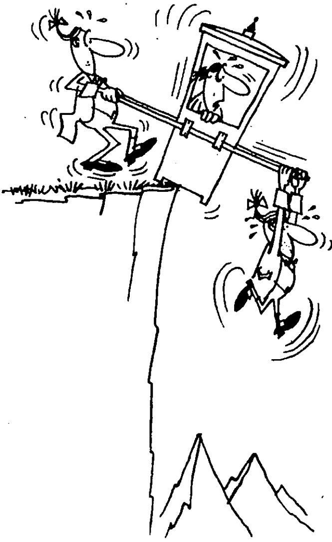
تابندہ کچھ اس طرح ہنسی تھی کہ مجھے کہنا پڑا "عجیب سنکی لوگ ہیں۔"

"سنکی؟" وہ بولی۔ "اجی احمق کہیے۔ اسی شگفتہ کو دیکھیے۔ پانچ لاکھ کے بنگلے میں رہتی ہے اور پڑھتی اردو ہے۔"

تابندہ اب کے پھر زور سے ہنسی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اب کے پھر زور سے ہنسا اور بولا "بنگلے کے لان میں گلاب اور گیندے کی جگہ کدو اور کریلے اُگا رکھے ہیں!"

اس دفعہ تو تابندہ یوں ہنسی کہ اُس کا سارا خون اُس کے چہرے میں جمع ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ان ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔ (ان آنکھوں پر دنیا کے ساتوں سمندر پار قربان (مالن کی آنکھوں سے کتنی ملتی تھیں یہ آنکھیں مگر وہ ذرا زیادہ کالی تھیں۔ کیا تاروں سے جھلکتی ہوئی اندھیری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟)

"اُفوہ!" اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "عجیب بے معنی لوگ ہیں۔



توبہ" پھر وہ ایک ننھے سے رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولی "معاف کیجیے گا۔ آپ ہمارے ہاں پہلی دفعہ آئے ہیں مگر میں یوں باتیں کر رہی ہوں جیسے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ویسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ہزار بار آپ کی آواز سُنی ہے۔ ہزار بار آپ کی کار کی آواز سُنی ہے۔ رسمی تعارف نہیں تھا ورنہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کتاب اُٹھاؤں اور آپ کے لان میں جا بیٹھوں۔ بڑا خوب صورت لان ہے۔" (بیوقوف تھے دونوں مالی اور مالن)

"لیجیے۔ آپ تو کمال کرتی ہیں۔" میں نے کہا "آپ کہیں تو میں اپنا لان آپ کی کوٹھی میں شامل کر دوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔ چلیے ابھی چلیے اور لان میں جا بیٹھیے۔ یقین کیجیے میں آپ کو ہمراہ لیے بغیر نہیں اُٹھوں گا۔"

"تو چلیے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ مجھے کشمیر لیے جا رہے ہیں۔"

"آئیے۔" میں نے دروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم چل کر بولی "آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آج آپ یہاں کیسے بھول پڑے۔"

میں نے فوراً کہا (نہ جانے میں نے سوچے بغیر یہ بات کیسے گڑھ لی) "کل کسی ملازم نے بتایا کہ خان بہادر صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ میں نے

سوچا، تعارف تو نہیں ہے مگر پڑوسی کی حیثیت میں اُن کا مجھ پر اور میرا اُن پر حق ہے۔ اس لیے اُن کے مزاج پوچھتے چلا آیا۔"

"بالکل خیریت سے ہیں۔" تابندہ بولی۔ "اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔ غلط جگہ کہا مگر کہہ دیا۔ دراصل ہم دونوں تیزی میں تھے۔

وہ میرے ساتھ میرے بنگلے میں آ گئی۔ اُس نے لان کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا، سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔

وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آتی ہے۔ مجھے کان سے پکڑ کر اُٹھاتی ہے اور اپنی کار میں بٹھا کر ہوا ہو جاتی ہے۔ یہ کار جہاں سے گزرتی ہے عطرِ حنا کی لکیریں کھنچتی چلی جاتی ہیں۔ تابندہ کی آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ میں وجہ پوچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے کہ "آنکھوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ صحرا، لالہ زار اور سمندر۔ صحرا پیاسا مارتے ہیں۔ لالہ زار سُلاتے ہیں اور سمندر ڈبوتے ہیں۔"

میں کہتا ہوں۔ "تو لاؤ مجھے ان سمندروں میں ڈوب جانے دو۔" وہ میری طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے میں نے اُس کی آنکھیں پیسے دے کر خریدی ہیں اور یقین کیجیے کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو میں ڈوب جاتا ہوں۔ پھر یکایک کسی حادثے سے بچنے کے لیے وہ بریکیں لگاتی ہے، پہیے بلبلا اُٹھتے ہیں اور وہ ہنستے ہنستے اپنا بُرا حال بنا لیتی ہے۔ یوں یہ آنکھیں اور ڈبڈبا آتی ہیں اور یہ سمندر اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ نفسیات میں ایم اے پاس کر لینے کے باوجود نفسیات کے معاملے میں بالکل جاہل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جہالت میری نظر میں اُس کا بھولپن بن جاتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ "تم عمر بھر صرف میرے رہو گے نا؟" اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اُسی کا رہوں گا تو وہ مجھ سے یوں بے قراری سے لپٹ جاتی ہے جیسے میں عمر بھر اُسی کا رہوں گا۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ بنگلا نمبر ۳ اور بنگلا نمبر ۲ میں فلاں فلاں لوگ بستے ہیں۔ ضمناً شگفتہ اور تابندہ کا بھی ذکر آ گیا اور آنا چاہیے کیونکہ شگفتہ کو میں صبح کے بعد اپنی کار میں گھما لاتا ہوں تو تابندہ شام سے پہلے مجھے اپنی کار میں گھما لاتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری شاموں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری صبحوں کا۔ مجھے اُن دونوں کی یہ معصومیت بڑی پیاری لگتی ہے۔

(یہاں ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مالن کے ہاتھوں سے پھول گر پڑے ہیں)

آج صبح جب میں شگفتہ کو دو گھنٹے تک ویران سڑکوں پر گھمانے کے بعد کار گیراج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا اور سگریٹ سلگانا چاہا (لائٹر مجھے دوسرے روز ہی صبح مل گیا تھا) تو ہٰذا من فضل ربی کے پورچ میں ایک کار آ کر رکی۔ میں نے دروازے میں آ کر گیلری سے جھانکا تو یہ بنگلا نمبر ۴ کا سجاد تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو گیا۔ میں پلٹ کر میز کی طرف بڑھا کہ میز کے دراز سے اپنا ریوالور نکالوں (میرے پاس جرمنی میک کا ایک فرسٹ کلاس ریوالور ہے) تو اتنے میں سجاد خادم کے ذریعے اطلاع بھجوانے کا تکلف کیے بغیر اندر آ گیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ پہلے تو مجھے شبہہ ہوا کہ وہ بُری نیت سے آیا ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح میز کے دراز تک پہنچنا چاہیے۔ اس لیے میں نے جسم کو جھٹکے دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اُس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر بولا۔

"میری جان! مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں دو برس تک تمھارا انتظار کرتا رہا کہ تم اپنی زیادتی پر شرمندہ ہو گے مگر پھر سوچا کہ پہلے میں اپنی زیادتی پر شرمندہ ہو لوں۔ ویسے تمھاری کار کا مڈگارڈ تو کوئی دوسری کار بھی اُدھیڑ سکتی تھی مگر مجھے گالی صرف تم دے سکتے تھے، ہے نا؟" پھر اُس نے میرا ماتھا اور میرے گال اور میری گردن چوم لی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہماری حالت ایسی ہو گئی جیسے ہم کبھی خفا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وسکی منگائی (جی ہاں بس دن رات میں دو تین بار یہ شوق کر لیتا ہوں) ایک دوسرے کی پیٹھ اور رانوں پر تھپڑ مار مار کر ہم نے دو برس کی ساری دھول جھاڑ لی۔ "میں آج کل بہت خوش ہوں۔" سجاد بولا۔ "بس صرف تمھاری دوستی کی کمی تھی جو آج مجھے واپس مل گئی۔ اب تو میں بہت ہی خوش ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کیوں؟ کیا کاروبار زوروں پر ہے؟"

"کاروبار تو ہمیشہ زوروں پر رہا ہے خدا کے فضل سے۔" سجاد ایک نیا پیگ بھرتے ہوئے بولا۔ "البتہ زندگی میں کچھ کمیاں تھیں۔ ایک تمھارے جیسے دوست کی کمی اور ایک وہ کمی جس پہ شاعر لوگ عمر بھر شعر کہتے کہتے مر جاتے ہیں۔"

"عشق کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

بولا۔ "ہاں عشق کر رہا ہوں اور بڑے مزے کا عشق کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی تمھاری پڑوسن تابندہ کو دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کار سے اُتارا ہے۔" وہ رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں دیکھنے لگا۔

پھر جب میں نے کہا کہ "جبھی عطرِ حنا کی لپٹیں آ رہی ہیں۔"

تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "روز کا پروگرام یہ ہے کہ صبح کے بعد دو گھنٹے تمھاری پڑوسن تابندہ کے ساتھ گزرتے ہیں اور شام سے پہلے کے دو گھنٹے اپنی پڑوسن شگفتہ مجھے اپنی کار میں لے جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری صبحوں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری شاموں کا۔" وہ میری ران پر ہاتھ مار کر اونچا اونچا ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ "بڑے اُلّو ہو، ایک وقت میں دو عشق کر رہے ہو؟"

ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "سناؤ آج کل تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یار وہ میرا ایک پرانا مالی تھا نا خوشیا۔ اُس کی تلاش میں ہوں۔ اُس کے بغیر لان تباہ ہو گیا ہے۔"

سجاد نے قہقہہ مارا۔ "تم وہی بور کے بور رہے۔" پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولا۔ "بھئی خدا کے لیے بتانا کسی کو نہیں۔"

میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔"







اُس آدمی کا قصّہ جو ایک جزیرے میں رہتا تھا۔

اِس ماہ کے لیے اُردو ادب سے دوسری مُنتخب کہانی

اُردو کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عبّاس کے قلم سے

اُس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اُس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو گاؤں بھر اُس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن راہو کمہار کے بچے نے اُس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اُس کو آدھ مُوا کر دیا۔ اگلے دن ذیل دار کی گھوڑی اُس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے معصوم بچّوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنّم میں جلے گا مگر یہ سب اُس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا، سامنے کسی کی ہمّت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو کہہ دیا "اے بھئی رحیم خاں! تو کیوں بچّوں کو مارتا ہے؟" بس اُس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اُس دن سے لوگوں نے بات کرنی بھی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیئے کوئی کہتا تھا "اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو مگر کس کی مجال تھی کہ اُس کے خلاف گواہی دے کر اُس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا صبح سویرے وہ ہل کندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا، راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اُس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا "کیوں بے نتھو! تو سیدھا نہیں چلتا؟ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا؟" "اور لے چھدّو! تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟" اور پھر ان غریبوں کی شامت ہی آجاتی ہُوت کی رسّی کی مار دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچّوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں [illegible] زیادہ ہے بیوی کو اُدھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اُس کو اُلٹا لٹکا کر بیلوں والی رسّی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اُس کی بیوی اور بچّوں کی مار کھانے اور پیٹنے کی آواز سُنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے

بیوی غریب تو آدھی موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تھا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں رشتے کا ایک چچا رہتا تھا، اُس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا: "ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا۔" بس پھر کیا تھا آگ بگولا ہو گیا: "میں اُس بدمعاش کو لینے جاؤں؟ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی مگر ایک دن اُس کو اتنا مارا کہ اُس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا، وہ اپنے بھائی کو بُلا کر اُس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسائے کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔"

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اُس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سُنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اُس کو یقین تھا کہ اُس کی بیوی اب کبھی نہیں آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی کوئی اور نظر نہ آیا تو اُس کی دُم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھا جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا؟ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اُٹھا تو دن چڑھ چکا تھا لیکن آج اُسے کھیت پر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر پیا اور حقّہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلا نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اُس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلا توڑ ڈالے پھر معلوم نہیں کیا سوچا، ایک گھڑونچی لا کر اُس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے ننھے پڑے چوں چوں کر رہے تھے اور اُن کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اُس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اُس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل چونچ سے اُس پر حملہ آور ہوئی: "اری آنکھ پھوڑے گی؟" اُس نے اپنا خوفناک قہقہہ مارا اور گھڑونچی سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلا سلامت رہا۔

اگلے دن سے اُس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب کوئی اُس سے بات نہ کرتا۔ وہ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقّہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اُڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اُس نے اُن دونوں کے نام اپنے بچّوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دُنیا میں اُس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے لیکن لوگوں کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدّت سے کبھی کسی نے اُسے اپنے بیلوں کو مارتے نہیں دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ اُن کی کمروں سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کبڈّی کھیلتے ہوئے ملے۔ اُسے دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا: "ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں۔" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے وہ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ابھی انھیں باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسبِ معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیے۔ "ارے او بندو! ارے او نورو!" پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلا تھا، وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اسی طرح آتا رہا تو گھونسلا تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ بند کر کے وہ اُترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اُس نے پروا نہ کی اور گیلے کپڑے نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا؟ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اُسے کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیل دار اور کئی کسان شام کو اُسے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا: "ارے بندو! ارے نورو! کہاں مر گئے؟ آج تمھیں کون کھانا دے گا؟" چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بیچارہ پاگل ہو گیا ہے۔" کالو ذیل دار نے سر ہلا کر کہا: "صبح شفا خانے والوں کو پتہ دے دیں گے کہ پاگل خانے بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح جب اُس کے پڑوسی شفا خانے والوں کو لے کر آئے اور اُس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اُس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔







ایک شکستہ آدمی کی کہانی

ایک ریٹائرڈ کرنل کی بساطِ زندگی

کیول سوری کی ایک داستان

بات پروفیسر کنور کی شادی سے چلی تھی۔ "میرے نزدیک عورت کی وفا یا بے وفائی کی کوئی اہمیت نہیں اگر وہ وفا کی پتلی بھی ہو تب بھی یہ حقیقت آج تک کوئی نہیں جھٹلا سکا کہ وہ مرد کی پرواز میں سب سے بڑی کوتاہی ہے۔" ریٹائرڈ کرنل عثمان نے اپنی کرسی آتش دان کے نزدیک کھسکاتے ہوئے گویا فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"اُس کے باوجود کرنل......" بیرسٹر رائے نے ایک شدید لیکن بامعنی مسکراہٹ کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے باوجود ہم یہ بوجھ نہایت فخر سے اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں لیکن اپنی کمزوریوں سے اس حد تک سمجھوتا کرنا کہاں کی دانائی ہے۔"

"کرنل صاحب! کیا آپ پوری ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے آج تک زندگی کے کسی بھی اسٹیج پر عورت کی ضرورت محسوس نہیں کی؟" سگار کی راکھ آتش دان میں جھاڑتے ہوئے وسے ساءڈ کیفے کے پروپرائٹر مسٹر سریندر کھنّا نے سوال کیا۔

"آپ کا سوال وضاحت طلب ہے کھنّا صاحب! میں نہیں جانتا کہ عورت کی ضرورت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ جہاں تک جنسی تقاضوں کا تعلّق ہے، یہ ایک فطری بات ہے لیکن جہاں تک ساتھی یا سہارے کا تعلّق ہے، میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے بیس برسوں سے مجھے کسی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مرد کی ذات بذاتِ خود اتنی مکمل ہے کہ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ــــ اپنے ذہن پر چھائے ہوئے گھٹیا قسم کے رومانی تصوّرات اگر آپ ایک لمحے کے لیے بھی جھٹک سکیں تو آپ کو میری بات کی سچائی کا احساس کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔" کرنل

عثمان کے لہجے سے ایک دبا دبا اندرونی جوش مترشح تھا۔

"پچھلے بیس برس؟ تو کیا اس سے پہلے؟" بیرسٹر رائے چونکے۔

"ہاں رائے! اس سے پہلے میں شادی شدہ تھا۔" یک بہ یک کرنل کا جوش بجھ سا گیا۔ اُن کی آواز جیسے بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی، جیسے انھوں نے یہ بات صرف اپنے آپ کو بتائی ہو۔

حاضرین کے لیے یہ انکشاف کچھ کم چونکا دینے والا نہیں تھا۔ مسٹر کھنا اور رائے کرنل عثمان کو اُس وقت سے جانتے تھے جب سے وہ اس شہر میں آکر آباد ہوا تھا اور اس بات کو قریب قریب بیس برس ہو چلے تھے۔ یوں تو کرنل کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا لیکن پروفیسر کنور اور یہ لوگ تو اُس سے بہت ہی قریب تھے۔ کرنل عثمان اُن سب کے لیے ایک پُرخلوص، زندہ دل، ہنسنے ہنسانے والا دوست تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد شہر سے باہر واقع اس سادہ لیکن خوب صورت سے بنگلے میں وہ نہایت پُرسکون زندگی گزار رہا تھا تاہم اُس کی زندگی کی یہ نہ ختم ہونے والی تنہائی کئی بار اُس کے دوستوں کے ذہن میں سوال بن کر اُبھری تھی لیکن یہ سوال جب بھی ہونٹوں پر آیا، کرنل نے ایک مخصوص قہقہے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ "جب تم لوگ بھی اس قسم کی بات کرتے ہو، مجھے شدت سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ مجھے بھی ایک عدد بیوی کی ضرورت ہے ورنہ تم لوگوں ہی میں کیا کمی ہے؟"

کرنل نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ یہ بات سب کے لیے راز ہی بنی رہی۔ کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ کرنل کی خوش گوار زندگی اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت تھی کہ اُسے واقعی کسی سہارے یا ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں تو اُس کے سبھی جاننے والے اُس سے متاثر تھے لیکن پروفیسر کنور کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا تھا کہ وہ کرنل عثمان کی امت آگے بڑھانے کے سلسلے میں سب سے ہونہار بھکشو ثابت ہوگا لیکن دو روز پہلے چالیس سالہ کنوارے پروفیسر نے دفعتہً اپنی شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا آج کی نشست میں اُس کی شادی موضوعِ گفتگو بن جانا کچھ ایسا غیر قدرتی نہ تھا لیکن کرنل عثمان کا یہ انکشاف کہ بیس برس پہلے وہ بھی شادی شدہ تھا، دونوں کے لیے باعثِ حیرت تھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں کرنل صاحب؟ تو پھر آپ نے اب تک"؟ رائے کو جیسے اپنی سماعت پر شبہ ہو رہا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں رائے!" کرنل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تو میرے نزدیک اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور پھر میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے بارے میں یہ رائے قائم کی جائے کہ میری زندگی میں اس تبدیلی کی ذمّے دار کسی عورت کی بے وفائی ہے کیونکہ پوری بات جاننے کے لیے عام رائے یہی ہوگی حالانکہ میں پوری ایمان داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دوسری شادی نہ کرنے کے فیصلے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں جتنے دنوں شادی شدہ رہا، اپنے آپ کو بہت کمزور پاتا رہا چونکہ مجھے اپنی کمزوریوں سے نفرت ہے، اس لیے اپنی بیوی سے نجات پانے کے بعد میں نے آیندہ زندگی تنہا ہی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"لیکن آپ کی بیوی؟"

"میں نے اُسے طلاق دے دی تھی۔" کرنل عثمان نے نہایت بے صبری سے کھنا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر تک ماحول پر ناخوش گوار سی خاموشی طاری رہی۔ "میری زندگی کے یہ واقعات ناخوش گوار سہی لیکن انھیں دہرانے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میرے نزدیک اب اِن واقعات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" گرم کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کرنل نے کہنا شروع کیا۔ بیرسٹر رائے اور مسٹر کھنا سراپا سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔

اُس زمانے میں میری عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال ہوگی۔ میں اپنی بے خوف فطرت اور فرض سے پیار کی وجہ سے میجر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ فرصت کے اوقات میں شکار میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ جب بھی کبھی شکار کا پروگرام بنتا، جمیل میرے ساتھ ہوتا۔ جمیل کے بارے میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ ہم دونوں ایک ہی یونٹ میں تھے۔ شکار کا شوق ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب لے آیا تھا۔ وہ خوب صورت ہونے کے علاوہ خوش مزاج بھی تھا اور مجھے یہ ماننے میں جھجک نہیں کہ اُن دنوں وہ میرا بہترین ساتھی تھا۔ ایک مرتبہ جب ہم دونوں دو ماہ کی چھٹی پر تھے، ہم نے نیفا کے علاقے میں کچھ وقت گزارنے کا پروگرام بنایا۔ اُس چھوٹے سے خوب صورت قصبے کا نام میں آپ کو نہیں بتاؤں گا جہاں ہم ٹھیرے تھے۔ پورا قصبہ ایک معمولی سے ہوٹل، چند دکانوں اور ایک مختصر سے بازار پر مشتمل تھا۔ آبادی سے تھوڑے ہی فاصلے پر گھنے، خطرناک جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ گولیوں سے بھری ہوئی بندوقیں کندھوں پر ڈالے ہم دونوں سارا سارا دن جنگلوں میں گھومتے رہتے۔ ہمارے ہوٹل کا مالک ایک معمر سا شریف آدمی تھا۔ وہ ہمیں ہر روز صبح جنگلوں میں زیادہ دُور نہ جانے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ اُس کے خیال میں جنگلی جانوروں سے زیادہ خطرناک وہاں کے قبائلی لوگ تھے جو موقع پاتے ہی پردیسیوں کو دبوچ لیا کرتے اور نقدی وغیرہ چھین کر یا تو انھیں مار پیٹ کر چھوڑ دیتے یا قتل کر دیتے۔ اُس کے بیان کے مطابق اَن گنت سیاح اُن لوگوں کا شکار بن چکے تھے۔ قانون کے لیے ان وارداتوں کا سراغ لگانا قریب قریب ناممکن تھا۔ اُس علاقے میں تو مقتول کی لاش مل جانا ہی ایک بڑا مسئلہ تھا لیکن ہم دونوں نے اُس کی پُرخلوص تنبیہ پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ فطرتاً ہم دونوں نڈر واقع ہوئے

سے تھے۔ خطروں سے کھیلنے میں ہم ایک ناقابلِ بیان خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ آپ کو طوالت میں نہ الجھاتے ہوئے میں اُس دن پر آتا ہوں جب پہلی بار میری اُس قبائلی لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ اُس روز جمیل کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے مجھے اکیلے ہی جانا پڑا تھا۔ حسبِ معمول سارا دن شکار کی تلاش میں گھومنے کے بعد جب میں غروبِ آفتاب کے وقت واپس لوٹ رہا تھا تو اچانک میری نظر اُس پر پڑی۔ ایک درخت کے تنے سے وہ تقریباً لپٹی ہوئی سی بے خودی کے عالم میں ڈوبتا ہوا سورج دیکھ رہی تھی۔ اُس کی محویت میں نہ جانے کیوں میں نے بڑی کشش محسوس کی۔ چند منٹ تک میں یوں ساکت رہا، جیسے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھ لینے کے جرم میں مجھے کسی نے پتھر کا بت بنا دیا ہو لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میرے جوتوں تلے روندے جانے والے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ چونکی۔ ایک عجیب قسم کی بے پروائی سے اُس نے میری طرف دیکھا۔ پھر باوقار انداز سے چلتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ سی گئی تھی۔"

اتنا کہہ کر وہ اس انداز سے رُکا، گویا اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"سگار کرنل!" مسٹر کھنّا نے جسٹر کے کالروں سے گردن ڈھانپتے ہوئے سگار بکس اُس کی طرف بڑھایا۔

سگار کا ایک لمبا کش کھینچ کر اُس نے کہنا شروع کیا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ میری زندگی میں پہلا جذباتی لمحہ تھا۔ پہلی بار مجھے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا جسے میں فولادی سمجھتا تھا۔ وہ چونکہ قصبے کی طرف جا رہی تھی، اس لیے میرا اُس کے پیچھے پیچھے چلنا بالکل قدرتی تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک ہم اسی طرح چلتے رہے۔ اس دوران میں اُس نے کئی بار میری طرف دیکھا۔ لیکن اُس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرے ہوٹل کے دروازے کے سامنے وہ ایک لمحے کے لیے رُکی اور پیچھے مڑ کر اُس نے اس انداز سے میری طرف دیکھا، گویا کہہ رہی ہو۔ میں جانتی ہوں تمہاری منزل آگئی ہے۔ میں تم سے ناواقف نہیں ہوں اور پھر فوراً تیز تیز چلتی ہوئی وہ اندھیروں میں گم ہو گئی۔"

"میں نے اُس کے رُکنے کا جو مفہوم لیا، اُسے بجا طور پر آپ میری خوش فہمی کہہ سکتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ ایک اتفاق ہی ہو لیکن میں نے ایسا ہی سمجھا اور اس کے لیے میرے پاس کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی جھجک نہیں کہ ایک روایتی عاشق کی طرح تمام رات اُس کا معصوم چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہا۔ کوشش کے باوجود بھی میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا میرے ہوٹل کے سامنے کچھ دیر کے لیے رُک جانا کیوں مجھ پر اس قدر اثر انداز ہوا ہے۔ وہ لڑکی کون تھی؟ میرا اُس سے کیا تعلق ہے؟ دفعتہً میرے دل میں اتنے نرم گوشے کیوں اُبھر آئے ہیں؟ میرے پاس ان سب باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگلے روز تقریباً اُسی وقت جب میں اور جمیل واپس آ رہے تھے تو ہم نے اُسے اُسی درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی غصّے کی ایک ہلکی سی لہر اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ بجلی کی سرعت سے وہ اٹھی اور تیز تیز چلتی ہوئی درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی۔ اگلے روز سہ پہر کے بعد اپنی یہ خواہش میں کوشش کے باوجود نہ دبا سکا کہ مجھے اُسی جگہ اکیلے جانا چاہیے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ حسبِ توقع وہ وہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھلکھلا اٹھی۔ اُس کی مترنم ہنسی میں بچوں کی سی معصومیت اور پاکیزگی تھی۔ "تم کب تک یہاں رہے گا؟" کسی تمہید کے بغیر اُس نے سوال کیا۔

"جب تک تم کہو گی۔" اُسے دیکھتے ہی نہ جانے کیوں میں رومانٹک ہو گیا لیکن خلافِ توقع میرے جواب سے اُس کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔

"تم جھوٹ بولتا ہے، سب اپنی مرضی کرتا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں اس کی تردید نہیں کروں گا، بہت ممکن ہے میرا عمل میری بات جھوٹ ثابت کر دے۔" میں جانتا تھا کہ میری بات اُس کی سمجھ میں مشکل ہی سے آئے گی۔ "اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا نام راشی ہے اور وہ مجھے اُسی دن سے جانتی ہے جب میں یہاں آیا تھا اور یہ بھی کہ میں اُسے اچھا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی حالانکہ اُس نے آج تک کسی پردیسی سے بات نہیں کی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جلد ہی مجھے واپس لوٹ جانا ہے اور میرا کوئی وعدہ، کوئی قسم مجھے نہیں روک سکتی —— اس کے باوجود وہ میری قربت چاہتی تھی، جتنی دیر کے لیے بھی ہو سکے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اُس سے کوئی وعدہ کروں کیونکہ وہ کسی وجہ کے بغیر مجھے اچھا آدمی سمجھتی تھی اور بقول اُس کے اچھے آدمیوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔"

اُس دن کے بعد میرا زیادہ تر وقت اُسی کے ساتھ گزرنے لگا۔ میں نہایت شدت سے اُس کی طرف بھاگ رہا تھا، اپنے آس پاس پھیلے ہوئے خطروں سے بے خبر۔ اُس سے ہر ملاقات میرے جنون میں اضافہ کرتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے اس جاہل قبیلے، ان خطرناک ذہنیت کے لوگوں سے اُسے کوئی علاقہ نہ ہو۔ جیسے اس گندے ماحول میں وہ محض اس لیے وقت گزار رہی ہو کہ ایک روز مجھے وہاں آنا ہے۔ اُس کی منگنی اپنے قبیلے کے شانی نامی ایک نوجوان سے ہو چکی تھی۔ شانی میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اِس وقت تک وہ اَن گنت لوگوں کو قتل کر چکا تھا لیکن وہ اُس سے نفرت کرتی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے اپنے قبیلے کا کوئی بھی آدمی پسند نہیں ہے۔ وہ حیران تھی کہ ان لوگوں سے اُسے اتنی نفرت کیوں ہے جن کے ساتھ اُسے پوری زندگی گزارنی ہے۔ آپ

پلازہ اور دیگر سینماؤں میں شاندار نمائش جاری ہے



Talaash

رنگین

تلاش

COLOR

موسیقی: نثار بزمی فلمساز: مرزا اسحاق، پرویز ملک

جاری کردہ: دوسانی فلم کارپوریشن، کراچی فون: ۷۳۵۶۵

ایک منحنی آدمی کے پڑوس میں ایک لحیم شحیم لٹھ مار شخص رہتا تھا۔ لڑائی جھگڑے کرنا اُس کا معمول تھا۔ منحنی آدمی اُس سے ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا۔ ایک روز اُس کی دُکان میں سانپ نکل آیا۔ منحنی آدمی کے لڑکے نے اُسے مارنے کے لیے فوراً اپنی بندوق نکال لی۔ اتفاق سے لحیم شحیم شخص دکان کے سامنے سے گزرا۔ منحنی آدمی نے اُسے دیکھا تو اپنے لڑکے سے بندوق لے کر چھُپا دی اور لحیم شحیم شخص کو آواز دے کر کہا۔ "جناب! جناب! میری دُکان میں سانپ آگیا ہے۔ اس موذی سے بچائیے۔"

لحیم شحیم شخص نے لٹھ سنبھالا اور دُکان میں جا کے سانپ کو مار دیا پھر واپس چلا گیا۔ منحنی آدمی کے لڑکے نے کہا۔ "ابا جان! سانپ تو میں بھی مار سکتا تھا، پھر آپ نے اُن کا احسان کیوں لیا؟"

باپ نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا! ذرا سوچو! یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ سانپ تمہاری بندوق سے بچ کے اُلٹا تم پر حملہ کر دیتا۔ لٹھ مار پڑوسی اور سانپ دونوں ہمارے دشمن ہیں اس لیے میں نے دونوں موذیوں کو آپس میں لڑا دیا۔ اس طرح سانپ مر گیا اور ہمارا ایک دشمن ختم ہو گیا۔ فرض کرو کہ پڑوسی اگر سانپ کو نہ مار پاتا بلکہ سانپ اُسے ڈس لیتا تب بھی ہمارا ایک دشمن ختم ہو جاتا۔"



لوگ سمجھتے ہوں گے کہ وہ مجھے بیوقوف بنا رہی تھی لیکن ایسا نہیں ہے اُس سے ملنے کے بعد شاید ہی کوئی شخص اُس کی معصومیت پر شبہ کر سکتا۔ اس سلسلے میں مجھ پر وقتی جذباتیت کا الزام غلط ہوگا۔ یہ بات میں آج بھی مانتا ہوں کہ اُس کے ساتھ گزارے ہوئے چند دن میری زندگی کی بہترین یادگار ہیں۔ زندگی ایک ایسے میٹھے سپنے کی طرح گزر رہی تھی جو ہم رات کے آخری پہر میں دیکھتے ہیں اور جو بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے.... اور سپنا بھی جلد ہی ٹوٹ گیا۔ وہ منحوس چاندنی رات مجھے آج بھی یاد ہے۔ جب وہ جنگلی لڑکی میرے سینے پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اُس کے منگیتر کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا تھا اور وہ میری تلاش میں تھا۔

"وہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ تم کل صبح ہی یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ بضد تھی لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مشین گنوں سے کھیلنے والے ایک نوجوان نڈر ملٹری افسر کے نزدیک ایک دُبلی پتلی نازک سی لڑکی کے خدشات کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن میری کوئی بھی بات اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے آثار کم نہ کر سکی اور پھر وہ ہوا جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جس کے لیے میں قطعاً تیار نہیں تھا۔ اپنے گرد و پیش سے یکسر بے خبر میں اُس کی ذات میں مکمل طور پر کھو چکا تھا کہ اچانک اُس کے منہ سے نکلی ہوئی خوف کی ایک تیز چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک نہایت ہی مکروہ شکل کا لیکن لمبا چوڑا صحت مند نوجوان کھڑا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہی راشی کا منگیتر ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر خوں خوار درندے کی طرح اُس پر جھپٹا اور اُسے نہایت بے رحمی سے گھسیٹتا ہوا چند گز تک لے گیا اور پھر چاند کی مدھم روشنی میں اُس کا ظالم ہاتھ ہوا میں لہرایا اور دوسرے ہی لمحے زہر میں بجھے ہوئے کسی مہلک ہتھیار نے قدرت کے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی اُس جیتی جاگتی گڑیا کو سرد لاش بنا دیا۔ میں اپنی عزیز ترین چیزوں کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں اُس کے ارادوں سے قطعاً بے خبر تھا اور پھر یہ سب اتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر ہوا کہ میں دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُس وقت میرے حواس نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اُس سے فارغ ہو کر ایک خوف ناک فاتحانہ قہقہے کے ساتھ میری طرف بڑھا اور پھر نہ جانے کیسے میرے کوٹ کی جیب میں پڑا ہوا آٹومیٹک ریوالور میرے ہاتھ میں آگیا۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد اُس کے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا آج بھی افسوس ہے کہ یہ قتل میرے ہاتھوں سے کچھ منٹ پہلے کیوں نہیں ہوا۔"

کرنل کے لہجے کی افسردگی اُس کی اس بات کی تائید کر رہی تھی۔ سگار کا ایک آخری اور طویل کش کھینچ کر اُسے دہکتے ہوئے آتش دان میں پھینکتے ہوئے کرنل نے کہنا شروع کیا۔ "اگلے روز صبح ہی ہوٹل کا منیجر میرے پاس آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ثنانی کے بڑے بھائی کو رات اس واردات کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ صبح ہی سے ہوٹل کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے۔ منیجر ایک مدت سے اُس قصبے میں اُن لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ اپنے تجربے کی بنا پر اُس نے مجھے پُرزور مشورہ دیا کہ میں فوراً وہاں سے چلا جاؤں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں منیجر کی اطلاع پر غصے سے کانپنے لگا تھا۔ میں ہر اُس آدمی سے آمادۂ پیکار تھا جو اس سلسلے میں میرے سامنے آتا لیکن منیجر کی ضد کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ بقول اُس کے وہ مجھے اس طرح موت کے منہ میں جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا اور پھر پورے قبیلے کے ساتھ دشمنی مول لینا کہاں کی دانش مندی تھی۔"

"ہوٹل سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک ثنانی کا بھائی ہمارا تعاقب کرتا رہا لیکن میرے اور جمیل کے کندھوں پر سجی ہوئی بندوقیں اُسے دور رکھنے کے لیے کافی تھیں۔ گاڑی کے اسٹیشن چھوڑنے تک وہ پلیٹ فارم پر کھڑا اپنی تیز شعلہ بار عقابی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔"

"لوٹنے کے بعد ایک مدت تک یہ واقعات میرے ذہن پر بوجھ بنے رہے خصوصاً یہ احساس میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا کہ راشی کو میرے سامنے قتل کیا گیا اور میں اُسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا لیکن آپ جانتے ہیں کہ دُنیا کے ہر غم کی ایک عمر ہوا کرتی ہے اور پھر یہ نقوش مٹانے میں میری حد سے زیادہ مصروف زندگی نے بڑی مدد کی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ تقریباً ڈیڑھ دو برس تک میں ثنانی کے بھائی کے بارے میں بہت محتاط رہا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے تلاش کرتے کرتے وہ یقیناً مجھ تک پہنچ جائے گا لیکن آہستہ آہستہ اُس کا چہرہ بھی ماضی کے دُھندلکوں میں گم ہوتا گیا اور پھر جب تین برس میں میری تنہاز

سے شادی ہوئی تو میں یہ واقعات قریب قریب بھول چکا تھا۔"

"شہناز میری والدہ کا انتخاب تھی۔ ہندوستان کی ہر ماں کی طرح اُسے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ ایک مدت سے میں اُسے ٹالتا آرہا تھا لیکن وہ یہ رشتہ چھوڑنے کے لیے تو کسی طرح تیار نہ تھی۔ شہناز خوب صورت ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ اور موڈرن بھی تھی۔ اُس کے والد ایک کامیاب تجارتی فرم کے مالک تھے اور یہ سب ہونے پر بھی میرے انکار کی کوئی وجہ اُن کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔"

"شادی کے چند ہی روز بعد میں اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ میں اپنی زندگی کی پونجی غلط داؤ پر لگا چکا ہوں۔ ہر عورت میں معصومیت اور سادگی تلاش کرنے والا عثمان شہناز جیسی لڑکی کے لیے قطعاً ناموزوں تھا۔ وہ بہت تیز دوڑنے کی عادی تھی۔ زندگی بھڑک کر گُل ہونے کا نام ہے۔ رینگنے کا نہیں، وہ کہا کرتی تھی۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ شہناز سب کچھ بن سکتی ہے، بیوی نہیں۔ اُس کی نت نئی دلچسپیاں میرے لیے بہت تکلیف دہ تھیں لیکن میں سختی سے کام نہیں لے سکتا تھا کیونکہ میں اُس کی آزاد بلکہ گستاخ طبیعت سے واقف ہو چکا تھا۔ چونکہ میں اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں کہانیاں جنم دینا نہیں چاہتا تھا، میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اپنی شادی شدہ زندگی میں نام نہاد سکون قائم رکھنے کے لیے مجھے کتنے ضبط سے کام لینا پڑا، اس کا اندازہ آپ شاید ہی کر سکیں اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اُن دنوں اپنے آپ کو بہت کمزور پاتا تھا۔ بہرحال ایک دوسرے سے کسی ذہنی یا جذباتی لگاؤ کے بغیر ہم میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ میری شادی کے دو برس بعد پونا میں زبردست ہیضہ پھیلا اور میری بوڑھی ماں جو اُن دنوں اپنے انتخاب پر دن رات کڑھتی رہتی تھی، موت کے لیے شاید کسی بہانے کی منتظر تھی۔ ماں کی موت کے بعد میرا پونا سے بالکل جی اچاٹ ہو گیا۔ میں کافی دوڑ دھوپ کے بعد اپنا تبادلہ دلّی کرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ دلّی پہنچ کر مجھے بدترین حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ جمیل اُن دنوں دلّی میں تھا۔ میرا اور شہناز کا درمیانی خلا اور وسیع کرنے میں اُس کی دلچسپ ذات نے بڑی مدد کی۔ شہناز کو ہمیشہ ایک ایسے ساتھی کی ضرورت رہی جو اُس کی شامیں رنگین بنا سکے۔ زندگی کی کوئی شام بے کیف طور پر گزارنا اُس کے نزدیک خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ دلّی میں اُس کی نظرِ انتخاب جمیل پر پڑی۔ انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور پھر اُن دونوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی تو نہیں تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں نے شہناز کی دلچسپیوں میں مخل ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میرے ذہن نے اُسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی بیوی کی حیثیت میں قبول نہیں کیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ اُن تمام کلبوں کی ممبر بن گئی جن میں جمیل جایا کرتا تھا۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے



- ایک صحیح فن کار اپنی بیوی کو فاقہ کشی کے لیے چھوڑ سکتا ہے، بچّوں کو برہنہ پا رہنے دے سکتا ہے، اپنی ستّر سالہ ماں کو محنت مشقّت کرنے دے سکتا ہے لیکن اپنے فن کی راہ سے کسی صورت میں بھی نہیں ہٹ سکتا۔
- سب سے بڑا ظلم یہ نہیں کہ ہم انسانوں سے نفرت کریں بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ ہم اُن سے بے اعتنائی برتیں، یہ حیوانیت ہے۔
- منطقی آدمی خود کو دُنیا کے مُطابق ڈھال لیتا ہے مگر غیر منطقی دُنیا کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے پر اصرار کرتا ہے۔ دُنیا کی ہر ترقّی ایسے ہی غیر منطقی شخص کی بدولت ہوتی ہے۔
- جو کر سکتا ہے، وہ کر گزرتا ہے۔ جو نہیں کر سکتا، وہ درس دیتا رہتا ہے۔
- زندگی میں دو المیّے ہوتے ہیں۔ پہلا دل کی آرزو نہ پانا اور دُوسرا پا لینا۔
- یہ عورت کا کام ہے کہ جلد از جلد شادی کرے اور یہ مرد کا کام ہے کہ شادی سے ممکن حد تک بچتا رہے۔
- گھر: لڑکی کے لیے قید خانہ، عورت کے لیے کارخانہ۔



اور ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود اُن دنوں میں اور شہناز کبھی کبھار کھانے کی میز پر اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک باہر رہتی اور پھر رات کے کسی پہر میں جمیل کی کار ہماری کوٹھی کے سامنے رکتی۔ نہایت مستعدی سے وہ کار کا دروازہ کھولتا اور اپنی بانہیں اُس کی کمر کے گرد لپیٹے ہوئے اُسے باہر آنے میں مدد دیتا۔ آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے بارے میں اس قسم کی باتیں کیسے بتا رہا ہوں لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ان سب باتوں سے بہت بلند ہوں۔ میرے نزدیک ان واقعات کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کئی بار میرے سامنے ہی ہوا لیکن داد دیجیے میری ہمّت کی کہ اس کے باوجود میں نہ صرف خاموش تھا بلکہ جمیل سے میرے تعلقات خوش گوار تھے۔ میرا رویّہ دونوں کے لیے خصوصاً شہناز کے لیے کافی حیران کُن تھا۔ کئی بار باتیں کرتے کرتے اچانک جمیل کا ذکر آجانے سے وہ خوف زدہ سی ہو جاتی۔ ایسے میں اُس کا مجرم ضمیر اُسے ایک لمحے کے لیے عجیب بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتا لیکن میرا کسی قسم کے تاثر سے خالی چہرہ اُسے وقتی طور پر مطمئن کر دیتا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اُن دنوں ایک سوال کئی بار میرے ذہن میں آیا کہ جمیل اور شہناز جنون کی حد تک ایک دوسرے کو چاہنے کے باوجود شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ جمیل غیر شادی شدہ تھا اور شہناز بآسانی مجھ سے طلاق حاصل کر سکتی تھی۔ آخر شہناز طلاق کی تجویز لے کر میرے پاس کیوں نہیں آئی؟ اُس کے راستے میں کون سی طاقت حائل تھی؟ جہاں تک اخلاقی قدروں کا تعلق ہے، میں جانتا تھا، اُس کے نزدیک اُن کی اہمیت نہیں۔ تو پھر؟ اور اس سوال کا جواب ملنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔"

"ایک اتوار کی صبح جمیل نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کسی ذاتی کام سے باہر جا رہا ہے، ایک ہفتے بعد اس کام سے فارغ ہو کر اُس کا ارادہ ڈلہوزی جانے کا تھا۔ اُس کا اصرار تھا کہ شہناز کو لے کر میں بھی وہاں آ ؤں۔ نومبر کے آغاز میں کسی پہاڑ پر جانے کا دفعتہً پروگرام مجھے چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ خصوصاً جب کہ برف باری کے موسم میں بھی کچھ دیر ہو۔ اس پروگرام کی تہہ میں یقیناً کوئی فیصلہ کن بات تھی اور اسی لیے میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ جمیل اُسی روز دلّی سے چلا گیا اور اُس کی روانگی سے ٹھیک ایک ہفتے بعد حسبِ وعدہ ہم بھی ڈلہوزی کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پہلے چونکہ میں نے اُسے اُس کے بتائے ہوئے پتے پر تار دے دیا تھا، وہ مقررہ وقت پر ہمیں لینے کے لیے بس اسٹاپ پر آ گیا۔ وہاں کے سب سے اچھے ہوٹل کی اُوپری منزل پر اُس نے ساتھ کے دو کمرے مخصوص کروا لیے تھے۔ حسبِ توقع اُن دنوں ڈلہوزی مکمل طور پر سنسان تھا۔ اُس ہوٹل میں جہاں ہم ٹھیرے تھے، ہمارے علاوہ صرف تین چار جوڑے اور تھے اور وہ بھی شادی شدہ جو غالباً ہنی مون کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ فطرتاً میں چونکہ تنہائی پسند واقع ہوا ہوں، وہاں کا پُرسکون ماحول واقعی میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ فطرت کی آغوش میں پہنچ کر انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی تلخیوں سے کس قدر بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا احساس مجھے انھی دنوں ہوا۔ تقریباً ایک ہفتہ پُرسکون طور پر گزر گیا اور اس قلیل سی مدت میں وہ لاتعداد خدشات جو روانگی کے وقت میرے ذہن پر حاوی تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی دھند میں گم ہو گئے۔ جمیل اور شہناز اُن دنوں مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھے۔ وہ میرا ہر طرح خیال رکھتے لیکن ذہنی سکون کا یہ وقفہ کچھ زیادہ لمبا ثابت نہیں ہوا اور میری زندگی کی وہ دوسری منحوس یادگار رات اپنی تمام تر تاریکیوں کے ساتھ آ پہنچی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ نومبر کی بارہ تاریخ تھی۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ جمیل ابھی تک شام کی سیر سے نہیں لوٹا تھا۔ میں اپنے کمرے کی اُس کھڑکی پر کھڑا جو ہوٹل کی پشت پر کھلتی تھی، اُس کا ڈنر کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ اُس شام زندگی میں پہلی بار نہ جانے کیوں میں نہایت سنجیدگی سے اپنے اور شہناز کے تعلقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ شہناز جمیل کو بے حد چاہتی ہے، میں سوچ رہا تھا کہ اگلی صبح خود اُس سے طلاق کے امکانات پر بات کروں کیونکہ اگر کسی وجہ سے ہم دونوں میں ذہنی رابطہ نہیں ہو سکتا تو ہمارا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ اگر وہ کسی کو چاہتی ہے تو مجھے اُس کے راستے میں آنے کا کوئی حق نہیں۔ نہ جانے کب تک میں انھی خیالات میں اُلجھا رہتا کہ رات کی تاریکی میں نیچے سڑک پر کھڑے ہوئے کسی آدمی کے ہاتھ میں سلگتے ہوئے سگریٹ نے مجھے گویا بیدار کر دیا۔ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ وہ ہاتھ جس میں سگریٹ سلگ رہی تھی میرے کمرے کی اسی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ غیرارادی طور پر میں بجلی کے سوئچ کی طرف بڑھا لیکن فوراً ہی کسی خیال سے میں نے لائٹ جلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے اس کھڑکی کے پاس کھڑا میں اپنے خیالات میں منہمک تھا۔ شہناز اپنی ایک نئی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی جو نیچے کی منزل کے کسی کمرے میں قیام پزیر تھی اور میں اپنے خیالوں کی دُنیا میں اس قدر کھو گیا تھا کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی مجھے بجلی کا سوئچ آن کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ آخر وہ کون لوگ تھے جو ہوٹل کی پشت پر اس قدر تاریکی اور منجمد کر دینے والی سردی کے باوجود کھڑے تھے اور پھر میرے کمرے کی کھڑکی اُن کے لیے کیوں باعثِ کشش تھی، کافی دیر تک اُن کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ دو تھے لیکن وہ کون تھے اور اس ویرانے میں انھیں کیا کام تھا جبکہ دن کو بھی کسی کا گزر مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ یہ سب سوال اتنی سُرعت سے یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں آئے کہ جوش کی ایک تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نہیں جانتا کہ حالات کیا ہوتے، اگر اُن میں سے ایک دیا سلائی جلا کر اپنا سگریٹ سُلگانے کی بدترین غلطی نہ کرتا۔ دیا سلائی کی مدھم روشنی میں بھی وہ تیز عقابی آنکھیں پہچان لینا جو ایک عرصے تک میرے ذہن میں مرتسم رہیں، کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سگریٹ سُلگانے والا شخص اُس قبائلی لڑکی کے منگیتر شانی کا بڑا بھائی ہی تھا۔ اُسے دیکھ لینے کے بعد اُس کے دوسرے ساتھی کو پہچان لینا اور بھی آسان ہو گیا۔ وہ جمیل کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ اُس کا وہ ذاتی کام اب میری سمجھ میں آ گیا جس کے لیے وہ ایک ہفتے پہلے ہی دلّی روانہ ہو گیا تھا۔"

"جمیل؟ اُسے آپ کی موت میں کیا دلچسپی تھی خصوصاً جب کہ وہ آسانی سے شہناز کو حاصل کر سکتا تھا؟" بیرسٹر رائے نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"اپنے پیشے کے اعتبار سے آپ کا سوال نہایت مناسب ہے بیرسٹر صاحب!" کرنل عثمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "قانون داں ہمیشہ قتل سے زیادہ وجہ قتل میں دلچسپی لیتا ہے۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ جمیل کو میری موت میں کیا دلچسپی تھی کیونکہ آپ کی دلیل کافی صحیح ہے کہ وہ شہناز کو باآسانی مجھ سے طلاق حاصل کرنے کے لیے اُکسا سکتا تھا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں میرے والد کی چھوڑی ہوئی خاطر خواہ جائداد اور میرا ذاتی بینک بیلنس اُن کے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ شہناز کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب جہیز کے بھی خواہاں تھے۔" کھنّا نے چٹکی لی۔

کمرے کی سہمی سہمی سی فضا ایک لمحے کے لیے قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

"جمیل کے ارادے جان لینے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے میں غصّے سے پاگل ہو اُٹھا لیکن میرے سرد مزاج نے فوراً ہی مجھے متوازن کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب جمیل مجھے ڈنر کے لیے بُلانے آیا تو حسبِ توقع وہ کافی اُکھڑا اُکھڑا سا نظر آ رہا تھا لیکن میں نے اُس کے بدلے ہوئے موڈ سے قطعاً بے توجہی برتی۔ وہ رات میر

لیے کس قدر خطرناک تھی۔ اِس کا اندازہ آپ بآسانی کر سکتے ہیں۔ ثانی کے بھائی کو رات میں کسی وقت اس کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آنا تھا۔ میرے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ مجھے کس طرح حالات کا سامنا کرنا ہے۔ میں کھانے کی میز پہ اور اس کے بعد کافی کی مختصر سی نشست میں اُن لوگوں کے ساتھ حسبِ معمول گپیں ہانکتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ذہنی غیر حاضری سے وہ لوگ محتاط ہو جائیں اس کے باوجود میرا ذہن آنے والے حالات کے لیے لائحہ عمل بنا تا رہا۔ میرے حواس نے میرا ساتھ دیا اور رات کے دس بجے تک ہونے والے ڈرامے میں میں نے اپنا رول متعین کر لیا۔"

وہ رات میرے حالات سے زیادہ بھیانک اور تاریک تھی۔ میں اپنے بستر میں لیٹا ہوا نہایت بے صبری سے آنے والے واقعات کا انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ والے بستر پہ شہناز بظاہر بے خبر سو رہی تھی۔ میری نگاہیں کھڑکی پہ جمی ہوئی تھیں۔ ہر گزرنے والا لمحہ میری دھڑکنوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ اُس وقت تقریباً بارہ بجے ہوں گے جب شہناز کے اُٹھنے سے پیدا ہونے والی ہلکی سی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ تکیے کے نیچے پڑے ہوئے ریوالور تک پہنچ گیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ بے حس و حرکت اپنے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ وہ شاید اس بات کا اطمینان کر رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں۔ مکمل تاریکی کی وجہ سے وہ میری کھلی ہوئی آنکھیں دیکھنے سے معذور تھی اور پھر میرے مصنوعی خراٹوں نے فوراً ہی اُسے اطمینان دلا دیا کہ میں بے خبر سو رہا ہوں۔ وہ پلنگ سے اُتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی تک گئی اور اُس کی چڑھی ہوئی چٹخنی اُتار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا دل ہی بہتر جانتا ہے کہ میں یہ سب کچھ کس طرح برداشت کر رہا تھا۔ دو گھنٹے تک ماحول پر قبرستان کا سا سناٹا طاری رہا۔ اُس وقت میری کلائی پہ بندھی ہوئی ریڈیم واچ میں دو بجے تھے جب میں نے جمیل کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی نہایت مدھم سی آواز سنی۔ میں سانس روکے ہوئے تقریباً رینگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ پردہ ذرا سا سرکا کر میں نے باہر دیکھا۔ جمیل اور شہناز آواز کیے بغیر دروازے سے نکل کے اُوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ ایک مرتبہ پھر اور بالکل غیر ارادی طور پہ میرا ہاتھ سلیپنگ گاؤن کی جیب میں چلا گیا۔ گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور مجھے مطمئن کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں اپنے پلنگ پر پڑا ہوا لحاف تکیے تک پھیلا کر کھڑکی کے پاس والے کونے سے چپک گیا۔ میرے مہمان کی آمد میں اب غالباً کچھ زیادہ دیر نہیں تھی۔ میرا قیافہ ایسا غلط بھی ثابت نہیں ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کھڑکی سے باہر ہانپنے کی آواز نے مجھے ثانی کے بھائی کی آمد کی اطلاع دے دی۔ اُسے جس رسّے کی مدد سے کھڑکی تک پہنچنا تھا، اُسے چھت پہ باندھنا غالباً جمیل اور شہناز کا کام تھا اسی لیے وہ کچھ دیر پہلے چھت پہ چلے گئے تھے۔ اُس نے نہایت آہستگی سے کھڑکی کھول کر تاریک کمرے کا جائزہ لینے کی بے سود کوشش کی پھر کچھ لمحوں کے توقف کے بعد ذرا سا جھک کر کمرے میں کود گیا۔ میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اُس پہ جھپٹا اور اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہوتا میری مضبوط اُنگلیاں اُس کی گردن میں پیوست ہو گئیں۔ حملہ اس قدر فوری اور غیر متوقع تھا کہ اُس کے منہ سے کسی قسم کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ تقریباً ایک آدھ منٹ ہی کی گرفت نے اُسے مکمل طور پہ بے ہوش کر دیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا اور اس کا مجھے مکمل احساس تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد اُسے ہوش میں آنے کے لیے کم سے کم آدھ گھنٹہ درکار ہوگا، میں نے اُسے اُٹھایا اور جمیل کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے آپ کو شاید یہ نہیں بتایا کہ جمیل کے کمرے کی ساخت اور آرائش ہو بہو میرے کمرے جیسی تھی۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس والے کونے میں اُسے دیوار کے سہارے بٹھا کر میں واپس آ گیا۔ جمیل اور شہناز ابھی چھت ہی پہ تھے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اس قدر صفائی سے ہوا کہ میں اپنے آپ کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازے کا پردہ ذرا سا سرکا کر میں نے اپنی نگاہیں باہر گاڑ دیں۔ تقریباً چار منٹ بعد شہناز اور جمیل واپس آ گئے اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ پندرہ منٹ تک مکمل سکون رہا۔ اب اُوپر جانے کی میری باری تھی۔ میرا کام نہایت آسان تھا۔ مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ رسّے کا اُوپری سرا اپنی جگہ سے اُتار کر چند گز کے فاصلے پہ باندھ دوں تاکہ وہ میرے کمرے کی کھڑکی کے بجائے جمیل کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے آ جائے۔ ایسا کرنے میں مجھے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ میں واپس پہنچ کر اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر لینے کے بعد اطمینان سے اپنے گرم بستر پہ دراز ہو گیا۔ میری نظریں گھڑی کے ریڈیم سے چمکتے ہوئے حروف پر لگی ہوئی تھیں۔"

"ٹھیک تین بج کر بیس منٹ پہ جمیل کے کمرے سے اُبھرتی ہوئی ایک دل دوز چیخ نے ہوٹل کی خوابیدہ فضا بیدار کر دی۔ ہوش میں آنے کے بعد ثانی کے بھائی کا سامنے پلنگ پر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف جھپٹنا اور اپنا زہر میں بجھا ہوا مہلک خنجر جمیل کے سینے میں اُتار دینا میرے لیے کچھ غیر متوقع نہیں تھا۔ جمیل کے اچانک قتل سے ساتھ والے پلنگ پر لیٹی ہوئی شہناز کا خوف زدہ ہو کر چلّانا قدرتی بات تھی۔ شہناز کے شور سے نروس ہو کر وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور رسّا پکڑ کر باہر کود گیا لیکن اُس کا نیچے تک بحفاظت پہنچ جانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور جمیل کی چیخ کے چند ہی لمحوں بعد ہوٹل کی مختصر سی آبادی نے ایک اور دم توڑتے ہوئے انسان کی چیخ سنی۔ جمیل چونکہ اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، ثانی کے بھائی کو میری کھڑکی تک پہنچا دینے کے بعد اُس نے رسّا ایک جگہ سے اس حد تک کاٹ دیا تھا کہ وہ کسی آدمی کا بوجھ نہ برداشت کر سکے۔" اتنا کہہ کے کرنل خاموش ہو گیا۔

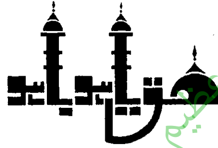
"شہناز کا کیا بنا؟" رائے نے سوال کیا۔

"اُسے طلاق دینے کے لیے یہی کافی تھا کہ واردات کی رات وہ جمیل کے کمرے میں تھی۔"

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

مناقبِ سلطانی	مخزنِ فیض	عقلِ بیدار	عین الفقر
سلطان حامد قادری	محمد الدین	سلطان باہو	سلطان باہو

* ابو المنصور سرمدی



مغل فرماں روا شاہ جہاں کے عہد کا ذکر ہے۔ گیارھویں صدی ہجری میں بازید محمد نامی ایک سرکاری عہدے دار اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوا اور کوہستان اعوان کی چوٹیوں میں کہیں روپوش ہو گیا وہ شاہی سپاہ کا ایک آزمودہ کار، معتبر اور جرأت مند سردار تھا اس لیے اُس کی روپوشی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ دلّی دربار کو فی الفور یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ "سردار بازید محمد حیرت انگیز طور پر اچانک مفقود الخبر ہو گئے ہیں۔" دربار میں جیسے ہی یہ اطلاع پہنچی، شاہی فرمان جاری ہو گیا کہ "بازید کے مفرور یا گم شدہ ہونے کا اعلان اُس کے حلیے سمیت ملک کے طول و عرض میں چپّے چپّے پر عام کر دیا جائے اور اُسے تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جائے۔"

شاہی فرمان کی تعمیل میں بے شمار تیز رفتار گھوڑے حرکت میں آ گئے۔ سرکاری کارندے مستعدی اور سرگرمی سے دور دور کی مسافتیں سر کرنے لگے۔ ہندوستان کی مختلف سمتیں اور مختلف جہات بیک وقت ٹاپوں کے شور سے گونجنے لگیں اور زمین سے گرد و غبار کے مرغولے اٹھ اٹھ کر آسمانوں کی جانب پرواز کرنے لگے۔ راستوں میں نظر آنے والا ہر مسافر گم شدہ سردار بازید کے حلیے کی کسوٹی پر کسا جانے لگا۔ اُس کا حلیہ ہر شہر کے دروازے کی چوکی میں موجود تھا۔

تمام ممکنہ مقامات چھانے گئے۔ آخر ملتان کے نواح میں ڈھونڈنے والے دستے نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ شخص گرد و پیش سے بے نیاز دریا کے کنارے اپنے آپ میں گم بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں لیکن زبان کھلی ہوئی تھی اور "اللہ ہُو اللہ ہُو" کی ولولہ انگیز صداؤں سے دریا کا پانی لہر لہر جھوم رہا تھا۔ سرکاری اہل کاروں نے کود کود کے گھوڑوں کی زینیں خالی کر دیں۔ گم شدہ سردار کا حلیہ انھیں ازبر تھا۔ انھوں نے ہر رُخ سے اُس شخص کا جائزہ لیا۔ اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور مسرت کی سُرخی نے اُن کے چہروں سے تھکن کی پیلاہٹ زائل کر دی۔ انھوں نے اطمینان سے گہری سانسیں لیں اور ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں تبادلۂ خیال کیا پھر یہ انتظار کرنے لگے کہ وہ شخص اپنا ذکر ختم کر کے اُن کی طرف متوجّہ ہو۔

انھیں بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر جب اُس شخص نے اپنی زبان بند کر کے آنکھیں کھولیں اور چہرے پر ہاتھ مل کے اِدھر اُدھر دیکھا تو اپنے ارد گرد کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اس طرح استعجاب سے دیکھنے لگا جیسے انھیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک معمّر سپاہی نے آگے بڑھ کے ادب سے دریافت کیا۔ "اگر ہمارا قیاس درست ہے تو سردار بازید محمد ہمارے سامنے ہیں؟"
وہ شخص چند لمحوں تک پلکیں جھپکاتا رہا۔ پھر یک بارگی اُس کے

لبوں پر تبسّم ابھرا۔ اُس نے نرمی سے کہا "سپاہی! ہاں بازید محمدؐ ہمارا نام ہے مگر ہم سردار بازید محمدؐ نہیں ہیں، فقیر بازید محمدؐ ہیں۔ تم سردار کی تلاش میں فقیر کی جانب کیسے نکل آئے؟"

سپاہی نے کہا "محترم بزرگ! آپ کی بزرگی اور آپ کے فقر میں کلام نہیں لیکن ہمیں جو حلیہ بتایا گیا ہے، اُس کی رُو سے میں اصرار کروں گا کہ سردار بازید محمدؐ آپ ہی ہیں"۔ بازید خاموش رہے۔ سپاہی نے کہا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ آپ دلّی کی سلطنت کے منصب دار ہیں؟"

"ہاں غلط ہے"، بازید نے متانت سے جواب دیا "ہم دلّی کی سلطنت کے منصب دار ہیں نہیں بلکہ تھے۔ اب ہم نے اُس منصب اور ساری امارت و حشمت سے کنارہ کر لیا ہے۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ ہم نے اپنے سب ہتھیار اُتار دیے ہیں اور اپنا گھوڑا آزاد کر دیا ہے۔ تم نے آنے میں دیر کر دی، اب بھلا وہ بازید کہاں جس کی تلاش میں تم نکلے ہو"۔

"آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر"، سپاہی نے کہا "لیکن گزارش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور اپنا یہ عذر ملتان کے ناظم کے سامنے بیان کر دیجیے۔ آپ کو ناظم کی خدمت میں پیش کر کے ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے"۔

"کوئی مضائقہ نہیں"، بازید نے اٹھتے ہوئے کہا "ہم تیار ہیں"۔

وہ سپاہیوں کی معیت میں وہاں سے روانہ ہوئے اور شہر کے ناظم کے پاس پہنچے۔ ناظم انھیں دیکھتے ہی تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اُس نے تپاک سے اُن کا استقبال کیا اور انھیں اپنے پہلو میں بٹھایا۔ یہاں بھی بازید نے وہی بات کی جو وہ دریا کے کنارے کر چکے تھے۔ شہر کے ناظم نے تحمّل سے اُن کی بات سنی پھر انھیں مشورہ دیا کہ وہ جس بلندی پر پہنچ گئے ہیں، وہاں سے لوٹ آئیں اور اپنا منصب دوبارہ سنبھال لیں۔ بازید نے ناظم کا مشورہ مسترد کر دیا۔ ناظم نے بہت اصرار کیا لیکن وہ اُس کا اصرار خاطر میں نہ لائے اور کہنے لگے۔ "اب ہم اپنا ٹھکرایا ہوا منصب سنبھالنے کے لیے اعوان نہیں جائیں گے۔ یہیں ملتان میں رہیں گے۔ یہ اللہ والوں کی زمین ہے۔ ہمیں یہیں پناہ ملے گی"۔

ناظم نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "اچھا، اگر آپ ملتان ہی میں رہنے پر مصر ہیں تو فبہا۔ میں اسے اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں اور آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں لیکن پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ میری درخواست رد نہیں کریں گے"۔

بازید نے کچھ سوچا اور وعدہ کر لیا۔ ناظم نے انھیں اپنی ملازمت کی پیش کش کر دی۔ بازید تذبذب میں مبتلا ہو گئے مگر چونکہ وعدہ کر چکے تھے اس لیے بادلِ ناخواستہ انھیں اُس کی پیش کش قبول کرنی پڑی۔ اُنھیں اُسی وقت ایک محفوظ فوجی کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا جسے ضرورت پیش آنے پر طلب کیا جا سکتا تھا۔ سرِدست انھیں کوئی خدمت تفویض نہیں کی گئی۔ دو درہم اُن کا روزینہ مقرّر ہوا۔ ساتھ ہی یہ آزادی بھی دے دی گئی کہ وہ عبادت کے لیے شہر سے باہر کسی بھی گوشے میں رہ سکتے ہیں۔ بازید نے کہا "ہم ملازم تو ہو گئے ہیں لیکن واضح رہے کہ نہ ہم کسی کے ماتحت ہوں گے، نہ کوئی ہمارا افسر ہو گا۔ ہم خود پر کسی کو سلام کرنے کی پابندی بھی عائد نہیں ہونے دیں گے"۔ اُن کی یہ شرائط بھی بے چون و چرا تسلیم کر لی گئیں۔

بازید کو ملتان کے ناظم کی با مراعات آزادانہ ملازمت اختیار کیے ہوئے ابھی زیادہ مدّت نہیں ہوئی تھی، ایک روز اچانک بازید کو خبر ملی کہ اُن کے آقا ملتان کے ناظم اور راجہ مروٹ کے درمیان جنگ چھڑنے والی ہے کیونکہ بیکانیر کے ریگستان کے سوال پر دونوں میں شدید اختلاف ہو گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی بازید "اللہ ہُو" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اٹھے اور اُسی وقت ناظم کے پاس پہنچے۔ ملتان کا لشکر اپنی مہم پر روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کوچ کا نقّارہ بجنے ہی والا تھا۔ بازید نے ناظم سے ملاقات کی اور از خود یہ درخواست کی کہ انھیں بھی اس مہم میں شرکت کی اجازت دی جائے تاکہ وہ نمک کا حق ادا کر سکیں۔ ناظم نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ فوج کے کس دستے سے متعلق ہونا اور کس سردار کی قیادت میں جانا پسند کریں گے؟ بازید نے اُسے اپنی یہ شرط یاد دلائی کہ وہ نہ کسی کے ماتحت ہوں گے، نہ کوئی اُن کا سردار ہو گا۔ انھوں نے کہا کہ "ہم خود اپنا دستہ ہیں اور خود اپنے سردار۔ ہمیں تنہا جانے کی اجازت دی جائے"۔

ناظم نے اب تک کسی سپاہی سے ایسی بات نہ سنی ہو گی۔ وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے کوشش کی کہ بازید تنہا جا کے خواہ مخواہ ہلاکت کا خطرہ مول نہ لیں بلکہ کسی دستے میں شامل ہو جائیں اس طرح وہ نسبتہً محفوظ رہیں گے مگر اُس کے سمجھانے بجھانے کے باوجود بازید اپنے موقف پہ قائم رہے۔ "ہم یہ مہم اپنی ذمّے داری پر اور اپنے طور پر سر کرنے کے خواہش مند ہیں"، انھوں نے استقلال اور استقامت سے کہا۔

اُن کا یہ جملہ سن کے کئی لوگ زیرِ لب مسکرائے مگر اُن کے احترام کے باعث کسی نے کچھ کہا نہیں۔ ناظم نے چند لمحوں تک غور کیا پھر اُنھیں مایوسی اور اداسی سے تنہا روانہ ہونے کی اجازت دے دی۔ بازید نے راجہ مروٹ کی تصویر طلب کر کے ذہن نشیں کی، راستہ دکھانے کے لیے ایک رہبر ساتھ لیا، تلوار سنبھالی، گھوڑے پر سوار ہوئے اور کسی تاخیر کے بغیر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اُن کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ مروٹ پہنچنے میں جب کچھ فاصلہ باقی رہ گیا تو انھوں نے رہبر کو رخصت کر دیا اور شہر کی حدود میں داخل ہو کے سیدھے راجا کے دربار کی طرف

روانہ ہوگئے۔ دربار کے نزدیک پہنچ کے انھوں نے گھوڑا ایک جگہ باندھا اور دربار میں داخل ہوگئے۔ دونوں حکومتوں کے مابین قاصدوں اور ایلچیوں کی آمدورفت جاری تھی، محافظوں اور پہرے داروں نے انھیں بھی ملتان کا کوئی ایلچی تصوّر کیا اس لیے روکا نہیں۔ بازید کسی کی طرف توجّہ دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دَرّانہ راجا کے قریب پہنچ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی اُن کے خطرناک ارادے کا اندازہ لگاتا اور مزاحم ہونے کی کوشش کرتا، انھوں نے یکایک تلوار بلند کی دُوسرے ہی لمحے ایک بھیانک چیخ سے در و دیوار لرز اٹھے اور راجا کا سر اُسی کے قدموں میں جاپڑا۔ بازید نے وہ سر فوراً اپنی تحویل میں لے لیا۔

پورے دربار میں شور مچ گیا۔ امرا اور مسلّح سپاہی پھرتی سے بازید کی طرف جھپٹے تاکہ انھیں بے قابو کر کے گرفتار کرلیں یا قتل کردیں مگر بازید ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے تھے اور راجا کی گردن سے انھوں نے اپنی تلوار بھی صیقل کر لی تھی اس لیے وہ اپنا دامن بچاتے اور مارتے کاٹتے ہوئے اُسی طرح تیزی کے ساتھ دربار سے نکل گئے جس طرح آئے تھے۔ دربار سے باہر پہنچ کے بھی اُن کی مستعدی اور تیزی میں کمی نہیں آئی۔ اُن کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی اس لیے کسی کو اُن کا راستہ روکنے کی ہمت نہیں ہوئی جو شخص جہاں تھا وہیں ٹھٹھک کے رہ گیا۔ بازید دوڑتے ہوئے بہ عجلت گھوڑے کے قریب پہنچے۔ گھوڑا گویا اُنھی کا منتظر تھا۔ ایڑ لگنے کی دیر تھی، وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔

ملتان کی فوج مروٹ کی جانب روانہ ہوچکی تھی۔ بازید نے اُسے راستے ہی میں جالیا۔ ملتان کا ناظم بھی فوج کے ساتھ تھا۔ بازید سیدھے اُس کے پاس پہنچے۔ انھوں نے راجا مروٹ کا کٹا ہوا خون آلود سر اُس کے قدموں میں ڈال دیا۔ لوگ پہلے تو انگشت بدنداں رہ گئے پھر معاً فوج میں فتح کے نعروں کا غلغلہ بلند ہوا اور سپاہی گھوڑوں سے اُتر اُتر کے مسرّت کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔ بازید نے انھیں اسی حالت میں چھوڑا اور اپنے مسکن کی راہ لی۔ مسکن پہنچ کے وہ پہلے کی طرح پھر خشوع و خضوع سے اوراد و وظائف میں مشغول ہوگئے۔

راجہ مروٹ کا خاتمہ کرنا بازید کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا لہٰذا اُن کا نام ایک بار پھر لوگوں کی زبانوں پہ عام ہوگیا اور عوام و خواص جوق در جوق اُن کی طرف رجوع ہونے لگے۔ دِلّی دربار سے بھی تحسینی پیغامات بھیجے گئے اور ایک خصوصی شاہی قاصد یہ حکم لے کر آیا کہ وہ اپنی شجاعانہ صلاحیتوں سے خلق کو فائدہ پہنچائیں اور اعوان جا کے دوبارہ اپنا عہدہ سنبھال لیں۔ بازید نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "ہم دنیا سے بھاگنا چاہتے ہیں اور یہ کم بخت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔" انھوں نے قاصد کے ذریعے دربار میں یہ عریضہ بھیجا کہ "ہم نے اپنی آیندہ زندگی خدا اور صرف خدا کے لیے وقف کردی ہے چنانچہ ہمیں یادِ خدا کے لیے ہر ذمّے داری اور ہر خدمت سے سبک دوش کردیا جائے۔"

چار و ناچار اُن کا یہ عریضہ منظور کرلیا گیا اور انھیں یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ جہاں مناسب سمجھیں، وہاں رہیں۔ انھیں آیندہ نہیں چھیڑا جائے گا تاہم معاشی کفالت کے لیے کچھ جاگیر ضرور قبول کرنی ہوگی۔ یہ ہندوستان کے حاکم شاہ جہاں کا اصرار تھا اس لیے خاصی ردّ و قدح کے باوجود آخر بازید کو جاگیر قبول کرنی پڑی۔ انھوں نے اس کے لیے قریبی پرگنے میں شور کوٹ کا مقام منتخب کیا اور جاگیر کی آمدنی وہاں کی خانقاہ اور مدرسے کے لیے وقف کردی۔

اُن کے خدّام مدّت سے اُن کی تلاش میں تھے۔ اب اُن کا شہرہ پھیلا تو خدّام کو بھی اُن کا سراغ مل گیا وہ بے تابانہ اپنے آقا کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے بازید سے گزارش کی کہ وہ گھر واپس چلیں۔ اُن کے بغیر گھر سُونا ہے اور اُن کے متعلّقین کی آنکھیں سُوج چکی ہیں اور آنسوؤں کا تمام ذخیرہ کام آچکا ہے۔ بازید نے مختلف جوازوں سے خدّام کو محروم و نامراد رخصت کردیا۔ اُن لوگوں کی آمد اُن کے شغل میں خلل کا باعث ہوتی تھی، وہ سخت اُلجھن میں گرفتار تھے ؎

خبر ہوتی کہ یُوں چھُپتا پھروں گا
تو اپنے آپ میں رُو پوش رہتا

خدّام نے گھر واپس پہنچ کے اُن کی واپسی کے سلسلے میں قطعی مایوسی کا اعلان کردیا۔ گھر والے تاسّف اور تشویش سے ایک دوسرے کی صورتیں تکنے لگے۔ پھر ایک آخری کوشش کے طور پر اُن کی بیوی کے بھائیوں نے اُن سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کی بیوی کا نام بی بی راستی تھا۔ بی بی راستی کے بھائی بڑی اُمّید سے اپنے بہنوئی کے مسکن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کے انھوں نے بھی بازید کو طرح طرح واپسی کی ترغیب دی اور کہا۔ "ہم بڑے مان سے آئے ہیں کہ آپ ہماری درخواست رد نہیں کریں گے۔"

بازید کے لیے خدّام کی طرح اپنے نسبتی بھائیوں کو ٹالنا آسان نہیں تھا اور وہ اُن کے دل توڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔ "عزیزو! اگر تمھاری ہمشیرہ بی بی راستی بھی یہی فرمائش کریں کہ لوٹ آؤ تو یقین کرو، ہم ضرور لوٹ آئیں گے۔ جاؤ اور اس سلسلے میں اپنی ہمشیرہ کا عندیہ معلوم کرو۔"

یہ شرط سُن کے بی بی راستی کے بھائی پھر گھر پہنچے اور انھوں نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ خود شوہر کے لیے واپسی کا پیغام بھیجیں۔ بی بی راستی خاموش ہوگئیں۔ وہ ایک پرہیز گار خاتون تھیں اور اپنے شوہر کی مزاج شناس تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ بازید نے اُنھی کی پرہیز گاری سے متاثر ہو کے دُنیوی آلائشیں ترک کی تھیں۔ بی بی راستی کے بھائی بے چینی سے

اُن کے جواب کے منتظر تھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بی بی راستی نے کہا "مشیّت کا بھید یہی ہے وہ جس راہ پر گام زن ہیں، انھیں اُسی پر گام زن رہنے دو۔ یہی سعادت ہے، یہی مشیّت۔ یہ کہہ کے انھوں نے چند ثانیوں تک سکوت کیا پھر جھکی ہوئی پلکوں اور سرخ عارضوں کے ساتھ دبی زبان میں اپنے بھائیوں کو بتایا کہ "تمھاری بہن کے پاس اللہ کی ایک امانت پرورش پا رہی ہے۔ اُسے مادر زاد ولی ہونا ہے۔ اُس کا ظہور پنجاب میں ہوگا۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ اُس کی خاطر دنیا ترک کر دیں۔ ہمیں اب دنیا کی طرف آواز نہ دو۔ غور سے سُن لو کہ تمھارے بہنوئی اب واپس نہیں آئیں گے اور مجھے بھی وہیں پہنچ کے اُن کی رفاقت کا حق ادا کرنا ہے۔"

نتیجتہً بی بی راستی کے بھائیوں کو بہنوئی کے علاوہ بہن کا فراق بھی قبول کرنا پڑا۔ جلد ہی بی بی راستی اپنے شوہر کے پاس شور کوٹ پہنچا دی گئیں اور اس طرح شور کوٹ کی فضا میں دو آوازیں مل کے "اللہ ہو، اللہ ہو" کا ورد کرنے لگیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ان آوازوں سے ایک نوزائدہ بچے کا رونا بھی ہم آہنگ ہو گیا اور اللہ کی نادیدہ امانت مجسّم ہو کے بی بی راستی کی آغوش میں ہمکنے لگی۔ تارک الدنیا باپ کا سر تشکر سے زمین پر جھک گیا۔

بی بی راستی خدا کی عبادت سمجھ کے اس پودے کی آب یاری کرنے لگیں۔ بچّے کے فطری اور پیدائشی جوہر گہوارے ہی میں چمکنے لگے۔ شیر خواری میں اُس کا یہ عالم تھا کہ اگر رمضان کے دن ہوتے تو روزے کے اوقات میں وہ ماں کا دودھ پینے سے عمداً اجتناب برتتا۔ بی بی راستی عبادت یا تلاوت کرنے کے لیے بیٹھتیں تو انھیں یہ اطمینان اور یقین ہوتا تھا کہ اُن کا بچّہ عام بچّوں کی طرح اُن کے شغل میں حارج نہیں ہوگا۔ بچّے نے بھی اُن کے اس اطمینان اور یقین کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ وہ گہوارے میں لیٹے لیٹے اپنی ماں کے وظائف یا تلاوت توجّہ، انہماک اور خاموشی سے سنتا رہتا اور جب ماں شغل ختم کر کے اُس کی طرف متوجّہ ہوتیں تو انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے معصوم بچّہ اپنی توتلی زبان میں اُن کا وظیفہ دہرا رہا ہے یا انھیں قرآن سنا رہا ہے۔ اُن کی آنکھیں مسرّت سے اشک بار ہو جاتیں اور اُن کے بے قرار لب بچّے کی پیشانی پر نگینے ثبت کرنے لگتے۔

بچّہ اسی فضا میں پرورش پاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے گھٹنوں گھٹنوں چلنا شروع کر دیا پھر ماں کی انگلی تھام کے اپنے پیروں پہ چلنے لگا اور رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ وہ گھر سے نکل کے گلی میں جانے کے قابل ہو گیا۔ وہ جب بھی گلی میں پہنچتا، محلّے کے دوسرے بچّوں سے صاف الگ پہچانا جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں ستاروں کی اور پیشانی میں چاند کی چمک تھی۔ وہ دیکھنے والوں کے لیے عجیب مقناطیسی کشش کا حامل تھا۔ جس شخص کی بھی اُس پر نظر پڑتی، وہ بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا اور



کا ذکر ہے۔ ایک صحابیہ پانی لے کر خیمے سے نکلیں کہ کسی مجاہد کو پلائیں۔ انھوں نے میدان میں ایک صحابی کو زخموں سے چُور چُور دیکھا۔ صحابی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ انھوں نے اشارے سے پانی مانگا۔ صحابیہ نے آگے بڑھ کے پانی کا برتن اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ اتنے میں قریب سے دوسرے زخمی نے آواز دی "پانی، پانی"۔ زخمی صحابی نے پیالہ فوراً واپس کر دیا کہ "بی بی! یہ پانی اُسے دے دو"۔ صحابیہ پانی لے کے دُوسرے کے پاس پہنچیں تو ایک اور زخمی کی آواز اُبھری۔ وہ بھی پانی طلب کر رہا تھا۔ دُوسرے شخص نے فوراً کہا کہ "بی بی! پہلے اُسے پلاؤ"۔ اس طرح صحابیہ سات آدمیوں کے پاس پانی لے کر گئیں۔ ہر شخص نے پانی مانگا تھا لیکن جب دوسرے کی آواز سُنی تو پہلے اُسے پلانے کا اشارہ کر دیا۔ صحابیہ جب ساتویں شخص کے پاس پانی لے کر پہنچیں تو وہ دم توڑ چکا تھا۔ وہ واپس ہوئیں تاکہ دوسرے شخص کو پانی دے سکیں مگر دیکھا کہ وہ بھی چل بسا ہے۔ اسی طرح وہ ایک ایک کر کے سب کے پاس گئیں لیکن کوئی بھی زندہ نہیں ملا۔

خواہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو، اُسے اٹھا کے بازوؤں میں بھرے بغیر نہ رہتا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اُس کے ماتھے پر نور کی غیر معمولی اور مسحور کُن دمک تھی۔ یہ دمک نور اور حُسن پیدا کرنے والے کی ناقابلِ تردید حقانیت کا اظہار تھی۔ "مناقبِ سلطانی" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ بازید محمدؒ اور بی بی راستی کا یہ بچّہ طفولیت میں گھر سے باہر نکلتا تو جو بھی غیر مسلم اُس کی طرف دیکھتا اُس کی حالت میں اچانک ایک حیرت انگیز تغیر پیدا ہو جاتا اور وہ کسی ظاہری ترغیب و تبلیغ کے بغیر بے اختیار کلمہ پڑھ کے خود بخود اسلام قبول کر لیتا۔ اس طرح بے شمار غیر مسلم اسلام کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات تھی۔ اس بچّے کے باعث شہر کے غیر مسلم جب اپنے بہت سے ہم مذہبوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تو اُن میں تہلکا مچ گیا اور وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ایک روز باہم مشورت کے لیے وہ سر جوڑ کے بیٹھے اور خاصے غور و فکر کے بعد انھوں نے بچّے کے باپ بازید محمدؒ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

جلد ہی انھوں نے ایک وفد کی صورت میں بازید محمدؒ سے ملاقات کی۔ بازید محمدؒ اُن کے ساتھ نہایت خوش خلقی سے پیش آئے اور اُن کی تواضع کرنے لگے۔ وفد کے لوگوں نے شکایت آمیز انداز میں اُن کے سامنے اپنا مدّعا رکھا اور اپنے مذہب کی حفاظت کے پیشِ نظر یہ مطالبہ کیا کہ آپ کا بچّہ جب بھی گھر سے باہر نکلے، براہِ کرم پہلے سے منادی کر دی جائے تاکہ ہم وقت سے پہلے مطلع ہو کر اپنے لوگوں پر باہر نکلنے کی پابندی عائد کر سکیں۔"

بازید محمدؒ مسکرائے۔ انھوں نے خندہ پیشانی اور سیر چشمی سے غیر مسلموں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جب بھی اُن کا بچّہ گھر سے باہر جانے کا ارادہ ظاہر کرتا، یا وہ خود اُسے سیر کے لیے لے جاتے تو شہر کے تمام کوچوں میں اُس کے نکلنے کا اعلان کروا دیتے۔

اعلان ہوتے ہی غیر مسلم لوگ اپنے اپنے گھروں یا دُکانوں میں چھپ کے بیٹھ جاتے تاکہ کہیں غلطی سے بچّے پر اُن کی نظر نہ پڑ جائے۔

بچّہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے اندر سفر کر رہا تھا۔ اندر کا سفر کرتا ہوا وہ شعور اور تمیز کی منزل میں پہنچا تو والدین نے اُس کے لیے مروّجہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا لیکن اس پر تو جذب و مستی کا غلبہ تھا۔ والدین کی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ اُس کی یہ روش دیکھ کر ایک روز بازید نے اپنی بیوی سے کہا "راستی! تمھارا بیٹا ازلی فیض سے سرفراز کیا گیا ہے، اسے نہ چھیڑو۔ اس کی تعلیم و تربیت ہمارا نہیں، اُس کا ذمّہ ہے جس نے آبشاروں کو بہنا اور طائروں کو چہکنا سکھایا ہے۔"

بازید محمد کی توقع غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اُنھی دنوں کا ذکر ہے، اُن کا بچّہ ایک روز شور کوٹ کے نواح سے گزر رہا تھا۔ اچانک اُس پر بے خودی طاری ہوئی۔ بے خودی میں اُس نے دیکھا کہ ایک نورانی صورت، صاحبِ جلال و حشمت سوار اُس کے سامنے نمودار ہوئے اور انھوں نے نہایت اپنائیت سے اُس کا ہاتھ تھام کے اُسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ بچّے پر تعجب بھی طاری ہوا اور خوف بھی مگر نووارد سوار نے دل نشیں لہجے میں اُس کی ہمّت بندھائی اور یہ انکشاف کر کے اُسے بہت کر دیا کہ وہ علیؓ ابنِ ابی طالب ہیں۔ بچّہ کم عمر ضرور تھا لیکن کم علم نہیں تھا کہ اس نام سے واقف نہ ہوتا۔ اُسے گمان بھی نہ ہو گا کہ حضرت علیؓ سے اس طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ فرطِ مسرّت میں مچل کے خود کو اُن پر قربان کر دینا چاہتا تھا لیکن اُن کی قربت کے احساس نے اسے یہ اذن تک نہیں دیا کہ وہ جنبش کر سکے۔ اُس کا جسم ساکت تھا، زبان گنگ تھی اور پتلیاں متحرک تھیں۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کے حضرت علی نے اُس پر توجّہ کی تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اُس نے سادگی اور معصومیت سے دریافت کیا "آپ غلام کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

حضرت علی نے کہا "فرزند! تمھاری طلبی رسول کے دربار سے ہوئی ہے۔ وہیں چل رہے ہیں۔"

وقت کی نبضیں تھم گئیں اور بچّے نے لمحوں میں خود کو رسولِ مقبولؐ کی بارگاہ میں شرف یاب دیکھا۔ اس بارگاہ میں اہلِ بیت کے علاوہ صدّیقِ اکبر، فاروقِ اعظم اور عثمانِ غنی بھی موجود تھے۔ سب سے پہلے صدّیقِ اکبر نے بچّے پر توجّہ کی اور رخصت ہو گئے پھر فاروقِ اعظم نے توجّہ دی اور رخصت ہو گئے۔ بعد ازاں عثمانِ غنی نے توجّہ دی اور وہ بھی رخصت ہو گئے۔ صرف اہلِ بیت محفل میں موجود رہے۔ رسولِ اکرمؐ نے بچّے سے پہلے خود بیعت لی پھر اُسے حضرتِ علی کے سپرد کر دیا۔ اس حیرت ناک واقعے کے بعد بچّے نے معاً خود کو دوبارہ شور کوٹ کے نواح میں پایا، جہاں سے اُسے لے جایا گیا تھا۔

پھر تو اُس کی دنیا ہی بدل گئی اور جب وہ بڑا ہوا تو سُلطان العارفین شیخ سُلطان باہو کے نام سے مشہور و موقّر ہوا۔ سلطان باہو اپنی کتاب "عین الفقر" میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مرشدِ کامل آں حضرتؐ نے مجھے تلقین فرمائی تو میری آنکھوں کے سامنے درجات اور مقامات کا کوئی حجاب باقی نہ رہا، اوّل و آخر یکساں ہو گیا اور میں تلقین سے مشرّف ہوا تو دخترِ رسول فاطمہ زہرا نے فرمایا کہ تو ہمارا فرزند ہے۔ پھر میں نے امام حسن اور امام حسین کے قدم چومے اور اپنے کانوں میں غلامی کا حلقہ پہنا۔ محبوبِ خدا نے تلقین کے بعد مجھے ہدایت دی کہ خدا کی مخلوق سے ہمّت کرنا۔ تمھارا درجہ روز بروز بلکہ لمحہ بہ لمحہ ترقی پر ہو گا اور ابدالآباد تک ایسا ہوتا رہے گا کیونکہ یہ سرّی اور سرمدی حکم ہے۔ بعد ازاں آں حضرتؐ نے مجھے غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے سپرد کیا۔ غوثِ اعظم نے سرفرازی کے بعد مجھے خلقت کے لیے رشد و ہدایت کا حکم دیا۔"

اس فیض یابی کے بعد سلطان باہو ہر وقت اور ہر لمحے وحدانیت کے سمندر میں مستغرق رہنے لگے۔ وہ ہمہ وقت حق کے مشاہدوں سے مشرّف اور ذاتِ مطلق کے جلال و جمال میں مست رہتے۔ وہ والہانہ زندہ مشائخ کے پاس پہنچتے اور بے تابانہ اولیا کے مقبروں پر جاتے۔ بی بی راستی اپنے بیٹے کی یہ شیفتگی اور فدائیت دیکھتیں تو سربسجود ہو جاتیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے گھر میں تین بہوئیں لائیں مگر تین تین بیویاں ہونے کے باوجود سلطان باہو کا گھر میں دل نہیں لگتا تھا کیونکہ انھیں تو حقیقی نسبت کسی اور سے تھی اور اُن کے دل میں تو کسی اور کی محبت بسی ہوئی تھی۔ وہ محبّت جو دل کی دُنیا میں اپنے سوا کسی کی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

سلطان باہو اولیا کی قبروں پر قبر کی دعوت کے لیے اکثر سواری کرتے تھے۔ علمِ دعوت وہ علم ہے جو اولیا کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ جو درویش دعوت کے لیے قبر پر سواری کرتے ہیں، وہ دیدار کی طلب میں مست ہوتے ہیں اور فانی زندگی سے ہاتھ دھو کے جاودانی زندگی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اسی جذبے سے ایک بار سلطان باہو ایک پیر کی قبر پر سوار ہوئے۔ وہ پیر ایک تجریدی، تفریدی اور جلالی پیر تھے لہٰذا اُن کی قبر پر سوار ہونے سے سلطان باہو کے دونوں تلووں میں آبلے پڑ گئے۔ سلطان باہو تکلیف کی حالت میں قبر سے اُترے اور اُن کے منھ سے نکلا "یہ کوئی نامراد یعنی لاولد فقیر ہے ہم اولاد والے ہیں۔ اب ہماری اولاد میں سے کوئی بھی اس قبر پر نہیں آئے گا۔" یہ جملہ اُن کی زبان سے جذب کے عالم میں ادا ہوا تھا اس لیے اس کا اثر اب تک باقی ہے۔

فیریکس

ٹریڈ مارک

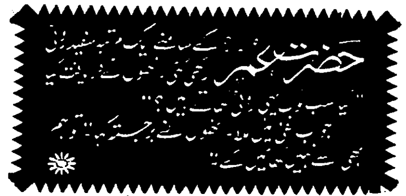
صحت مند نشو و نما کیلئے زود ہضم ٹھوس غِذا

تقریباً ۴ ماہ کی عمر سے اسکول جانے کی عمر تک بچے کیلئے متناسب ٹھوس غِذا کی ضرورت ہوتی ہے۔
آپ کے بچے کی قوّت اور صحت مند نشو و نما کے لئے فیریکس متوازن غِذا فراہم کرتا ہے۔
فیریکس میں تین پکے پکائے مقوّی اناج، گندم، مکئی اور چاول کے ساتھ فولاد، کیلشیئم، فاسفورس، وٹامن ڈی، وٹامن بی۱ اور بی۲ شامل کئے گئے ہیں۔
فیریکس آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور اسے تیار کرنے میں بھی کوئی دِقّت نہیں ہوتی ہے۔ فیریکس کو دودھ، شہد، پھلوں کے رس اور سوپ میں مِلا کر دیا جاتا ہے۔ اسطرح بچّہ نئے نئے ذائقوں سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔



بچّہ شیر خوار ہو یا نونہال
دونوں کے لئے بہترین ٹھوس غِذا فیریکس

GL-F-1-75 ASIATIC



آج بھی اگر اُن کی اولاد میں سے کوئی شخص اس قبر پر چلا جائے تو جانی و مالی نقصان اٹھاتا ہے۔

اسی طرح ایک بار سلطان باہو ملتان میں شیخ بہاؤالدین زکریا کے مزار پر سوار ہوئے۔ اچانک مزار میں جنبش ہوئی۔ قریب تھا کہ سلطان باہو کو کوئی ضرب پہنچ جاتا مگر فوراً غوثِ اعظم کی صدا اُبھری: "بہاؤالدین! یہ ہمارا محبوب ہے۔ اس سے اُلفت کرو، اجتناب نہیں۔ اس کی مراد سنو اور پوری کرو۔"

اس صدا کے ساتھ ہی بہاؤالدین زکریا نے مزار سے برآمد ہو کے سلطان باہو سے بالمشافہ ملاقات کی اور شفقت سے اُن کی مراد دریافت کرنے لگے۔ سلطان باہو نے کہا: "کوئی مراد نہیں ہے۔"

بہاؤالدین زکریا نے اصرار سے پھر مراد دریافت کی۔ سلطان باہو نے کہا: "مجھے اپنے شہر سے کسی پاکیزہ ہستی کا بازو عنایت کیجیے۔" یہ کہہ کے وہ جذب و مستی کے عالم میں درگاہ سے نکلے اور شمال کی جانب روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ اچانک کہیں سے ایک خوبصورت دوشیزہ آئی اور اُن کے قریب کھڑے ہو کے رونے لگی۔ دوشیزہ کے پیروں میں آبلے پڑے ہوئے تھے اور اپنی جوتیاں اُس نے ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔ سلطان باہو نے حیرانی سے پوچھا: "تُو کون ہے؟" دوشیزہ نے ایک ساہوکار کا نام لے کے بتایا کہ "میں اُن کی بیٹی ہوں۔"

سلطان باہو نے پوچھا: "یہاں کیوں آئی ہے؟"

وہ بولی: "آپ شیخ بہاؤالدین زکریا کے مزار پر گئے تھے تا جب آپ وہاں سے نکلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئی کیونکہ شیخ بہاؤالدین نے مجھے یہی حکم دیا تھا۔"

سلطان باہو فوراً الحکم الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ لمحوں میں حکمِ الٰہی ہو گیا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے باطنی تصرف سے اُسی وقت اِرد گرد کی آبادیوں کے معززین کو جمع کیا اور اُن کی گواہی میں اجنبی دوشیزہ سے نکاح کر لیا۔ یہ اُن کی چوتھی شادی تھی۔

سلطان باہو اسی لباس میں اپنی دلھن کے ساتھ منزل بہ منزل شورکوٹ پہنچے۔ گھر میں اُن کی والدہ اپنی تینوں بہوؤں کو پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ "آج میرا بیٹا تمھاری ایک سوکن لے کے آ رہا ہے۔"

"سلطان باہو نے نئی بیوی کے ساتھ گھر میں داخل ہو کے ماں کی قدم بوسی کی۔ بی بی راستی نے چوتھی بہو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بیٹے سے قدرے ناراضی کے انداز میں بولیں: "بیٹا! تم دُنیا میں بہت سی عورتیں جمع کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو یا معرفت کے حصُول کے لیے؟"

سُلطان باہو نے آخرالذکر امر کی تائید میں گردن ہلا دی۔ بی بی راستی نے کہا: "تو سنو۔ یہ راہ روشنی کے بغیر طے نہیں ہو گی۔ روشنی تلاش کرو۔" سلطان باہو نے کہا: "ماں میرے مرشد تو خود رسولِ اکرمؐ ہیں۔ اب مجھے کسی ظاہری مرشد کی کیا ضرورت؟"

بی بی راستی نے انھیں سینے سے لگا لیا: "بے شک رسُولِ اکرمؐ سے کامل مرشد کون ہو گا لیکن بیٹا! معرفت کی دنیا کا نظام یہی ہے کہ ظاہری رہبر کی رہبری ضرور حاصل کی جائے، اس کے بغیر حقیقی معرفت حاصل نہیں ہوتی جیسے ظاہری شریعت کی پیروی کے بغیر باطنی سربلندی نہیں ملتی۔"

بی بی راستی نے انھیں حضرت موسیٰ کا واقعہ سنایا: "اُن کے کامل ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ انھیں تو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل تھا۔ پھر بھی ظاہری واسطہ لازم قرار پایا اور انھوں نے حضرت خضر کی پیروی کی۔ مجمع البحرین گئے پھر اُن پر وہ اسرار بھی منکشف ہوئے جو پہلے منکشف نہیں ہوئے تھے۔"

ماں کی ترغیب سلطان باہو کے دل کو لگ گئی۔ انھوں نے سینہ مسلتے ہوئے بے قراری سے پُوچھا: "روشنی کہاں ہے ماں؟ میں کس سمت میں جاؤں؟"

بی بی راستی نے کہا: "مجھے معرفت کی خوشبو مشرق کی سمت سے محسوس ہوتی ہے۔"

سُلطان باہو نے ماں سے اُسی وقت رُخصت لی اور نئی نویلی دُلھن کو جس حالت میں لائے تھے اُسی حالت میں چھوڑ کر گھر سے نکل گئے۔ انھوں نے تلاش کا سفر مستانہ وار طے کرنا شروع کر دیا۔ قریے قریے اور بستی بستی کی خاک چھانی، پہاڑ ناپے، خارزاروں میں آبلہ پائی کی اور جنگلوں کی کڑی مسافتیں طے کیں لیکن کہیں بھی کوئی کرن اُن کے لیے زنجیر نہ بن سکی۔

اسی سفر میں ایک روز وہ چولستان سے گزر رہے تھے ایک مقام پر دُور سے اُن کی نظر ایک لکڑہارے پر پڑی۔ لکڑہارا ایندھن کے لیے لکڑیوں کا گٹھا باندھ رہا تھا۔ سُلطان باہو گزرتے چلے گئے۔ دُوسرے روز چند ہمراہیوں کے ساتھ اتّفاق سے وہ پھر اُسی مقام سے گزرے تو معاً ٹھٹک کے رُک گئے اور محویت کے عالم میں دیر تک ایک جگہ کھڑے رہے۔ جب خاصا وقت بیت گیا تو ایک ہم راہی نے انھیں چونکایا اور اس طرح ایک جگہ کھڑے ہو جانے کا سبب دریافت کیا۔ سلطان باہو نے گویا کچھ سونگھتے

سب رنگ

ہوئے جواب دیا۔ "رفیقو! میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں ضرور کسی ولی کا مسکن ہے۔ زمین سے آسمان تک نور ہی نور نظر آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کے وہ چند قدم آگے بڑھے تو انھیں کوئی شخص بےہوش پڑا ہوا نظر آیا۔ اُس کے پاس لکڑیوں کا گٹھا بھی پڑا تھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی لکڑہارا تھا جسے وہ کل دیکھ چکے تھے۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے آہستگی سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شخص اُسی وقت ہوش میں آگیا سلطان باہو نے اُس سے اُس کا حال پوچھا۔ لکڑہارے نے وارفتگی سے کہا۔ "حضرت! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو کل یہاں سے حضور ہی گزرے تھے؟" سلطان باہو نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ لکڑہارے نے اُن کی دست بوسی کی اور عاجزی سے کہا۔ "مجھے یاد ہے آپ نے مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ جیسے ہی آپ کی نظر پڑی، مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ آپ کی ایک اچٹتی نگاہ نے مجھے نہ جانے کہاں پہنچا دیا تھا کہ وہاں سے واپس آنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اسی باعث میں کل سے اب تک یہیں ہوں۔" وہ دست بستہ ہو گیا۔ "حضور! آپ نے مجھے واپس کیوں بلا لیا؟ خدارا پھر وہیں پہنچا دیجیے۔"

سلطان باہو نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں لکڑہارا اُن کی نگاہ کی تاب نہ لا سکا اور چشم زدن میں پھر بےہوش ہو گیا سلطان باہو نے اس طرح ایک لحظے میں اور صرف ایک قدم پر ان گنت طالبوں کی کایا پلٹ دی۔ اُن کا شمار نہ تھا۔

کوچہ گردی صحرانوردی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز وہ اپنے خلیفہ سلطان حمید کے ساتھ ایک ویران ٹیلے پر پہنچے تو انھیں کچھ تھکن محسوس ہوئی۔ انھوں نے ٹیلے پر بیٹھنے کا ارادہ کیا مگر دوسرے ہی لمحے یہ ارادہ بدل دیا اور خلیفہ سے کہا۔ "حمید جلدی کرو۔ اس ٹیلے سے فوراً اترو۔ یہاں سے ظلم کا تعفن اُٹھ رہا ہے۔"

بعد میں تحقیق سے ثابت ہُوا کہ وہ ٹیلا کسی زمانے میں ایک ایسے شخص کی ملکیت تھا جو نہایت ظالم و جابر تھا۔ ٹیلے سے اتر کے سُلطان باہو نے ریت کے میدان میں قیام کیا اور خلیفہ حمید کے زانو پر سر رکھ کے لیٹ گئے۔ اس طرح اُن کا لباس اور جسم خاک آلود ہو گیا۔ خلیفہ کو اپنے پیر کی یہ حالت دیکھ کے بہت قلق ہوا۔ اُس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ کاش میرے پاس دُنیوی دولت ہوتی تو آج میں اپنے پیر کے لیے اطلس و مخمل کا نرم بستر بنواتا۔ اُسی وقت سلطان باہو نے اُس کے زانو سے سر اٹھا کے پوچھا۔ "حمید! کیا سوچ رہے ہو؟"

خلیفہ نے جو سوچا تھا، وہ بتا دیا۔ سلطان باہو نے مسکرا کے کہا "ذرا آنکھیں تو بند کرو۔"

ایک شخص اپنے بادشاہ کے دربار میں پہنچ کے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے اُس سے دریافت کیا کہ "کیوں کھڑا ہے؟" اُس شخص نے برجستہ جواب دیا۔ "اس لیے کہ بٹھا دیا جاؤں۔" بادشاہ نے خوش ہو کے اُسے اپنے دربار میں مسند دے دی۔

خلیفہ نے حکم کی تعمیل میں آنکھیں بند کیں تو عجیب منظر دیکھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک خوش نما اور معطّر باغ میں پایا۔ وہاں ایک روش دیبا کے فرش و فروش سے آراستہ تھی اور ایک نہایت حسین و جمیل عورت جڑاؤ زیور اور ریشمی کپڑے پہنے ہوئے سلطان حمید سے رغبت ظاہر کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ "مجھ سے نکاح کر لو۔" حمید نے دبی زبان میں اُس سے کہا۔ "دور دور، کیا غضب کر رہی ہو۔ میں اس وقت اپنے ہادی کی خدمت میں حاضر ہوں۔ کیا مجھے اُن کی نظروں سے گراؤ گی۔ میرے پاس نہ آؤ۔ ہٹو۔" اسی اثنا میں اُس کی آنکھ خود بخود کھُل گئی اور شرم و ندامت سے اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ سلطان باہو نے اُس سے پوچھا کہ "کیا دیکھا؟" اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ تفصیل سے بیان کیا۔ سلطان باہو نے پوری بات سُنی پھر کہا۔ "ارے ابھی تو تم دنیا کی طمع کر رہے تھے۔ یہ دنیا ہی تو تھی۔ تم نے اسے قبول کیوں نہیں کیا؟ اگر اسے قبول کر لیتے تو دنیا کا مال و زر تمھارے گھر سے کبھی ختم نہ ہوتا۔"

حمید نے دست بستہ کہا۔ "مرشد! خادم مال و دولت کا نہیں، فقر کا متمنّی ہے۔"

سلطان باہو بولے۔ "مناسب ہے۔ فقر کا اثر تمھارے خاندان سے کبھی نہیں جائے گا۔"



تجسس کی مسافت کے ان راستوں میں سُلطان باہو کئی مجذوبوں، درویشوں اور فقیروں سے ملے لیکن نگاہ کی کسوٹی پر کوئی پورا نہ اُترا۔ وہ بڑھتے رہے کہ ؎

دیکھیں، ادائے فرض ہو کس روز، کس جگہ
ہوتا ہے راستوں کی ندی پر وضو ہنوز!

البتّہ مختلف فقرا سے انھوں نے بغداد کے شاہ حبیب اللّٰہ قادری کا تذکرہ جگہ جگہ سُنا اور اُن کے دل میں بغداد جانے کا شوق جڑ پکڑتا رہا۔ آخر اسی شوق کی رہنمائی میں انھوں نے رختِ سفر باندھا اور ہندوستان سے عراق تک اپنی زندگی کی سب سے طویل مسافت طے کی اور بغداد میں داخل ہو کے کہیں رکے نہیں، سیدھے شاہ حبیب اللّٰہ کی خانقاہ پہنچے۔ خانقاہ درویشوں، زائروں اور خدّام سے بھری ہوئی تھی۔ شاہ حبیب اللّٰہ کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ اپنی خانقاہ میں پانی کی ایک دیگ نرم آنچ پر ہر وقت گرم رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جو بھی اُس دیگ میں ہاتھ ڈالتا، وہ صاحبِ کشف ہو جاتا تھا۔ سلطان باہو نے دیکھا کہ طالبین جوق در جوق آ رہے ہیں اور شاہ حبیب کے اشارے پر باری باری دیگ میں ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ سلطان باہو ایک طرف بیٹھ کے خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتہً شاہ حبیب کی نظر اس پردیسی پر پڑی۔ انھوں نے سلطان باہو سے کہا۔ "درویش! وضع قطع اور چہرے مُہرے سے تُو یہاں کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔ شاید کہیں دور سے آیا ہے مگر تُو علیحدہ کیوں بیٹھا ہے؟ اُٹھ اور یہاں آ کے دیگ میں ہاتھ ڈال تاکہ اپنی مراد کو پہنچے۔" سلطان باہو اُٹھ کے اُن کے پاس گئے اور ادب سے بولے۔ "بابا! میری مراد ایسی نہیں ہے جو اس طرح بر آئے۔ کشف و کرامت کے یہ کھلونے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ میں وہ طائر ہوں جس کی علوِ ہمّتی سدرۃ المنتہا پہنچ کر بھی قانع نہیں ہو سکتی۔ میرا شوق لاہوت کی بسیط فضا چاہتا ہے۔ میری انتہائی منزل تنزیہہ کا وہ مقام ہے جہاں ذاتِ حق کے سوا کوئی نہ ہو۔ حق یا ہُو۔ یا ہُو۔"

شاہ حبیب چونک پڑے۔ انھوں نے سر کو خفیف سی جنبش دے کے کہا۔ "درویش! بے شک تیری آرزو بلند ہے مگر جانتا ہے بلند آرزو مراحل کتنے سخت مانگتی ہے؟"

سلطان باہو نے پامردی سے کہا۔ "یہ مسافت بے سبب طے نہیں کی ہے بابا! حکم دیجیے۔"

"اچھا۔" شاہ حبیب نے کہا۔ "تو کچھ روز مجاہدہ کر۔ فی الحال پانی بھر کر۔" انھوں نے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ خادم نے ایک مشکیزہ لا کے سلطان باہو کے حوالے کر دیا۔

سلطان باہو نے رضا و رغبت سے مشکیزہ سنبھالا، اُسے پانی سے بھرا اور پانی لے جا کے خالی حوض میں انڈیل دیا۔ حاضرین نے حیرانی سے دیکھا کہ سلطان باہو کے پہلے ہی مشکیزے میں حوض لبالب بھر گیا اور نہ صرف حوض بھر گیا بلکہ خانقاہ کا صحن بھی بھیگنے لگا۔ شاہ حبیب نے تحمّل کے ساتھ یہ ماجرا دیکھا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے مریدوں سے کہا۔ "یہ درویش کوئی کم مایہ طالب معلوم نہیں ہوتا۔" انھوں نے ہاتھ ہلا کے سلطان باہو کو اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔ "آزمائش کے لیے آمادہ ہے؟" سلطان باہو نے بے تأمّل آمادگی ظاہر کر دی۔ شاہ حبیب نے سوال کیا۔ "تیرے پاس دنیا کا کچھ مال و متاع ہے؟" سلطان باہو نے اثبات میں جواب دیا۔ شاہ حبیب برجستہ بولے۔ "فقر اور مال کا کیا میل؟ ایک میان میں کہیں دو تلواریں بھی سماتی ہیں اور ایک

سب تک

دل میں کہیں دو محبتیں بھی جمع ہوتی ہیں۔" یہ سننا تھا کہ سلطان باہو یکایک پلٹے اور قریب قریب دوڑتے ہوئے خانقاہ سے باہر نکل گئے۔ بغداد میں انھوں نے کہیں قیام نہیں کیا۔



شور کوٹ میں بی بی راستی نے ایک صبح اپنی چاروں بہوؤں کو بلا کے اپنے سامنے بٹھایا اور ملائمت سے بولیں "بیٹیو! آج میرا بیٹا واپس آ رہا ہے۔" بہوؤں کی گردنیں جھک گئیں لیکن بی بی راستی کے دوسرے ہی جملے نے انھیں گردنیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بی بی کہہ رہی تھیں "تمھیں اپنے شوہر کے آنے کی غایت معلوم ہے؟ وہ سارا مال و متاع گھر سے باہر پھینکنے کے لیے آ رہا ہے لیکن میں تمھیں وقت سے پہلے ہوشیار کر رہی ہوں لہٰذا مناسب یہ ہو گا کہ تم چاروں اپنے اپنے زیورات اور نقدی وغیرہ کہیں چھپا دو۔"

بی بی راستی کی بہوؤں نے ساس کی ہدایت کے مطابق تمام زیور، تمام نقدی اور تمام دوسری قیمتی اشیا زمین کھود کے دفن کر دیں اور مطمئن ہو گئیں۔

شام کا وقت تھا۔ سلطان باہو نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ بی بی راستی نے دروازہ کھولا۔ دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ سلطان باہو کی بیویاں اُن کے ارد گرد جمع ہو گئیں اور مدّت سے بچھڑے ہوئے ماں بیٹے کی ملاقات کا منظر اشک بار نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ماں سے جدا ہو کے سلطان باہو اپنی بیویوں کی طرف متوجّہ ہوئے تو اُن کے منہ سے سب سے پہلا سوال یہ نکلا کہ "گھر میں جتنا بھی مال و متاع ہے، وہ سب نکال کے ایک جگہ ڈھیر کر دو۔"

بیویوں نے بیک وقت جواب دیا کہ "آپ اتنی مدت بعد لوٹے ہیں۔ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

سلطان باہو نے غائر نظروں سے پورے گھر کا جائزہ لیا اور ایک ایک کونا چھان مارا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ البتہ گہوارے میں اُن کا شیر خوار بچّہ سو رہا تھا، اُس کی انگلی میں سونے کی ایک انگشتری چمک رہی تھی۔ سلطان باہو نے آگے بڑھ کے بچّے کی انگلی سے انگشتری اتاری اور گھر سے باہر اُچھال دی پھر اطمینان سے چارپائی پر دراز ہو گئے۔ سفر کی تھکن کے باعث اُن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، ایسی صورت میں انھیں بہت جلد نیند آ جانی چاہیے تھی لیکن سونے کے بجائے صرف چند لمحوں میں وہ سخت مضطرب نظر آنے لگے۔ بار بار اُٹھ کے بیٹھتے، اِدھر اُدھر دیکھتے اور دوبارہ لیٹ جاتے۔ یہ عمل انھوں نے دو تین بار دُہرایا پھر آخر چارپائی سے اُتر گئے اور کچھ سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے اضطرار سے بولے "مال کی بُو آ رہی ہے، مال کی بُو آ رہی ہے۔"

یہ جملہ انھوں نے مسلسل کہنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً اُن کی بیویوں کو مجبور ہو کے یہ بتانا پڑا کہ مال کہاں دفن ہے۔ سلطان باہو نے فی الفور زمین کھود ڈالی اور تمام مال نکال کے نہایت بے نیازی کے ساتھ گھر سے باہر پھینک آئے۔

دوسری صبح ہندوستان سے عراق تک کی طویل مسافت دوبارہ شروع ہو گئی اور منزلوں پر منزلیں سر کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر شیخ حبیب کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ شیخ حبیب نے انھیں دیکھا تو کھڑے ہو کے سینے سے لگا لیا پھر اُن کی پشت تھپکتے ہوئے بولے "درویش! بے شک تم نے دُنیوی مال سے تو نجات حاصل کر لی مگر ابھی تک اپنی عورتوں سے آزادی حاصل نہیں کی۔ اُن کا حق ادا کرو گے یا خدا کا؟"

یہ سُننا تھا کہ سلطان باہو شیخ حبیب سے علیحدہ ہوئے اور پہلے کی طرح آج پھر یکایک پلٹے اور قریب قریب دوڑتے ہوئے خانقاہ سے باہر نکل گئے۔ راہ میں پھر انھوں نے کہیں قیام نہیں کیا۔



شور کوٹ میں ایک صبح بی بی راستی نے پھر اپنی چاروں بہوؤں کو اپنے سامنے بٹھایا اور رقّت سے بولیں "میرا بیٹا آج پھر آ رہا ہے اور آج اُس کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اُس نے مال و متاع سے نجات حاصل کی ہے، اُسی طرح تم چاروں سے بھی دست بردار ہو جائے۔" بہوؤں کے چہرے فق ہو گئے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بی بی راستی نے فوراً سنبھل کے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "مگر بیٹیو! فکر نہ کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ تم ایک بار اس گھر میں قدم رکھ چکی ہو، اب یہ گھر تمھارا ہے۔ تم یہیں رہو گی۔" بی بی راستی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں "تم چاروں اُس کے سامنے نہ پڑنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں دیکھ کے وہ ایک دم کوئی حتمی بات منہ سے نکال بیٹھے۔"

شام کو سلطان باہو گھر پہنچے تو بی بی راستی نے اُن سے پہلا سوال یہ کیا "بیٹا! اب کیسے آنا ہوا؟" سلطان باہو نے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ بی بی راستی نے انھیں بٹھا لیا اور نرمی سے کہا "بیویوں کے جو حقوق تمھارے سپرد ہیں، آج سے تم اُن سے بری الذمہ ہوا اور تمھارے جو حقوق بیویوں کے ذمّے ہیں، وہ بدستور قائم رہیں گے۔ اگر تم حقیقی معرفت حاصل کر کے گھر آ گئے تو بہتر ہے ورنہ تمھیں محض بیویوں کے حقوق کی خاطر گھر آنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ ایسی صورت میں انھیں طلاق دینے کا خیال دل سے نکال دو۔"

ماں کی تجویز نے سلطان باہو کو متاثر کیا پھر بھی وہ مصر ہوئے کہ یہ تجویز اُن کے لیے اُس وقت قابلِ قبول ہو گی جب یہ بات اُن کے سامنے خود اُن کی بیویاں کہیں۔ بی بی راستی نے آواز دے کے اپنی بہوؤں کو بلوایا

اور اپنی تجویز دُہرا دی۔ چاروں بہوؤں نے کسی تعرض کے بغیر اپنے شوہر کے سامنے اس تجویز سے قطعی اتفاق ظاہر کیا۔ سلطان باہو نے انھیں تشکر کی نگاہ سے دیکھا اور ماں سے اجازت لے کے تیسری بار ہندوستان سے عراق تک کی طویل مسافت طے کرنے کے لیے گھر سے نکل گئے۔

سلطان باہو چونکہ اب اس راہ کے عادی ہو گئے تھے اس لیے اس دفعہ عراق پہنچنے میں انھیں پہلے جیسی دقتیں پیش نہیں آئیں، نہ اتنی مدت صرف ہوئی جتنی پہلی اور دوسری بار صرف ہوئی تھی بغداد پہنچ کے وہ خانقاہ گئے تو اس مرتبہ شیخ حبیب نے بھی غیر معمولی تپاک کا مظاہرہ کیا اور کامل نظر سے اُن پر توجہ دی۔ اُن کی توجہ کے باعث سلطان باہو قلبی واردات سے دوچار ہو گئے اور دیر تک دوچار رہے۔ واردات کے اختتام کے بعد شیخ حبیب نے اُن سے پوچھا۔ "سلطان! مُراد پوری ہوئی؟ کچھ مشاہدہ کیا؟"

سلطان باہو نے دست بستہ ہو کے انکسار سے کہا۔ "شیخ! جو مقامات مجھ پر اس وقت منکشف ہوئے ہیں، ان سے تو میں کئی بار گزر چکا تھا۔ میری تمنا اس سے کہیں سوا ہے۔"

شیخ حبیب نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ امتحان کے طور پر بیٹھے بیٹھے سلطان باہو کی نظروں سے اچانک اوجھل ہو گئے۔ سلطان باہو نے بھی تاخیر نہیں کی۔ وہ بھی پرواز پر مائل ہوئے اور شیخ حبیب کا تعاقب کرتے کرتے ایک کھیت میں جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے ایک ضعیف کاشتکار کو دیکھا۔ کاشت کار بیلوں کی جوڑی لیے ہوئے ہل چلانے میں مصروف تھا۔ سلطان باہو نے ایک خرقہ پوش درویش کا روپ دھارا اور کاشت کار کے پاس جا کے کہا۔ "بابا! یہ ضعیفی اور اتنی مشقت؟ مجھے ترس آ رہا ہے آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔ جائیے آپ آرام کیجیے اور ہل مجھے دیجیے۔"

ضعیف کاشت کار کے بھیس میں دراصل شیخ حبیب ہل چلا رہے تھے۔ وہ سلطان باہو کی یہ پیش کش سُن کے ہنس دیے اور دوبارہ اپنی اصل صورت میں لوٹ آئے۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ وہاں سے واپس ہوئے لیکن واپسی کا فاصلہ ابھی صرف چند قدم طے ہوا ہو گا کہ شیخ حبیب چلتے چلتے پھر کہیں غائب ہو گئے۔ سلطان باہو نے بھی اُن کی پیروی کی اور پیروی کرتے ہوئے ہندوؤں کی ایک دُور دراز آبادی میں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے ایک بوڑھے برہمن کو دیکھا۔ برہمن کے ہاتھ میں زعفران اور رنگ سے بھرا ہوا ایک برتن تھا اور وہ بازار سے گزرنے والوں کے ماتھوں پر تلک لگا رہا تھا۔ سلطان باہو نے بھی ایک نوجوان کی ہیئت اختیار کر لی اور جب برہمن اُن کے قریب سے گزرا تو اُس کے سامنے پہنچ کے کہا۔ "بابا! میرا ماتھا بھی خالی ہے۔"

دوسرے ہی لمحے سلطان باہو کے سامنے برہمن کے بجائے شیخ حبیب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے سلطان باہو کا ہاتھ تھام لیا اور آگے بڑھ گئے مگر صرف چند قدم چلنے کے بعد وہ تیسری بار کہیں غائب ہو گئے۔ اس بار اُن کے غائب ہونے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ سلطان باہو نے بھی سُرعت دکھائی اور اُن کا تعاقب کرتے ہوئے ایک مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک معمر اُستاد بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ سلطان باہو نے خود کو ایک خورد سال بچے میں تبدیل کیا اور ہاتھ میں قاعدہ لے کے اُستاد کے پاس پہنچے اور دوزانو بیٹھ گئے پھر ایک حرف پر اُنگلی رکھ کے پوچھنے لگے۔ "بابا! یہ کیا ہے؟"

اس بار شیخ حبیب نہ مسکرائے، نہ ہنسے بلکہ انھوں نے آب دیدہ ہو کے سلطان باہو کو سینے میں سمیٹ لیا اور بولے۔ "بس بس۔ بہت ہو چکا۔"

سلطان باہو نے قاعدے کے حرف سے اُنگلی نہیں ہٹائی تھی۔ انھوں نے دوبارہ معصومیت سے پوچھا۔ "بابا! یہ کیا ہے؟"

شیخ حبیب بولے۔ "بھلا میں تجھے کیا بتا سکتا ہوں کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ سلطان! تو میرے بس کا نہیں ہے۔"

دونوں خانقاہ لوٹ آئے۔ یہاں آ کے شیخ حبیب نے سلطان باہو سے کہا۔ "برادر! تو جس نعمت کا مستحق ہے، وہ میرے امکان میں نہیں ہے۔ ہاں، میرے شیخ عبدالرحمان قادری کی خدمت میں جا۔ وہ ہند کے مشہور شہر دہلی میں فروکش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، تیرا حصّہ وہیں ہے۔"

☆

دہلی میں شیخ عبدالرحمان قادری کی خانقاہ کا گوشہ گوشہ اوراد و وظائف سے گونج رہا تھا۔ لوگ فرداً فرداً بھی عبادات میں مصروف تھے اور اجتماعی طور پر بھی۔ شیخ عبدالرحمان ایک کونے میں بیٹھے ہوئے مراقبہ کر رہے تھے۔ چند مرید اور خدام اُن کے دائیں بائیں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یکایک شیخ نے مراقبہ ختم کیا، آنکھیں کھولیں اور اپنے خاص خادم سے مخاطب ہو کے بولے۔ "جلدی کر اور باہر دوڑ۔ کچھ فاصلے پر شیخ کے تھیلی سفر کی گرد میں اَٹا ہوا ایک گریباں چاک، شکستہ حال درویش نظر آئے گا۔ جلد از جلد اُس کے پاس پہنچ اور اُسے مکمل عزّ و احترام سے یہاں لے آ۔ وہ ہمارا باہو ہے۔"

خادم ارشاد کی تعمیل میں باہر لپکا اور راہ گیروں کے تعجب و تمسخر کی پروا کیے بغیر اپنی پوری رفتار سے دوڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچ گیا، جہاں سے سلطان باہو آ رہے تھے۔ شیخ عبدالرحمان کے خادم کو قرائن سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ اسی درویش کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کے سلطان باہو کے پاؤں چھوئے اور احتراماً اُن سے ایک قدم پیچھے ہو کے خانقاہ کے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ "حضرت! اِدھر چلنا ہے۔"

خادم کی معیت میں سلطان باہوؒ شیخ عبدالرحمان کے رُو بہ رُو گئے تو شیخ فوراً اُن کا ہاتھ تھام کے انھیں تخلیے میں لے گئے۔ تخلیے میں پہنچتے ہی انھوں نے کسی قیل و قال کے بغیر سلطان باہوؒ پر ایک بھرپور نگاہ مرکوز کی۔ اُن کی نگاہ میں عجیب تاثیر تھی۔ سلطان باہوؒ کو صرف ایک دم اور صرف ایک قدم میں وہ الستی نعمت حاصل ہو گئی جس کی انھیں مدّتوں سے طلب تھی اور جس کے لیے مجاہدات کے ہزار ہا دریا سالہا سال تک عبور کرنے پڑتے ہیں۔ اُن پر حال کا غلبہ ہوا اور لمحوں میں صد ہا اسرار و رموز منکشف ہو گئے نیز اُن کا دل فیض رسانی کے شدید جذبے سے لبریز ہو گیا۔

شیخ عبدالرحمان نے اُنھیں اپنے پاس نہیں روکا، اُسی وقت خانقاہ سے رخصت کر دیا۔ سلطان باہوؒ سرشاری و سرمستی کے عالم میں خانقاہ سے نکلے اور مختلف بازاروں سے گزرتے ہوئے ہر خاص و عام پر توجّہ دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جس پر بھی اُن کی توجّہ ہو جاتی، وہ ایک دم بے خود و بے حال ہو جاتا۔ شیخ کی صرف ایک نگاہ نے سلطان باہوؒ میں فیض رسانی کی غیر معمولی استعداد پیدا کر دی تھی۔

"مناقبِ سلطانی" کے مصنّف سلطان حامد نے اپنی کتاب کے صفحہ ۴۳ اور ۴۴ پر ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ

سلطان باہوؒ چلتے چلتے اتّفاق سے جامع مسجد پہنچ گئے۔ جمعے کا روز تھا اس لیے جامع مسجد میں ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ رعایا کے علاوہ بادشاہ بھی سلطنت کے دیگر ارکان کے ساتھ بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے سلطان باہوؒ کو وہاں جگہ ملی جہاں نمازیوں کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ سلطان باہوؒ وہیں بیٹھ گئے اور جب نماز ختم ہوئی تو انھوں نے بیک وقت پورے مجمع پر توجّہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جامع مسجد "یا حق یا حق" کے نعروں سے گونجنے لگی۔ لوگ مسلسل وجد کے عالم میں "یا حق یا حق" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ معمولی سے معمولی شخص پر جذب و حال کی کیفیت طاری تھی لیکن بادشاہ، قاضی اور کوتوال اس کیفیت سے محروم و محجوب رہے۔ پھر جب سلطان باہوؒ نے توجّہ منقطع کی اور مجمع کی حالت معمول پر آئی تو بادشاہ، قاضی اور کوتوال نے سلطان باہوؒ کے قریب جا کے پوچھا "بابا! ہماری کیا تقصیر تھی کہ ہم اس نعمت سے محروم رکھے گئے؟"

سلطان باہوؒ نے برملا کہا "ہم نے تو سب پر یکساں توجّہ کی تھی مگر تم تینوں پر اثر نہیں ہوا۔ یہ بارش کا قصور نہیں ہے کہ باغ میں لالہ و گل اُگتے ہیں اور صحرا میں خس و خاشاک۔ تم تینوں پر اثر نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمھارے دل سخت ہیں، معرفت کی لطافت آسانی سے قبول نہیں کر سکتے۔"

انھوں نے سر جھکا کے دست بستہ استدعا کی "ہمیں فیض کی لذّت سے محروم نہ رکھیے۔"

1. جس آبادی میں اہلِ احسان نہ ہوں، اُسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
2. جس تمدّن کو اہلِ جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں۔ وہ خوش نما اور دیرپا نہیں رہتا۔
3. جس سرحد کو اہلِ شہادت میسّر نہ آئیں، وہ مٹ جاتی ہے۔

"آوازِ دوست" مختار مسعود

سلطان باہوؒ نے اُن کی استدعا قبول کرتے ہوئے بادشاہ سے کہا "ہماری دو شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ تو اور تیری اولاد ہمارے اور ہماری اولاد کے لیے مال و متاع کی رعایت کبھی نہ کرے۔ دُوسری یہ کہ تو اور تیری اولاد ہمارے مکانوں پر کبھی نہ آئے۔"

بادشاہ نے اقرار کر لیا۔ سلطان باہوؒ نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو خاص توجّہ سے فیض یاب کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اُن سے کسی یادگار کی فرمائش کی۔ سلطان باہوؒ نے وہیں کھڑے کھڑے ایک کتاب املا کروائی۔ وہ بولتے جا رہے تھے اور شاہی محرّر اُن کے الفاظ قلم بند کرتے جا رہے تھے۔ کتاب لکھوا کے سلطان باہوؒ پھر بازاروں میں نکلے اور راہ گیروں پر توجّہ صرف کرنے لگے۔ اس صورتِ حال سے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلقت کے انبوہ سے راستے بند ہونے لگے۔ کسی نے دوڑ کے شیخ عبدالرحمان کو یہ خبر پہنچائی کہ ایک ولی نے دہلی کے بے شمار لوگوں کو وجد و حال میں مبتلا کر رکھا ہے۔ شیخ عبدالرحمان نے اطمینان سے کہا "جا کے دریافت کرو کہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس خاندان اور کس سلسلے سے تعلّق رکھتا ہے؟"

شیخ کے خدّام نے موقع پر پہنچ کے سلطان باہوؒ کو دیکھا تو فوراً پہچان گئے اور اُلٹے قدموں شیخ کے پاس پہنچے "سرکار! وہی درویش ہے جسے آج آپ نے فیض بخشا تھا۔"

شیخ عبدالرحمان نے حکم دیا "اُسے فوراً یہاں لے آؤ۔"

اس طرح سلطان باہوؒ دوسری بار شیخ کے پاس پہنچے۔ شیخ نے اُنھیں دیکھتے ہی ملول لہجے میں کہا "باہوؒ! کیا ہم نے یہ نعمت تجھے اس لیے دی تھی کہ تو اسے عام کرتا پھرے؟"

سلطان باہوؒ نے ادب سے کہا "سیّدی! کوئی عورت بازار سے توا بھی خریدتی ہے تو اُسے ٹھونک بجا کے دیکھ لیتی ہے کہ کیسا ہے اور کوئی لڑکا لکڑی کی کمان بھی خریدتا ہے تو کھینچ تان کے اُس کی لچک دیکھ لیتا ہے کہ درست ہے یا نہیں پھر بھلا خادم نے آپ سے جو نعمت حاصل کی ہے، کیا اُس کی آزمائش نہ کرتا؟"

شیخ عبدالرحمان متبسّم ہوئے "میں منع نہیں کرتا۔ یہ نعمت اسی لیے ہے کہ عام کی جائے لیکن اسے ارزاں نہ کر۔ اس کا متحمّل ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کے انھوں نے سلطان باہوؒ پر مزید توجّہ دی اور انھیں

وطن واپس جا کے رشد و ہدایت کی محفل سجانے کا حکم دیا۔

سلطان باہو نے شور کوٹ پہنچ کے زور و شور سے تلقین و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تاریک راہوں کے بھٹکے ہوئے مسافر قافلوں کی صورت میں آتے اور قافلے کا ہر شخص آنکھوں میں مشعلیں روشن کر کے واپس جاتا۔ سلطان باہو کی خانقاہ میں ہر وقت درویشوں کا ہجوم رہتا۔ لنگر خانے کا اہتمام و انصرام بی بی راستی نے سنبھال لیا تھا۔ جاگیر اور کھیتی باڑی کا انتظام سلطان باہو نے اپنے معتمد مریدوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اپنی ذات کے لیے وہ آبائی جاگیر سے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے۔ رُوکھا سُوکھا کھاتے، موٹا جھوٹا پہنتے اور اسی پہ قانع رہتے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں صرف دو دفعہ بیل خرید کے کھیتی باڑی شروع کی لیکن فصل پکنے سے پہلے ہی کھیت چھوڑ کے چلے آئے۔ بیل بھی جس کا دل چاہا لے گیا۔

شور کوٹ کے کسی قریبی علاقے کا ایک خاندانی رئیس قلاّش ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک مقامی بزرگ سے اپنی بپتا بیان کی کہ "اب صرف سفید پوشی رہ گئی ہے، فاقوں نے گھر دیکھ لیا ہے، دروازے پر قرض خواہوں کا جمگھٹا رہتا ہے، بچوں کی شادیاں اور دوسرے فرائض مفلسی کے سبب التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟"

بزرگ نے قلاّش رئیس سے کہا "چناب کے کنارے شور کوٹ جاؤ۔ وہاں سلطان باہو ملیں گے۔ اپنی مشکلات اُن سے بیان کرنا۔"

وہ شخص اپنے رفیقوں اور ملازموں کے ساتھ کئی میل کا سفر کر کے شور کوٹ پہنچا۔ وہاں اُس نے لوگوں سے سلطان باہو کا پتہ دریافت کیا۔ سلطان باہو اُس وقت اپنے کھیت میں تھے۔ لوگوں نے اُسے کھیت کا پتہ بتا دیا۔ وہ کھیت میں گیا تو سلطان باہو ہل چلا رہے تھے۔ اُس شخص نے انھیں ہل چلاتے ہوئے دیکھا تو سخت مایوس ہوا اور سوچنے لگا کہ جو آدمی خود مفلسی میں گرفتار ہے اور ہل چلا رہا ہے، وہ بھلا میری مدد کیا کرے گا۔ یہ سوچ کے وہ وہاں سے لوٹنے لگا۔ اچانک پشت سے کسی نے اُسے اُس کا نام لے کے پکارا۔ وہ بہت متعجب ہوا کہ یہاں تو میں قطعاً اجنبی ہوں، میرا نام کسے اور کیسے معلوم ہو گیا؟ وہ مُڑا تو اُس نے دیکھا کہ سلطان باہو اُسے بلا رہے ہیں۔ اُس کے دل میں اُمید کی بجلی کوندی۔ وہ سلطان باہو کے قریب گیا۔ انھوں نے اُس سے کہا "تو سفر کی سختیاں سہتا ہوا اتنا فاصلہ طے کر کے آیا ہے، ہم سے ملاقات کیے بغیر کیوں جا رہا ہے؟"

اُس شخص نے دست بستہ ہو کے اپنی خستہ حالی کی داستان سُنا دی۔ سلطان باہو نے اُسی وقت زمین سے ایک ڈھیلا اٹھا کے دوبارہ زمین پر دے مارا۔ اُس شخص نے زمین پر نظر ڈالی تو انگشت بدنداں رہ گیا کیونکہ زمین پر پڑے ہوئے تمام ڈھیلے اور پتھر سونے کے ہو گئے تھے۔ سلطان باہو نے نہایت بے نیازی سے کہا "اپنی ضرورت کے مطابق سونا اُٹھا لے۔"

اُس شخص نے اپنے ساتھیوں کو بھی وہیں بلوا لیا۔ اُن سب نے اپنے اپنے گھوڑوں پر وافر سونا لاد لیا پھر سونے اور سلطان باہو کے احسان کے بوجھ میں دبے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

★

سلطان باہو نے کتابی علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن اُن کا رُوحانی علم ایک موّاج سمندر تھا یہی وجہ ہے کہ فقر، تصوّف اور معرفت پر اُن کے ملفوظات کا ذخیرہ آج بھی طلبہ کے لیے ایک جیتے جاگتے مدرّس کی حیثیت رکھتا ہے۔ شریعت، طریقت اور حقیقت جیسے دقیق اور نازک موضوعات پر کم و بیش تیس تالیفات اُن سے منسوب ہیں۔ ایک کتاب میں وہ کہتے ہیں "لوگو! میں نے جو کچھ دیکھا، ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا جو سر میں ہوتی ہیں اور اس ظاہری جسم سے دیکھا اور مشرّف ہوا۔"

وہ اپنی تالیف "عقلِ بیدار" میں فقر کے متعلّق کہتے ہیں "فقر کی ابتدا یہ ہے کہ جسم پر شریعت کا لباس پہنا جائے اور حقیقت سے واقف ہو کے معرفت کے دریا میں غوطہ لگایا جائے اور فقیر خود کو فراموش کر کے فنا فی اللہ ہو جائے۔"

جذب و سلوک کے شیدائی فیض و برکت کے لیے دُور دُور سے سلطان باہو کے پاس آتے تھے کیونکہ اُن کی شہرت اطراف و جوانب میں کوسوں تک پھیل چکی تھی۔ سندھ کے موضع گھوٹکی کے ایک کلال یعنی مَے فروش نے بھی سلطان باہو کا شہرہ سُنا تھا۔ اُسے اُن سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ چنانچہ ایک روز اُس نے کاروبار سمیٹا اور سندھ سے پنجاب کا رُخ کیا۔ شور کوٹ پہنچ کے وہ سیدھا سلطان باہو کے پاس آیا۔ سلطان باہو نے اُسے دیکھتے ہی کہا "کلال! اب تک تو تُو دوسروں کو شراب پلاتا تھا لیکن آج ہم تجھے شراب پلائیں گے۔" یہ کہہ کے انھوں نے اُس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ اُن کی نگاہ کے فیضان سے کلال کی دنیا چشم زدن میں منقلب ہو کے رہ گئی اور وہ ایک قطعی دوسرا آدمی بن گیا۔

پھر جب وہ شور کوٹ سے گھوٹکی واپس پہنچا تو اُس کے متعلّقین تک اُسے شناخت نہیں کر سکے کیونکہ اب وہ ایک نفع خور اور فاسق و فاجر کلال نہیں رہا تھا بلکہ ایک قانع اور عابد و زاہد شخص ہو گیا تھا۔ ویسے تو گھوٹکی کے بھی باشندے اُس کی قلبِ ماہیت پر حیران تھے مگر خصوصاً ایک بیوہ عورت اُس کی اس تبدیلی سے بے حد متاثر تھی۔ اُس بیوہ کا ایک لڑکا موسن شاہ تھا۔ ایک روز وہ بیوہ اپنے یتیم لڑکے کو لے کر کلال کے پاس گئی اور بولی "بھیّا! انھوں نے تمھاری دنیا بدل دی ہے، اب تم اُن کے

سب تنگ

پاس دوبارہ جاؤ تو میرے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لیتے جانا اور مجھ دکھیاری کی طرف سے میاں سے کہنا کہ میاں! میں بہت مسکین ہوں۔ فاقوں اور محتاجی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گئی ہوں۔ میرے بیٹے کو مفلسی سے نجات دلا دیجئے اور اس کی آخرت بھی سنوار دیجیے۔"

کلال نے وعدہ کر لیا کہ وہ موسن کو شور کوٹ ضرور لے جائے گا۔

پھر جب وہ دوسری بار سلطان باہو کے پاس روانہ ہوا تو اپنے وعدے کے مطابق موسن کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ سلطان باہو کے پاس پہنچ کے اُس نے موسن کو اُن کے سامنے پیش کیا اور اُس کی ماں کا پیغام دُہرا دیا۔ سلطان باہو نے موسن پر شفقت کی نظر ڈالی اور کہا "اس کی ماں سے کہہ دینا کہ دینی اور دُنیوی، دونوں نعمتیں ہمیشہ اُس کے گھر میں رہیں گی لیکن بچّے کی عمر ابھی کم ہے اس لیے وہ فی الحال اسے اپنے پاس رکھے اور پہلے اسے ظاہری تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے، اس کے بعد ہمارے پاس بھیجے۔"

موسن واپس گھوٹکی لے جایا گیا۔ اُس کی ماں نے اُسے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ لڑکا بہت ذہین ثابت ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ دل جمعی سے پڑھتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ چند سال بعد وہ مدرسے سے فارغ التحصیل ہو گیا چنانچہ اُس کی ماں نے اُسے کلال کے ساتھ پھر سلطان باہو سے ملنے کے لیے روانہ کر دیا۔ موسن اور کلال شور کوٹ جانے کے لیے گھوٹکی سے نکلے مگر ابھی رنگ پور کھیڑا ہی پہنچے تھے کہ اچانک ایک دل دوز خبر بجلی بن کے اُن کے اعصاب پر گری۔ معلوم ہوا کہ سلطان باہو رحلت کر چکے ہیں۔ کلال اس جاں کاہ خبر کی تاب نہ لا سکا، وہ کھڑے کھڑے زمین پہ ڈھیر ہوا اور اُس کی روح عنصری قفس سے پرواز کر گئی۔ ناچار موسن شاہ اکیلا ہی روتا دھوتا، گرتا پڑتا آگے بڑھا اور کسی نہ کسی طرح سلطان باہو کے مزار پر پہنچ گیا۔ سلطان باہو کے بیٹے فرشِ ماتم بچھائے بیٹھے تھے۔

موسن شاہ نے مزار پر سینہ کوبی شروع کر دی اور رو رو کے کہنے لگا "حضرت! اگر جانا ہی تھا تو مجھے کیوں بلایا تھا؟ مجھے کیوں بلایا تھا؟ مجھے کیوں بلایا تھا؟"

اُس کی سینہ کوبی اور فریاد نے سلطان باہو کے فرزندوں کو اُس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اُن کے ایک فرزند نے قریب پہنچ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا "کیا تمھارا نام موسن شاہ ہے؟" موسن شاہ نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ سلطان باہو کے فرزند نے اُسے اطمینان سے بٹھایا اور کہا "موسن شاہ! واویلا نہ مچاؤ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے والد نے تمھیں کیوں بلایا تھا۔ وصال سے پہلے انھوں نے کہا تھا کہ جنوب کی طرف سے موسن شاہ نامی ایک طالب آ رہا ہے، وہ خاص نعمت کا مستحق ہے اُسے خاص نعمت دینا۔ میرے منہ سے نکلا کہ "ابّا! خاص نعمت کے طور پر اُسے کیا دینا چاہیے؟ اُن کے پاس وقت کم تھا، انھوں نے چٹائی پہ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا اور زمین پر کچھ لکھ دیا۔ اُن کے لکھے ہوئے پر میں نے مٹی کی رکابی ڈھانک دی تاکہ تحریر ہوا سے محفوظ رہے۔" یہ کہہ کے سلطان باہو کے بیٹے نے قریب ہی زمین پر اُلٹی ہوئی رکابی ہٹائی تو موسن نے دیکھا کہ وہ اسمِ ذات کا نقش ہے نقش دیکھتے ہی موسن بے ہوش ہو گیا۔ سلطان باہو کے فرزند نے نقش دوبارہ رکابی سے ڈھانک دیا۔ موسن شاہ مسلسل تین دن اور تین رات تک وہیں بے ہوش پڑا رہا اور جب ہوش میں آ کے اُس نے دوبارہ اسمِ ذات کے نقش پر نظر ڈالی تو پھر بے ہوش ہو گیا۔ یہ بے ہوشی دو دن اور دو رات طاری رہی۔ بعد ازاں اُس نے تیسری دفعہ نقش دیکھا تو پھر ایک دن اور ایک رات مست رہا۔ مگر چوتھی مرتبہ اُس نے نقش دیکھا تو مستی غالب نہ آ سکی۔ گویا نعمت نے دل میں قرار پکڑ لیا تھا۔

سلطان باہو کے فرزندوں کو جب یقین ہو گیا کہ نعمت موسن شاہ کے دل میں قرار پکڑ چکی ہے تو انھوں نے نقش کی خاک پانی میں گھول کے انھیں پلا دی۔ اس طرح موسن شاہ ارشاد و تلقین کی دولت حاصل کر کے وہاں سے رخصت ہوئے اور گھوٹکی پہنچ کے مخلوق کو فیض پہنچانے لگے۔ کہتے ہیں، موسن شاہ نے تقریباً ایک لاکھ تشنہ کاموں کو رشد و ہدایت کے مشروب سے سیراب کیا۔ اُن کے لنگر خانے میں ہر وقت اژدہام رہتا تھا۔ وہ سلطان باہو سے شدید محبّت کرتے تھے۔ سچّا مجنوں وہی ہوتا ہے جسے لیلا تو لیلا، لیلا کی گلی کا کتّا بھی عزیز ہو۔ موسن شاہ کا حکم تھا کہ جب بھی پنجاب کی جانب سے کوئی مہمان آئے تو انھیں فوراً مطلع کیا جائے۔ مرشد کے علاقے سے آنے والے مہمانوں کی خدمت وہ اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ کھانا کھلانا، بستر بچھانا، پاؤں دبانا، غسل وغیرہ کے لیے پانی بھرنا اور اُسے گرم کرنا نیز دیگر خدمات۔ اس کام میں انھیں بے انتہا فرحت حاصل ہوتی تھی۔

موسن شاہ کے بعد اُن کے فرزند صالح شاہ سجّادہ نشیں ہوئے۔ صالح شاہ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں حیدرآباد کے حاکم میاں غلام شاہ کلھوڑا نے انھیں گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا۔ صالح شاہ نے زنداں سے رہائی کی بہت تدبیریں کیں لیکن کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوئی۔ آخر صالح شاہ ایک رات سلطان باہو کی روح سے فریاد کناں ہوئے کہ "حضرت! غلام کی دست گیری کیجیے۔"

اُسی رات سلطان باہو حیدرآباد کے حاکم غلام شاہ کے خواب میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے اُسے شاہی بستر سے کھینچ کے اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ غلام شاہ منہ کے بل فرش پر گرا، ساتھ ہی اُس کی بینائی زائل ہو گئی۔ سلطان باہو نے اُس سے باز پرس کی کہ "آخر صالح شاہ کو تو نے کیوں قید کیا؟"

حاکم نے کوئی جواز پیش کرنے کے بجائے گڑگڑا کے معافی مانگی اور سب تنگ

التجا کی کہ اُس کی بینائی بحال کردی جائے۔ سلطان باہو نے اُس کی التجا قبول کرتے ہوئے کہا: "تو نے ایک بے قصور کو قصور وار ٹھیرا کے اُسے اور ہمیں سخت اذیت پہنچائی ہے۔ تو انصاف کی مسند کے لائق نہیں ہے، جا، تخت تیرے خاندان سے اُٹھ گیا۔"

غلام شاہ نے یہ سنا تو گھبرا کے بیدار ہوگیا اور شدید بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے صالح شاہ کو رہا کر دیا اور غیر معمولی اکرام و نوازش کے ساتھ رخصت کیا۔

سلطان باہو کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ غلام شاہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا اور جلد ہی کلھوڑا خاندان کو زوال آگیا۔ اُس کے بعد تالپور خاندان اقتدار کی کرسی پر بیٹھا اور کلھوڑا خاندان پھر کبھی حکمراں نہیں ہو سکا۔

سلطان باہو نے ۱۱۰۲ھ ہجری میں اس دنیا سے پردہ کیا تھا لیکن اُن کے فیوض کا چشمہ وصال کے بعد بھی جاری رہا۔ شلاً ڈیرا اسماعیل خاں کے حاکم ہوت بلوچ کا واقعہ ہے، وہ کسی خوب رُو لڑکے پر فریفتہ ہوگیا تھا اور اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے اپنے زمانے کے مقتدر علما کو بلوایا اور اُن سے اصرار کیا کہ وہ ایک مرد کے لیے لڑکی کے بجائے لڑکے سے نکاح کرنے کا فتوا دے دیں۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی کہ اگر انھوں نے فتوا نہ دیا تو انھیں دار پہ لٹکا دیا جائے گا۔ علما بے حد سٹ پٹائے۔ دربار سے نکل کے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور مشورے کے بعد حاکم کو اطّلاع بھجوائی کہ انھوں نے اس مسئلے کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔ فوراً طلبی ہوئی۔ علما دربار میں پہنچے اور سب نے متفقہ طور پہ ہوت بلوچ سے کہا کہ یہاں ایک بزرگ عالم نور محمدؐ موچی رہتے ہیں، انھیں طلب کیا جائے، اس نازک اور پیچیدہ معاملے کا کوئی جواز وہی پیدا کر سکتے ہیں۔

نور محمدؐ موچی سلطان باہو کے سلسلے سے وابستہ تھے۔ ہوت بلوچ نے انھیں بلوایا اور اپنا مدّعا اُن کے سامنے رکھ دیا اور انھیں بھی قتل کی دھمکی دی مگر نور محمدؐ نے نہایت بے خوفی سے کہا: "بدمست حاکم! ہوش میں آ۔ مرد کے لیے لڑکی کے بجائے لڑکے سے نکاح کرنا مطلق حرام ہے۔"

ہُوت بلوچ یہ صریح جواب سن کے چراغ پا ہوگیا۔ اُس نے اُسی وقت تالی بجا کے سپاہیوں کو طلب کیا اور انھیں حکم دیا کہ "مولانا نور محمدؐ کو گرفتار کر لیا جائے۔"

نور محمدؐ فوراً حراست میں لے لیے گئے۔ ہُوت بلوچ نے گرج کے اُن سے کہا: "مولانا! یاد رکھو۔ اگر تم نے جلد ہی میری منشا کے مطابق فتوا نہ دیا تو تمھیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔"

نور محمدؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قید خانے پہنچ کے انھوں نے سلطان باہو کی روح سے رجوع کیا اور فریاد کے طور پر پنجابی میں ایک نظم لکھی۔ اُن کی فریاد رائگاں نہیں گئی۔ ہوت بلوچ جلد ہی معزول کر دیا گیا اور شاہی سپاہیوں نے اُسے قید کر لیا۔ اُس کی موت قید خانے ہی میں واقع ہوئی۔ دوسری طرف نور محمدؐ آزاد کر دیے گئے

◉

شیخ سلطان باہو موضع قہر گان میں پکّی اینٹوں کے ایک قلعے میں مدفون تھے۔ ایک بار دریائے چناب میں زبردست طغیانی آئی۔ پانی بڑھتے بڑھتے قلعے تک پہنچ گیا۔ مریدوں نے پانی کے خوف سے نہایت عجلت میں سلطان باہو کا مزار کھودا تاکہ اُن کی باقیات کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیں مگر جب مزار کھُد چکا تو حاضرین ششدر رہ گئے۔ وہاں شیخ کی باقیات کا نام و نشان نہ تھا۔ اُن کے مرید مایوس ہو کے رونے لگے مگر اس سے پہلے کہ اُن کے آنسو دریا کے پانی میں اضافہ کرتے، شیخ بہ نفسِ نفیس ظاہر ہوئے اور بولے: "نادانو! بھلا یہ رونے کا وقت ہے؟ کچھ ہوش بھی ہے؟ یہ مقام جلد غرقاب ہونے والا ہے۔ اگر ہمارے نشانات مٹ گئے تو تمھاری جماعت پریشان و پراگندہ ہو جائے گی لہٰذا ہم باہر ضرور نکلیں گے مگر جو شخص ہمارے نئے مدفن کا انتخاب کرنے اور ہمارا جسم چھُونے کے لائق ہے، وہ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت یہاں پہنچے گا، اُس کا انتظار کرو۔"

مرید بے قراری سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب صبح کی پہلی کرن پھُوٹی تو انھوں نے ایک سبز پوش کو آتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ سبز پوش قریب آیا اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کھلی قبر میں اُتر گیا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر نکلا تو اُس کے ہاتھوں میں سلطان باہو سو رہے تھے۔ انھیں پہلے سے تیار شدہ ایک تابوت میں لٹا دیا گیا۔ پھر سبز پوش کی رہنمائی میں تابوت ایک ویران حویلی تک لے جایا گیا۔ یہ حویلی آسیب زدہ مشہور تھی۔ سبز پوش کے اشارے پر تابوت حویلی کے وسط میں رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد لوگوں نے قبر کھودنی چاہی لیکن سبز پوش نے منع کر دیا چنانچہ زمین کی سطح ہی پر مزار تعمیر کر دیا گیا۔ آج تک وہی مزار شیخ باہو کی آرام گاہ ہے۔

باہو پہنچے تو وہ ویران حویلی جو آسیب زدہ مشہور تھی، انتہائی بارونق ہوگئی۔ آج بھی وہاں جذب و مستی کا غلغلہ ہوتا ہے اور خوشبوؤں کے جھونکے چلتے ہیں اور اُن کی جستجو میں روزانہ ہزارہا سائل وہاں پہنچتے ہیں۔ باہو کسی کو محروم نہیں لوٹاتے۔





سمندر پار سے ۳ شوخ، شریر، سنگین، رنگین، مختصر مختصر کہانیاں

شمشیر

گریس ہیسٹنگ ✦ فوزیہ ناہید

بہتر ہے، اسے دوبارہ پڑھ لیجیے

ایک پرانا قصہ جو ہمیشہ لوگ بھول جاتے ہیں

میں اپنے ایک دوست میکس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے میکس نے خود مجھے بلایا تھا۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں نے استفہامی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا معاملہ ہے میکس! خیریت تو ہے؟"

"ہاں ٹام! خیریت تو ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ میری بہن کی جوان لڑکی آ گئی ہے۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اس کی بھانجی نہ آئی ہو بلکہ قیامت آ گئی ہو۔ "وہ مجھے پورے پچھتر ہزار ڈالر کا نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"پچھتر ہزار ڈالر؟" میں نے حیرت سے ہونٹ سکوڑے اور دھیمی سیٹی بجائی۔ "وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ بیس سال پہلے۔" میکس نے وضاحت کی۔ "میری بہن نے ایک اوباش قسم کے لڑکے سے دوستی کر لی تھی۔ میرے والد نے اس لڑکے کو سخت ناپسند کیا اور میری بہن کے سامنے اسے سخت سست بھی کہا۔ میری بہن اپنے دوست کی اس بے عزتی پر بہت ناراض ہوئی۔ وہ ایک باغی اور سرکش لڑکی تھی۔ اس نے ضد میں آ کے اس اوباش لڑکے سے یہاں تک دوستی بڑھائی کہ ایک لڑکی پیدا کر بیٹھی۔ یہی وہ لڑکی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ میری ضدی بہن نے اسے پیدا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ ایک اور انتہا پسندانہ قدم اٹھایا کہ گھر سے بھاگ گئی۔"

"کس کے ساتھ؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا اپنے اسی اوباش دوست کے ساتھ؟"

"نہیں جی۔" میکس نے جھنجلا کے کہا۔ "وہ اوباش تو بچی کی پیدائش

سے پہلے خود میری بہن کو بے سہارا چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔ اُس کے بھاگنے کے بعد میری بہن نے ایک اور لفنگے سے دوستی کرلی اور والد سے انتقام لینے کی غرض سے اُسی کے ساتھ فرار ہوگئی تاکہ والد کی زیادہ سے زیادہ بے عزتی ہوسکے۔"

"اوہ سمجھ گیا۔" میں نے ہمدردی اور افسوس کے لہجے میں کہا۔ "یہ پچھتر ہزار کا کیا قصہ ہے؟"

"میرے والد نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی تمام جائداد میرے نام کردیں گے اور انھوں نے ایسا کیا بھی تھا مگر مرنے سے دو سال پہلے انھوں نے اچانک اپنی وصیت میں تھوڑی سی تبدیلی کردی تھی اور پچھتر ہزار ڈالر میری بھانجی کے نام کردیے تھے۔ دراصل اس لڑکی سے انھیں ہمدردی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ماں باپ کے گناہ کی سزا اسے کیوں ملے۔ البتہ وصیت میں انھوں نے ایک شرط رکھ دی تھی کہ اس لڑکی کو پچھتر ہزار ڈالر صرف اس صورت میں ملیں گے کہ یہ اپنی ماں کے برعکس شریفانہ زندگی گزارے اور اکیس سال کی ہونے سے پہلے کسی معقول مرد سے شادی کرلے۔ میرا قانونی مشیر ایک مدت سے اس لڑکی کی تلاش میں تھا لیکن یہ نہ جانے کہاں غائب تھی۔ بہرحال اب یہ خود بخود واپس آگئی ہے۔"

"کیا اُس کی عمر ابھی تک اکیس سال سے کم ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور کیا اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے؟"

میکس نے سر ہلایا۔ "آج سے ٹھیک ایک مہینے بعد اُس کی عمر اکیس سال ہوجائے گی۔ ممکن ہے اس ایک مہینے میں وہ شادی رچالے۔ اس کا نتیجہ جانتے ہو ٹام؟ تمھارا دوست بیٹھے بٹھائے پچھتر ہزار ڈالر کی خطیر رقم سے محروم ہوجائے گا۔"

"اس سلسلے میں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو میکس؟" میں نے ہمدردی سے دریافت کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کی دیکھ بھال تم کرو۔ یہ کم سے کم ایک مہینے تک کسی طرح شادی نہ کرنے پائے اور کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوسکے کہ اس کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ یہ کام تمھیں بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ اگر یہ ایک مہینہ خیریت سے گزر گیا تو پھر کبھی اسے میری جائداد سے کچھ نہیں ملے گا اور میں تنہا پوری جائداد کا مالک بن جاؤں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "ہے تو مشکل کام مگر تمھاری خاطر اسے انجام دینا ہی پڑے گا۔ سچا دوست وہی ہوتا ہے جو مشکلات میں کام آئے۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "مگر میری اس خدمت کے عوض میرے لیے تم کیا کرو گے؟"

"اگر تم کامیاب رہے تو میں وعدہ کرتا ہوں پانچ ہزار ڈالر تمھارے ہوں گے۔ تمھارے ہاتھ پاؤں میں تنگ ہے۔" میکس نے کہا۔ "اگر تم پسند کرو گے تو میں تمھارے لنگڑے پن کی بیمہ پالیسی بھی خرید دوں گا پھر تمھیں آخری عمر میں مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ویسے بھی اُس نے میرے ساتھ کبھی مذاق نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مجھے اُس سے کسی پست مذاق کی توقع تھی۔ ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ میکس کی بھانجی وہاں پہنچ گئی۔ میکس نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا اور لڑکی سے کہا۔ "انجیلا! میں چند روز کے لیے ایک کاروباری دورے پر جا رہا ہوں۔ اس دوران میں تمھاری دیکھ بھال میرے عزیز دوست ٹام کریں گے۔ تم جو کچھ بھی معلوم کرنا چاہو، ان سے معلوم کرسکتی ہو۔ یہ تمھارے لیے ہر معاملے میں مددگار ثابت ہوں گے۔"

انجیلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک سرکش لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس کا چہرہ خاصا دل کش تھا۔ خصوصاً آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سی لڑکی نظر آتی تھی اور ذوق کے لحاظ سے بھی اُس میں کوئی خصوصیت معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"انجیلا! تم نے اپنے ماموں کو کس طرح ڈھونڈا؟" میں نے دوپہر کے کھانے پر اُس سے پوچھا۔ یہ لذیذ اور قیمتی کھانا میکس کے خرچ پر ہو رہا تھا۔ لڑکی اس خاطر تواضع سے بہت خوش نظر آتی تھی۔

"ممی نے اپنے خاندان کے متعلق مجھے کبھی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔" اُس نے خالص امریکن لہجے میں کہا۔ "لیکن جب گزشتہ مہینے اُن کا انتقال ہوا تو مجھے اُن کے سامان میں چند کاغذات ملے۔ انھی کاغذات سے مجھے ماموں میکس کے بارے میں معلوم ہوا۔"

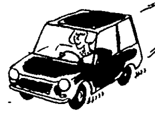
"کاغذات؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیسے کاغذات؟"

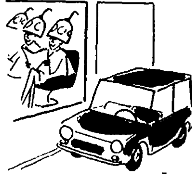
"وہ عام قسم کے گھریلو کاغذات تھے۔ اُن میں ایک جگہ ماموں میکس کا پتہ بھی لکھا ہوا تھا۔ ماموں ایک اشاعتی ادارے کے مالک ہیں نا؟"

میں خاموش رہا۔ میکس کے اشاعتی ادارے کا حال مجھ سے مخفی نہیں تھا۔ اُس نے اب تک صرف ایک کتاب شائع کی تھی اور وہ ایک کتاب بھی چوری چھپے فروخت ہو رہی تھی کیونکہ اُس میں اسی قسم کا مواد تھا۔ میں جانتا تھا کہ میکس نے اس کتاب سے خاصا کمایا ہے لیکن ایسی کمائی مستقل نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسی کتابیں شائع کرنے والے لوگ کامیاب ناشر ہوتے ہیں۔

انجیلا نے کہا۔ "مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ یہی سوچ کر تو میں یہاں آئی ہوں کہ ماموں میکس اس سلسلے میں میری مدد کریں گے۔" اُس نے اپنا بیگ کھولا اور ایک مسودہ نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں انجیلا کو پورے ایک مہینے تک اس طرح مصروف رکھنا چاہتا تھا کہ اُس کے ذہن میں شادی کا خیال







تک نہ آئے۔ میں نے مسودہ اُٹھا کر دیکھا اور مصنوعی حیرت سے کہا "کیا یہ تم نے لکھا ہے؟"

"یقیناً۔ یہ میری ہی تحریر ہے۔"

"اوہ اس کم عمری میں اتنی اچھی تحریر۔" میں نے خود پیچ و تاب کھاتے ہوئے بے وجہ تعریف کی "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ یہ تو بہت اچھا مسودہ ہے جینی۔"

وہ میز پر جھک کے خود اعتمادی سے بولی۔ "میں دراصل اسی مقصد سے یہاں آئی ہوں۔ میں یہ مسودہ فروخت کر کے معقول معاوضہ حاصل کروں گی پھر کسی اچھے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد باقاعدگی سے لکھنا شروع کروں گی۔ تاکہ اپنی تحریروں کے عوض زیادہ سے زیادہ رقم کما سکوں۔"

"خوب۔ میں تمہارے عزائم کی داد دیتا ہوں تم بہت ذہین لڑکی ہو۔" میں نے تعریف کی "لیکن سنو ان عزائم کی تکمیل کے لیے ہمیں اور تمہیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم تمہیں ایک مصنفہ کی حیثیت سے علمی حلقوں میں متعارف کرائیں گے۔ اس سلسلے میں تمہیں خود بھی بہت محنت کرنی پڑے گی۔ ادبی محفلوں میں کثرت سے شرکت کرنی ہوگی۔ تمہاری یہ کتاب جلد از جلد شائع کر کے دھوم دھام سے اس کی افتتاحی تقریب منعقد کی جائے گی پھر اسے بڑی بڑی دکانوں میں نمائش کے لیے رکھوایا جائے گا۔ ساتھ ہی ہمیں تمہاری دوسری کتابوں کا بھی اعلان کرنا پڑے گا پھر جب تمہارے بارے میں چند معتبر نقادوں کی رائے حاصل ہو جائے گی تو تمہیں ایک بہترین مصنفہ ثابت کرنے کے لیے ہم اپنے تمام وسائل صرف کر دیں گے پھر اپنی اور ہماری کوششوں سے جب تم ایک مستند اور مشہور مصنفہ بن جاؤ گی تو ملک کا اچھے سے اچھا نوجوان خود تم سے شادی کی خواہش کرے گا۔"

انجیلا کے گال تمتمانے لگے۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ میں ایک بہترین اور مشہور مصنفہ بن سکتی ہوں۔"

"یقیناً۔ تمہاری تحریر اس امر کی گواہ ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا "کیا خیال ہے تم ایک مہینے میں ایک نیا ناول لکھ سکتی ہو؟"

"ہاں۔ میں کوشش کروں تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔"

"میں تمہارے لیے ایک پُرسکون مقام کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ وہاں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا اور کوئی تمہارے کام میں حارج نہیں ہوگا۔ میں تمہارے لیے ایک خاتون ٹائپسٹ کا انتظام بھی کر دوں گا۔"

"اوہ بہت بہت شکریہ۔" انجیلا نے کہا "لیکن مجھے اپنی تحریر کے بارے میں رائے کس طرح معلوم ہوگی؟ میں تو شہر سے دور کسی پُرسکون مقام پر بیٹھی ہوں گی۔ وہاں کون رائے دینے آئے گا مجھے؟"

"فکر نہ کرو، اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا تم جو کچھ لکھو اس کی ایک نقل روزانہ مجھے بھجوا دینا۔ اس طرح ناول چھاپنے والوں کو بھی سہولت رہے گی میں بلاناغہ تمہیں تمہاری تحریر کے بارے میں بے لاگ رائے بھیجتا رہوں گا۔"

پارک تھائر کے علاقے میں آبادی سے الگ تھلگ میری ایک کٹیا تھی قریب ترین گاؤں بھی اس کٹیا سے میلوں دور تھا، وہاں ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ میں نے میکس کے خرچ پر دودھ غذا اور دوسری ضروری اشیا محفوظ کر کے کٹیا میں پہنچا دیں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ انجیلا کٹیا سے باہر قدم نکالے چنانچہ میں نے ڈاک خانے سے رابطہ قائم کیا اور ایسا بندوبست کر دیا کہ ڈاکیا خود ہر روز کٹیا سے ڈاک لے آئے اور انجیلا کے نام پوسٹ ماسٹر کی معرفت آئی ہوئی ڈاک اس تک پہنچا دے۔

مسز برٹن میری ایک دیرینہ جاننے والی تھی۔ وہ ایک قابلِ اعتماد ٹائپسٹ بھی اور ٹائپسٹ کی حیثیت سے انجیلا کے ساتھ کٹیا میں رہ کر اس کی نگرانی بھی کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور ایک مہینے کے لیے اس کی خدمات حاصل کر لیں نیز اسے تمام اونچ نیچ اچھی طرح ذہن نشین کرا دی۔

دو روز بعد میں نے اپنی کار میں انجیلا اور مسز برٹن کو کٹیا تک پہنچا دیا۔ تیسرے روز سے انجیلا کے کام کی ایک نقل روزانہ ڈاک کے ذریعے مجھے وصول ہونے لگی میں اس کی تحریر پڑھے بغیر ہی اپنی رائے بلاناغہ اسے بھیج

دیتا تھا تاکہ وہ انہماک سے ناول مکمل کرنے میں مصروف رہے اور کوئی دوسرا خیال اُس کے ذہن میں جگہ نہ پا سکے۔

مہینہ ختم ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے کہ مجھے مسز برٹن کی طرف سے ایک خط ملا۔ "مسٹر ٹام! میں آپ کی ہدایت کے مطابق انجیلا کی ہر ممکن نگرانی کر رہی ہوں اگر آپ اسے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی زیادہ سے زیادہ تعریفیں کیجیے۔ یہ آپ کی تعریفوں کا بہت بے چینی سے انتظار کرتی ہے جب تک ڈاکیا اسے خط نہیں دے جاتا، یہ عموماً کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی، آپ کا خط ملنے کے بعد ہی مسودہ مکمل کرنے کے لیے میرے پاس بیٹھتی ہے۔" مسز برٹن کا مشورہ معقول تھا۔ میں نے خط کے بجائے تار بھیجنے شروع کر دیے۔

انجیلا وعدے کی پکّی نکلی۔ اُس نے مسودہ بروقت مکمل کر دیا۔ ناول کا آخری باب مجھے مہینے کے آخری دنوں میں مل گیا لہٰذا میں نے ٹائپ کیے ہوئے دو سو کاغذات میکس کے سامنے میز پر رکھے اور کہا۔ "دیکھو میکس! یہ لڑکی ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔" میں نے بائیں آنکھ دبائی۔ "ہمارے لیے ناول لکھ رہی ہے۔"

میکس نے میرے کارنامے پر خوش ہو کے دراز سے چیک بک نکالی لیکن ابھی اُس نے چیک لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ مسز برٹن طوفان کی طرح تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ "بس آخری باب مکمل کرنے کی دیر تھی۔" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "وہ وہاں سے نکلی اور اُس نے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "کب؟"

"دو روز پہلے۔"

"کیسے؟ کس سے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اُس نے کس سے شادی کی؟"

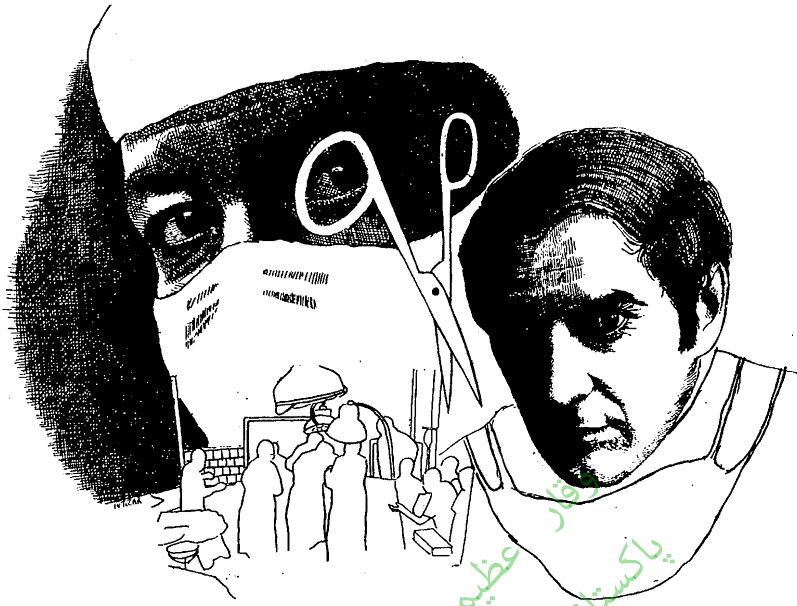
مسز برٹن جواب دینے کے بجائے مجھے گھورنے لگی میکس غرّایا۔ "آخر تم بولتیں کیوں نہیں؟"

مسز برٹن نے اپنی چھتری سے میری طرف اشارہ کیا۔ "انھی سے معلوم کیجیے مسٹر میکس! سب انتظامات انھوں نے خود کیے تھے۔" میکس اچھل پڑا اور ایک دم میرا گریبان پکڑ کے مجھے بُری طرح جھنجوڑنے لگا۔

"نہیں نہیں مسٹر برٹن اُسے پیچھے کھینچتی ہوئی چلائی۔ "انجیلا نے ان سے شادی نہیں کی ہے بلکہ اُس نے ایک خاص اجازت نامہ حاصل کیا اور اپنے چاہنے والے کے ساتھ چلی گئی۔"

"چلی گئی؟" میکس نے دُہرایا۔ "میں پوچھتا ہوں وہ کہاں چلی گئی؟ کس کے ساتھ چلی گئی؟ وہ کون کمینہ ہے؟"

مسز برٹن نے ایک طویل سانس لی۔ "وہی ڈاکیا جو ہر روز ڈاک لے کے آتا تھا۔"





ورنان کول مین ✦ عطیہ نسرین علوی

سمندر پار سے دوسری مختصر مختصر کہانی

ایک افریقی جزیرے کے ہر دل عزیز وزیرِ اعظم کا عبرت رنگ واقعہ

وہ سرجن کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایئر کنڈیشنر خراب ہوگیا۔ صرف چند لمحوں بعد ڈاکٹر جان کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اُسے یہاں بیٹھے ہوئے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ چھ بجے صبح ایک نرس نے اُسے جگا کے بتایا تھا کہ ایک ہنگامی کیس کے سلسلے میں اُس کی فوری ضرورت ہے۔

وہ اپنے ملک کی فوج کے ساتھ افریقہ کے ایک نو آزاد جزیرے میں مقیم تھا۔ یہ فوج جزیرے میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ جزیرے کا وزیرِ اعظم شدید بیمار تھا۔ اُسے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ اُس کی حالت بے حد نازک تھی۔ یہ وزیرِ اعظم جزیرے کا ایک مقبول ترین سیاست داں تھا۔ اُس نے غیر ملکی استعمار کے خلاف برسوں اَن تھک جدّوجہد کی تھی۔ لاٹھیاں کھائیں جیلوں میں ما جلا وطن کیا گیا مگر اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ جزیرے کی آزادی دراصل اُسی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ قوم اُس پر جان چھڑکتی تھی مگر مخالف سیاسی گروہ، مفاد پرست اور اقتدار پسند عناصر اُسے قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اور جیسے بھی ممکن ہو، اُسے اپنی راہ سے ہٹانے کے درپے رہتے تھے۔ وزیرِ اعظم پر کئی بار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے لیکن خوش قسمتی سے وہ ہر حملے میں بال بال بچ گیا تھا۔

اعلا حکّام نے فیصلہ کیا تھا کہ چونکہ وزیرِ اعظم کی جان کو مخالفوں کی طرف سے خطرہ رہتا ہے اس لیے اُسے علاج کے لیے ملٹری اسپتال میں رکھا جائے۔ جزیرے میں بغاوت کا دَور دَورہ تھا۔ حکومت کے مخالفوں کی سرگرمیاں شباب پر تھیں اور خطرہ تھا کہ کوئی باغی اس ہر دل عزیز وزیر کو

نقصان نہ پہنچا دے، چنانچہ ملٹری اسپتال کے اردگرد مسلح فوجیوں کا زبردست پہرا لگا ہوا تھا۔

جان نے بیمار وزیر اعظم کا معائنہ کیا تو سمجھ گیا کہ اس کا آپریشن ہونا نہایت ضروری ہے لیکن وہ صرف اپنی ذمّے داری پر آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ جب تک ڈاکٹر بجنکو اسپتال نہ پہنچ جائے وہ آپریشن شروع نہ کرے۔ ڈاکٹر بجنکو مقامی اسپتال کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ حکومت کی طرف سے اُسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً ملٹری اسپتال پہنچ کے وزیر اعظم کے علاج کی ذمّے داری سنبھال لے۔ جان کو ڈاکٹر بجنکو کا شدت سے انتظار تھا۔

وزیر اعظم بہت حساس آدمی تھا۔ وہ جزیرے کی نئی نئی آزادی پر بے حد مسرور تھا اور ایسی تشویش ناک حالت میں بھی مسرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُسے جب یہ معلوم ہوا کہ اُس کے علاج کے لیے ڈاکٹر بجنکو کو مدعو کیا گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اُس نے جان سے پہلے ہی صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف ڈاکٹر بجنکو کو آپریشن کی اجازت دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر جان اُس کے نزدیک ایک نوآموز اور ناتجربہ کار معالج تھا۔ وزیر اعظم مسرت کے اس موقع پر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

ڈاکٹر جان کی پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی گنگنائی۔ اُس نے پیشانی اور گردن سے پسینہ پونچھا اور فون کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر بجنکو کی سیکریٹری اطلاع دے رہی تھی کہ ڈاکٹر ملٹری اسپتال کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ اُس کی ہدایت تھی کہ آپریشن کی ہر تیاری اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی مکمل ہو جانی چاہیے۔

جان نے کمرے کا دروازہ کھولا اور نرس کو آواز دی۔ نرس آئی تو اُس نے اُسے جلدی جلدی چند ضروری احکام دیے اور کہا کہ مریض فی الفور آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا جائے۔ مریض برابر کے وارڈ میں بے سُدھ لیٹا ہوا تھا۔ اُس پر دو گھنٹے سے جاں کنی کی کیفیت طاری تھی۔

نرس مریض کو لینے کے لیے بھاگی اور ڈاکٹر جان اپنی یونی فارم تبدیل کرنے لگا۔ اُس نے آپریشن کے لیے ضروری لباس پہنا اور ڈاکٹر بجنکو کے انتظار میں نقاب اور سفید ٹوپی اٹھائے ہوئے راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس نے نقاب اور ٹوپی بھی پہن لی۔

آپریشن تھیٹر میں اسپتال کا تقریباً پورا عملہ جمع تھا۔ گیس کے سلنڈر کی دیکھ بھال جاری تھی تاکہ وہ کہیں عین موقع پر دھوکا نہ دے جاتے۔ جان نے احتیاطاً دوسرے سلنڈر کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ وہ انتظام کے سلسلے میں کوئی الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

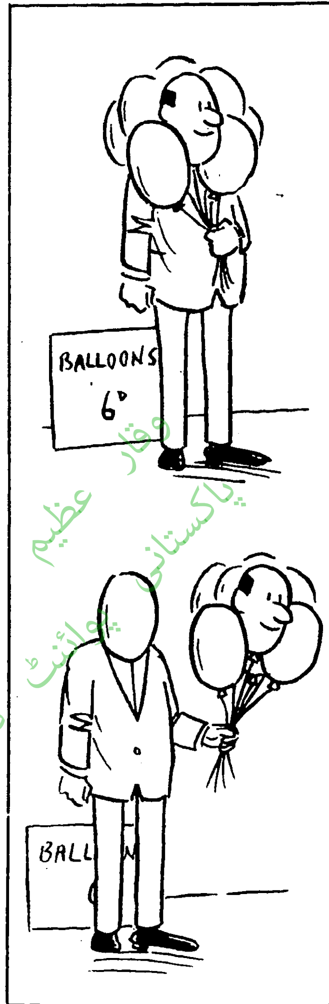
جان نے خوب رگڑ رگڑ کے اپنے ہاتھ اور بازو کہنیوں تک دھوئے۔ اس معاملے وہ بہت محتاط تھا۔ صابن لگانے کے بعد وہ ہاتھ اور بازو دس منٹ تک رگڑتا رہا۔ پھر جب وہ ہاتھوں کی صفائی سے مطمئن ہو گیا تو اُس نے نرس کی طرف دیکھا۔ نرس اُسے یہ بتانے آئی تھی کہ مریض آپریشن تھیٹر میں پہنچ چکا ہے اور ہدایت کے مطابق اُسے بے حسی طاری کرنے والی دوائیں بھی دی جا چکی ہیں۔ جان اب پوری طرح تیار تھا۔ اگر آپریشن صرف چند لمحوں بعد بھی شروع ہو جاتا تو اُس کے انتظامات میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس قسم کے ہنگامی آپریشنوں کے لیے وہ عموماً صرف چند لمحوں میں تیار ہو جاتا تھا اور کام شروع کر دیتا تھا لیکن آج اُسے ڈاکٹر بجنکو کا انتظار کرنا تھا۔

جان اُس سے پہلے ڈاکٹر بجنکو سے کبھی نہیں ملا تھا کیونکہ دراصل فوجی اسپتال کا مقامی اسپتال سے بہت کم تعلق رہتا تھا۔ یہ رابطہ اُسی وقت ہوتا تھا جب کوئی ایسا مریض آ جائے جسے بے پناہ احتیاط سے رکھنے کی ضرورت ہو اور یہ خیال کیا جائے کہ مقامی اسپتال کا عملہ اس مریض کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکے گا۔

وہ انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر بجنکو انتہائی ماہر ڈاکٹر ہو گا۔ اسی وجہ سے وزیر اعظم کے آپریشن کے لیے اُسے بیس میل دُور سے بھیجا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر بجنکو ایک مقامی ڈاکٹر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جزیرے میں اُس سے زیادہ قابل کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ اسی لیے حکّام کی خواہش تھی کہ وزیر اعظم کا آپریشن وہی کرے۔ غالباً اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر آپریشن ناکام ہو جائے تو ناکامی کا الزام فوجی ڈاکٹر پر نہ آئے۔ ڈاکٹر جان نے سوچتے سوچتے اثبات میں سر ہلایا کہ اگر وزیر اعظم کا آپریشن وہ تنہا کرتا اور آپریشن ناکام ہو جاتا تو اُس کی ناکامی سیاسی حلقوں میں افواہوں کا باعث بن سکتی تھی۔ جب اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ وزیر اعظم کے کیس کا نگراں ڈاکٹر بجنکو ہو گا تو اُسے یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی کہ ڈاکٹر بجنکو برطانیہ سے ڈاکٹری کی اعلا تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور اُس کا شمار دنیا کے بہترین سرجنوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بجنکو ملٹری اسپتال پہنچا تو جان دستانے پہن چکا تھا۔ افریقی ڈاکٹر نقاب اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ وہ جان کی طرف دیکھ کے اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا اور اشارہ کیا کہ آپریشن کسی تاخیر کے بغیر شروع کر دیا جائے۔ ڈاکٹر بجنکو نے جلدی جلدی دوبارہ ہاتھ دھوئے۔ گاؤن وہ پہلے ہی پہن چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ دھو کر دستانے پہنے اور جان کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں گیا۔ آپریشن تھیٹر تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔

افریقی ڈاکٹر گھوم کر میز کے دوسری جانب چلا گیا تاکہ آپریشن کے دوران میں وہ ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکے۔ وزیر اعظم کا پیٹ فوراً چاک کر کے کھول دیا گیا۔ پیٹ کھلتے ہی انھیں خون کے اخراج کا سبب معلوم ہو گیا۔ وُہ یہ



اعظم کے پیٹ میں بہت بڑا ناسور تھا۔ جان کو خون کے اخراج کا سبب معلوم ہوا تو اس کے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ اس نے انگلی سے ناسور کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں تیزی سے کام کرنے لگے۔ جان نے ڈاکٹر بجنکو کی یہ خواہش آپریشن شروع ہوتے ہی محسوس کر لی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام جان کرے۔ اسے افریقی ڈاکٹر کی اس خواہش پر حیرت تو ہوئی تھی مگر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر بیشتر کام خندہ پیشانی سے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

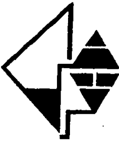
چنانچہ آپریشن کا زیادہ تر کام اسی نے کیا۔ ڈاکٹر بجنکو بس اس کی مدد کرتا رہا۔ جان نے ناسور کی طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر بجنکو نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے دونوں ہاتھ مریض کے کھلے ہوئے پیٹ میں گھسیڑ دیے۔ دونوں خاموشی سے جلدی جلدی کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر جان نے ناسور میں ٹانکے لگائے۔ جب وہ آخری ٹانکا لگا رہا تھا تو ڈاکٹر بجنکو نے جلدی سے قینچی آگے بڑھائی اور دھاگا کاٹ دیا۔ جان نے محسوس کیا کہ یہ حرکت اس سے غیر ارادی طور پر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بجنکو دھاگا کاٹتے وقت جھٹکے کی وجہ سے توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس لیے قینچی اچانک پھسلی اور ناسور میں گہری دھنس گئی۔ ڈاکٹر بجنکو نے جلدی سے قینچی نکالی۔ قینچی نکلتے ہی ناسور سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وزیرِ اعظم نیم بے ہوشی کی حالت کے باوجود درد سے بلبلایا اور خوف زدہ ہو کے اچھل پڑا۔ پھر آناً فاناً اس کے جسم سے خون کا اخراج اس قدر زیادہ ہونے لگا کہ اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔

اسے جلدی سے دوبارہ لٹایا گیا۔ ڈاکٹر جان نے بہت احتیاط سے زخم پر ہتھیلی رکھ دی لیکن قینچی بہت گہری لگی تھی لہٰذا کھلے ہوئے پیٹ میں خون ہی خون بھر گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ہر احتیاط کے باوجود صرف دو منٹ کے قلیل عرصے میں دونوں ڈاکٹروں کے سامنے وزیرِ اعظم نے دم توڑ دیا۔

جان ڈاکٹر بجنکو کو کڑی نگاہ سے گھورنے لگا۔ افریقی ڈاکٹر چند لمحوں تک تشویش ناک انداز میں ساکت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے گھوما اور برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر جان تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ڈاکٹر بجنکو اپنے ہر دل عزیز وزیرِ اعظم کا آپریشن کرتے وقت حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کبھی کبھی بہت زیادہ جذباتی ہونا بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

اس نے دروازے کے قریب رک کر وزیرِ اعظم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ موت کی وجہ سے بھیانک ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جان جانتا تھا کہ اس کی موت کس قدر اہمیت رکھتی ہے، جزیرے کی انقلابی حکومت اس کے بغیر معطل تھی۔ جان سر سے پاؤں تک کانپ کے رہ گیا۔

وہ تیزی سے گھوما اور فون کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے افسر کو اس حادثے کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ جب وہ فون کے قریب پہنچا تو یکایک گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے تیز تیز آواز آئی "میں ڈاکٹر بجنکو بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری کار کا ایک پہیہ پنکچر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر جان! کیا آپ مہربانی کر کے میرے پہنچنے تک آپریشن شروع کر سکتے ہیں؟ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا"



سمندر پار سے تیسری مختصر مختصر کہانی
ایک قرض دار اور ایک قرض خواہ کی کہانی
حساب کتاب کے معاملے میں
ایک کھرے اور صاف آدمی کا واقعہ

جان ہنری بیمر ◆ آفتاب محمود

اس امر میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ چارلی ایک سخت گیر آدمی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک مضبوط اور جسیم شخص تھا اس کی شکل سے شدید بے رحمی ظاہر ہوتی تھی اور آنکھیں بے حد خوں خوار تھیں۔ چہرے کے نقوش سے ظاہر ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ ایک خوب رو شخص ہوگا مگر اب عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں بھی سختی آگئی تھی۔ اب وہ بہت کٹھور، بے رحم اور سنگ دل آدمی تصور کیا جاتا تھا کسی نے اسے کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی ممکن ہے کسی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوا ہو اور اس نے چارلی کو دھوکا دینے کی ہمت بھی کرلی ہو لیکن اسے کامیابی ہرگز نہیں ہوئی ہوگی اور اس کے دل میں چارلی کو دھوکا دینے کا خیال دوبارہ کبھی پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ چارلی اس قدر سخت مزاج تھا کہ لوگ اسے دھوکا دینے کے خیال ہی سے کانپ جاتے تھے۔

چارلی کے کاروبار کے لیے یہ سختی بنیادی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ سختی سے کام نہ لیتا تو اس کا کاروبار ٹھپ ہوجاتا۔ بنیادی طور پر وہ گھڑ دوڑ کے سلسلے میں شرطیں لگانے کا کام کرتا تھا اور ضمنی طور پر سود خوری کا پیشہ بھی اختیار کیے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے کام کرنے والوں کو سخت گیر ہونا ہی چاہیے۔ یہ کاروبار نرمی سے چل ہی نہیں سکتے۔ ہر اچھے تاجر کی طرح چارلی لین دین میں ایک اصولی آدمی تھا۔ وہ دوسروں کی رقمیں فوراً ادا کرتا تھا اور جواباً یہ چاہتا تھا اس کی رقمیں بھی کسی عذر کے بغیر وعدے کے مطابق ٹھیک وقت پر واپس کردی جائیں۔ اگر کوئی مقروض اپنے وعدے پر پورا نہ اترتا تو اسے چارلی کے دوسرے اقدامات پر پورا اترنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی بدنصیب وعدہ خلافی کرتا تو چارلی اس کے حق میں بھوکا بھیڑیا بن جاتا تھا اس کے تنخواہ دار غنڈے خوں خوار درندوں کی طرح مقروض پر جھپٹ پڑتے تھے۔ رقم بر وقت لوٹانے میں تاخیر یا ٹال مٹول کا دوسرا نام ٹوٹ پھوٹ اور مار پیٹ تھا۔ چارلی کے غنڈے ان معاملات میں ماہر تھے۔ ایسے کئی واقعات ہوچکے تھے مقروض ان واقعات کے تصور ہی سے کانپ جاتا تھا۔

چارلی کے ایک مقروض کریڈاک کو اس بارے میں سب کچھ معلوم تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی مالی حالت بے حد سنگین تھی۔ وہ انتہائی فکرمند تھا کہ کیا کرے،

کیا نہ کرے۔ اُسے چارلی کو دو سو ڈالر ادا کرنے تھے ادائی کا مقررہ وقت قریب تھا اور چارلی اُسے یاد دہانی کا ایک پروانہ بھی بھیج چکا تھا۔ اب صرف دو روز کی مہلت باقی رہ گئی تھی۔ چارلی نے اُسے لکھا تھا: "مسٹر کریڈاک! براہِ کرم اپنے وعدے کے مطابق دو روز میں رقم ادا کر دیجیے ورنہ ہم خود آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوں گے اور ذاتی طور پر قرض وصول کر لیں گے۔"

کریڈاک اس شستہ عبارت کا مفہوم اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تھرا کے رہ گیا مگر کم سے کم اُسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ اُس کی زندگی کا بیمہ برقرار ہے۔ اُس نے بیمے کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کر کے ہر حال میں اُسے جاری رکھا تھا تاکہ اگر کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ جائے اور وہ مر جائے تو اُس کی بیوی لیزا کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیزا ایک دُبلی پتلی خوب صورت عورت تھی۔ سنہرے بالوں کی وجہ سے اُس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ اُس کی شخصیت ایسی پُرکشش تھی کہ لوگ اُسے ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی خواہش ضرور کرتے تھے۔



لیزا اچانک چارلی کے دفتر میں داخل ہوئی۔ چارلی اُسے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گیا لیکن اُسے یہ اطمینان تھا کہ عورتوں کے آنسو اُس پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ وہ ایک ایسی چٹان تھا جو محض آنسوؤں سے نہیں پگھل سکتی تھی۔ اُس نے کاروباری معاملات میں کسی کے آنسوؤں سے کبھی کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ آنسو اُس کے نزدیک محض وہ پانی تھا جو کسی بیماری کے باعث آنکھوں سے بہہ نکلتا ہے۔ چارلی سوچ رہا تھا کہ اگر اس عورت نے آنسوؤں کا حربہ آزمانے کی کوشش کی تو وہ قطعی پروا نہیں کرے گا اور صاف صاف کہہ دے گا کہ خواہ کچھ بھی ہو اُس کے شوہر کو رقم ہر حال میں دو دن کے اندر اندر ادا کر دینی چاہیے ورنہ...... اس کے بعد عورت جتنی دیر چاہے گڑگڑاتی رہے، پلکیں جھپکاتی رہے اور آنسو ٹپکاتی رہے۔ وہ اُس سے کوئی دوسری بات نہیں کرے گا۔

لیزا اُداس اُداس سی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ کرسی چارلی کی میز کے بالکل سامنے رکھی ہوئی تھی۔ لیزا نے مرتعش لہجے میں آہستہ سے کہا: "میں اپنے شوہر کے قرض کے سلسلے میں آئی ہوں۔ سنا ہے اُسے صرف دو روز میں قرض ادا کرنا ہے۔"

چارلی نے اثبات میں سر ہلایا اور فوراً مطلب کی بات شروع کر دی۔ "خوب! گویا تم ایک باوفا اور سمجھ دار بیوی کی حیثیت سے قبل از وقت چیک لے کر آ گئی ہو۔" اُس نے بہ ظاہر نرم لیکن جذبات سے عاری لہجے میں کہا کیونکہ لیزا چیک لے کر نہیں آئی تھی۔ یہ بات اُس کی صورت ہی سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"جی نہیں۔" لیزا کا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔ "میں چیک لے کر نہیں آئی ہوں۔"

"تو پھر کیوں آئی ہو؟" چارلی نے رعب سے پوچھا۔

"حقیقت یہ ہے۔" لیزا نے وضاحت کی۔ "میرے شوہر کو معلوم نہیں ہے کہ میں اس وقت آپ کے دفتر میں بیٹھی ہوں۔" چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے پر کشمکش رہی پھر اُس نے کہا: "دراصل ہم دونوں جلد ہی اس ملک سے رخصت ہونے والے ہیں۔ ہم کسی دوسری جگہ جا کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ میرا شوہر اس وقت اسی سلسلے میں طبی معائنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ میں موقع پا کر یہاں آ گئی ہوں۔"

چارلی خوب صورت لیزا کی سرد آنکھوں میں دیکھتا ہوا کرسی کی پُشت سے ٹک گیا۔ اُس کے جبڑوں کی ہڈیاں چہرے پر نمایاں ہو گئیں۔ وہ اپنے خوف ناک ترین انداز میں بولا: "اگر یہ بات ہے تو میرا خیال ہے تم یقیناً رخصت ہونے سے پہلے اپنا قرض چکانے آئی ہو۔ میں تمھارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔"

"فطری بات ہے۔" لیزا نے کہا۔ "میں دراصل اپنے ضمیر پر کسی کا بوجھ رکھنا نہیں چاہتی۔"

چارلی کی آنکھیں لیزا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے مزید سخت لہجے میں کہا: "مگر میرا خیال ہے کہ تمھارے شوہر کے پاس قرض ادا کرنے کے لیے دو سو ڈالر نہیں ہیں؟"

"آپ کا خیال درست ہے اور میں بھی اس حقیقت سے لاعلم نہیں ہوں۔" لیزا نے جواب دیا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں یہاں یہ چیز لے کر آئی ہوں۔" اُس نے اپنا پرس کھولا اور ہیروں کا ایک ہار نکال کر چارلی کی طرف بڑھا دیا۔

چارلی نے غور سے ہار کا جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"کیا تم دو سو ڈالر کے عوض یہ ہار دینا چاہتی ہو؟"

"جی ہاں۔" لیزا نے گہری سانس لی۔ "مجھے اُمید ہے کہ آپ ہماری مجبوری دیکھتے ہوئے چیک کے بجائے یہ ہار قبول کر لیں گے۔" اُس کا لہجہ بلا کا اُداس تھا اور آواز بھرا گئی تھی۔ "یہ ہار میری ماں کو تحفے میں ملا تھا اور ایک ایسے شخص سے ملا تھا جو اُن سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔" وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "معاف کیجیے گا۔ میں جذباتی ہو گئی...... میں کیا کہہ رہی تھی؟"

چارلی زبان سے کچھ نہیں بولا۔ اُس نے صرف اپنا ہاتھ اُٹھا دیا، ہیروں کا ہار لیزا کی نظروں کے سامنے جھولنے لگا۔ لیزا نے کہا: "جی ہاں۔ یہ ہار میری ماں کی محبت کی یادگار ہے۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ میرے والد کا انتقال بہت نامساعد حالات میں ہوا تھا اور ہمیں رقم کی شدید ضرورت تھی پھر بھی میری ماں نے اسے فروخت نہیں کیا تھا۔ اگرچہ انھیں یقین تھا کہ یہ کوئی قیمتی ہار نہیں ہے پھر بھی انھوں نے اسے خود سے دور کرنے کا تصور تک نہیں کیا حالانکہ میں سمجھتی ہوں اس کے عوض کام چلانے کے لائق رقم ضرور مل جاتی۔ دراصل کسی تحفے، کسی نشانی اور یادگار کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں خواہ بازار میں کتنی ہی سستی ہوں مگر بے حد بیش قیمت

اور انمول ہوتی ہیں۔ یہ ہار میری ماں کو اُن کے ایک محبوب نے دیا تھا۔ میری ماں کو اُس سے مرتے وقت تک محبت رہی لیکن" لیزا کی آواز رندھی ہوئی تھی "لیکن انھوں نے بعض مجبوریوں کے باعث اپنی محبت اپنے محبوب پر کبھی ظاہر نہیں کی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ظاہر کر نہیں سکیں۔ بہرحال یہی کیا کم ہے کہ وہ اُس کی نشانی ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھیں۔ یقین کیجیے۔ میں بھی مرتے وقت تک کبھی اسے نہ بیچتی مگر۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے" چارلی نے خشک لہجے میں اُس کی بات کاٹ دی "مجھے اس ہار کی قیمت کا اندازہ لگانا پڑے گا۔ اگر یہ دو سو ڈالر سے کم مالیت کا ہوا تو باقی رقم تمھیں ادا کرنی پڑے گی اور اگر یہ دو سو ڈالر سے زیادہ قیمتی ثابت ہوا تو میں اپنی رقم کاٹ کے باقی رقم تمھیں نقد دے دوں گا۔" چارلی رقم کے معاملے میں بہت محتاط آدمی تھا۔ وہ کسی کا ایک سینٹ بھی زائد رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح اُسے یہ بات بھی سخت ناپسند تھی کہ کوئی شخص اُس کا ایک سینٹ بھی رکھے۔

"جی ہاں یقیناً آپ کو اس ہار کی قیمت معلوم کر لینی چاہیے۔" لیزا نے اضمحلال سے کہا۔

"تمھیں ذرا سے انتظار کی زحمت ہوگی۔" یہ کہہ کے چارلی عقبی کمرے میں چلا گیا۔ عقبی کمرے میں قرض وصول کرنے والے غنڈوں کا اجتماع رہتا تھا۔ وہاں دو چار آدمی ہر وقت موجود رہتے تھے تاکہ چارلی کو جب بھی جس وقت بھی ضرورت پڑے، انھیں استعمال کر سکے۔ ان غنڈوں میں سے ایک شخص فرنینڈو جھٹکے سے کھلنے والے چاقو کا وار کرنے میں ماہر تھا۔ یہ شخص ضمناً ہیرے جواہر چرانے کا کام بھی کرتا تھا۔ اُسے ہیروں کی خوب پہچان تھی۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی قیمتی ہیرے کے لیے وہ کسی کے تعاقب میں دُنیا کے دوسرے کنارے تک بھی جا سکتا ہے۔

فرنینڈو نے چارلی کے ہاتھ میں ہیروں کا ہار دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چمک زائل ہو گئی۔ اُس نے ہار اپنے ہاتھ میں لیا اور چند لمحوں تک غور سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس نے مایوسانہ انداز میں ہار چارلی کو واپس کر دیا۔ "اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت پانچ ڈالر ہے، یہ سب ہیرے نقلی ہیں۔"

چارلی کے چہرے پر سختی بڑھ گئی۔ اُس نے فرنینڈو کو گھور کر دیکھا۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ ہیرے اصلی نہیں ہیں؟"

"ہیروں کے معاملے میں کوئی شخص مجھے چیلنج نہیں کر سکتا۔" فرنینڈو نے فخر سے کہا۔

چارلی ہار لے کر واپس لیزا کے پاس پہنچا۔ لیزا استفہامی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ فرنینڈو چارلی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا دروازے تک آ گیا تھا تاکہ اگر چارلی کو اُس کی ضرورت پڑ جائے تو وہ موقع پر موجود ملے۔ لیزا کی نظر دروازے کی طرف گئی۔ وہاں فرنینڈو چاقو لیے کھڑا تھا۔ لیزا کے بدن پر جھرجھری طاری ہو گئی کیونکہ فرنینڈو صورت ہی سے ایک خوف ناک آدمی معلوم ہوتا تھا، خوں خواری اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے لیزا کو مزید ڈرانے کے لیے جھٹکے دار چاقو کھولا اور اطمینان سے ناخن تراشنے لگا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کے دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

بہت گہری خاموشی تھی۔ چارلی کی دلی حالت کا اندازہ اُس کے چہرے سے نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح سُرخ تھیں اور جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ لیزا کے چہرے پر الجھن پیدا ہو گئی۔ وہ ہار کی اصل قیمت معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھی۔ "ٹھیک ہے" چارلی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "اس ہار کی قیمت پورے دو سو ڈالر ہے۔ میں تمھیں رسید لکھ دیتا ہوں۔"

فرنینڈو کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔ وہ منہ کھولے ہوئے حیرت سے چارلی کو گھورنے لگا۔

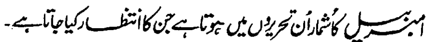
چارلی نے رسید لکھی اور لیزا کو دے دی "تمھیں اور تمھارے شوہر کو نئی زندگی مبارک ہو۔" اُس نے بدستور خشک لہجے میں کہا "مگر تم نئی زندگی میں اپنے شوہر کو اُن مقامات سے دُور رکھنے کی کوشش کرنا جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ گھوڑوں پر شرطیں لگانا آدمی کی سب سے بڑی حماقت ہے۔"

لیزا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ جس اعتماد اور پُروقار انداز میں آئی تھی، خاموشی سے اُسی طرح واپس چلی گئی۔ فرنینڈو نے آگے بڑھ کے ایک بار پھر ہار اُٹھایا اور نہایت باریک بینی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ہار کا اچھی طرح جائزہ لے کر اُس نے اسے میز پر پھینک دیا اور چارلی سے کہا "دو سو ڈالر؟ باس! کیا اس ہار کی قیمت دو سو ڈالر ہے؟"

چارلی نے ہار اُٹھا کے جیب میں رکھ لیا۔ "اپنے کام سے کام رکھو" اُس کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا۔ "کمرے میں واپس جاؤ اور منہ سختی سے بند رکھنا سمجھے۔"

فرنینڈو بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ چارلی نے ہار جیب سے نکال کر روشنی کی طرف اُٹھایا اور محویت سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کا ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ "میری محبت" اُس نے زیرِ لب کہا "اُن دنوں میرے حالات اچھے نہیں تھے۔ میں تمھیں اصلی ہیروں کا ہار دینا چاہتا تھا پیاری! لیکن مجبور تھا۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ آج میں نے تمھیں اس ہار کی قیمت ادا کر دی ہے۔"

وہ دیر تک کھڑکی میں کھڑا ہوا باہر گھورتا رہا۔ اُس کے ذہن میں وہ موہنی سی لڑکی گھوم رہی تھی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا مگر شادی کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اُس نے کھوئے کھوئے انداز میں اسکاچ کا ایک جام پیا پھر خود پر قابو پا کے گھنٹی بجائی کیونکہ اب دوسرے مقروض سے قرض وصول کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر پھر سختی پیدا ہو گئی۔ اب وہ دوبارہ ایک سخت گیر کاروباری آدمی بن چکا تھا۔ وہ بے حد کھردرے لہجے میں اپنے آدمیوں کو احکام دینے لگا۔ اُس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش بھی نہیں تھی۔



امبر بیل کا شمار اُن تحریروں میں ہوتا ہے جن کا انتظار کیا جاتا ہے۔

میں جمشید عالم الٰہ آباد کے ایک متوسط خاندان کا فرد تھا۔ اُس کا گھرانا پانچ افراد پر مشتمل تھا، ماں باپ، بڑا بھائی سکندر، چھوٹی بہن یاسمن اور وہ خود۔ جمشید ایک خوب رُو اور ذہین لڑکا ہونے کے باوجود خوابوں میں زندگی گزارتا تھا اور اپنے خوابوں سے ہراساں بھی رہتا تھا کیونکہ اُن کی تعبیر کے طور پر اُس کے گھر میں کئی تلخ حقیقتیں رُونما ہو چکی تھیں۔ اُس کے چچا اور دادی کی اَلم ناک اموات اُسی کے خوابوں کا نتیجہ تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب اُس نے اپنی چہیتی بہن یاسمن کے متعلق ایک خواب دیکھا تو لرز کے رہ گیا۔ یاسمن ارشد نامی ایک نوجوان ڈاکٹر کی منسوبہ تھی۔ جمشید نے اپنے لرزہ خیز خواب کے پیشِ نظر اس رشتے کی بھرپور مخالفت کی مگر اُس کی سنتا کون؟ آخر ایک دن یاسمن خون رنگ جوڑے میں ارشد کے ساتھ وداع کر دی گئی اور جمشید غیروں کی طرح اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر جلد ہی اُس کے موذی خواب نے تعبیر کا پھن اُٹھا لیا۔ شادی کے صرف چند روز بعد ایک صبح ارشد گھبرایا ہوا اُس کے گھر پہنچا اور اپنی عادت کے خلاف جمشید کے والد سے گستاخانہ انداز میں پوچھنے لگا کہ "یہ کیپو کون ہے اور یاسمن سے اُس کا کیا تعلق ہے؟" جمشید کے لیے کیپو کا نام نیا تھا لیکن اُس کے والد یہ نام سُن کے اچانک چراغ پا ہو گئے اور اپنے داماد کو بُری طرح جھڑکنے لگے۔ ارشد پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔ جمشید کے والد نے دفعتاً بھرا ہوا پستول اُٹھایا اور ارشد کے پیچھے لپکے۔ جمشید کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ تذبذب کے بعد اُس نے بھی دوڑ کے اُن کا تعاقب کیا لیکن جب وہ ارشد کے گھر پہنچا تو قصہ تمام ہو چکا تھا۔ جمشید کے والد نے اپنے داماد کو شوٹ کر کے خودکشی کر لی تھی۔ جمشید نے حواس باختگی میں اُن کے خونم خون جسم پھلانگے اور گھر کے اندر پہنچا۔ وہاں یاسمن کی چھت سے جھولتی ہوئی لاش نے اُس کا استقبال کیا۔ وہ اُس کی بے جان ٹانگوں سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تباہی کا جو سلسلہ کیپو کے نام سے شروع ہوا تھا وہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ اِن پے در پے صدمات نے جمشید کی ماں کو بھی اُس سے چھین لیا۔ نیز جمشید کا بڑا بھائی سکندر اُس کی طرح باہمت و با غیرت ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا اور نہ جانے کہاں چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کا گھر خاک ہو گیا تھا۔ جمشید اُجاڑ گھر کے در و دیوار سے سر ٹکرانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ ممکن ہے تنہائی کی اذیت اُسے بھی گلا گھونٹ لینے پر مجبور کر دیتی مگر جلد ہی رانی پور سے اُس کے چچا نے اُسے بُلوا لیا۔ اُن کی لڑکی عذرا جمشید کی منگیتر تھی اس لیے وہاں اُسے ایک بار پھر گھر جیسا سکون محسوس ہوا اور اُس نے اپنی تعلیم دوبارہ جاری کر کے رفتہ رفتہ بی اے کر لیا۔ بی اے کرنے کا انعام اُسے یہ ملا کہ چچا نے ایک روز نہایت خوب صورتی سے جمشید کا آبائی مکان اپنے نام کرا لیا اور عذرا کی بات بالا ہی بالا کسی اور سے طے کر دی۔ جمشید نے اس زیادتی پر احتجاج کیا تو اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ ناچار وہ شہروں شہروں اپنے پاگل بھائی کو تلاش کرتا ہوا کلکتے پہنچا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار گھر سے بھاگ کر کلکتے آ چکا تھا۔ یہاں اُس کا ایک دوست جارج رہتا تھا اور بازارِ حسن کی ایک نوخیز مغنیہ بانو سے بھی اُس کی شناسائی تھی۔ جمشید کوچے کوچے اپنے دوست جارج کو ڈھونڈتا رہا۔ اُس کے کپڑے پھٹ گئے تھے، جیب میں ایک دمڑی تک نہیں تھی۔ دمڑی کے بغیر نہ پیٹ کی آگ بجھ سکتی تھی، نہ دل کی۔ نہ سر پہ چھت تھی نہ پیٹ میں چھپر۔ ایک روز اُس نے شدید مایوسی سے خود کو پانی کی آگ میں جھونک دینے کا فیصلہ کیا اور دریائے ہگلی کے کنارے جا پہنچا۔ قریب تھا کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتا لیکن اچانک ایک میٹھی، سریلی آواز نے اُسے نام لے کے پکارا۔ جمشید چونک کے مُڑا تو دنگ رہ گیا۔ اُس کے سامنے ایک دل کش نسوانی ہیولا لہرا رہا تھا۔ ہیولے نے چاہے اُس کی ہمت بندھائی اور اُسے زندہ رہنے کی ترغیب دی پھر اپنا نام بتایا۔ اُس کا نام سُن کے جمشید کے قدم ڈگمگا گئے۔ آج وہ یہ نام دوسری بار سُن رہا تھا۔ "کیپو" پھر اس سے پہلے کہ جمشید اُس سے کچھ وضاحت چاہتا، کیپو جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اُسی طرح غائب ہو گئی۔ جمشید غیر ارادی طور پر سر جھٹکانے لگا اور بوجھل قدموں سے پھر زندگی کی طرف لوٹ گیا لیکن اس بار زندگی نے اُسے ٹھکرایا نہیں، سینے سے لگا لیا۔ کیپو کا ملنا اتنا مبارک ثابت ہوا کہ جمشید کو جلد ہی جارج بھی مل گیا اور بانو بھی۔ بانو نہ جانے کب سے اُس کا راستہ تک رہی تھی۔ وہ نظر آئی تو جمشید مچل گیا کہ بے تاخیر اُس





کا ہاتھ تھام لے اور اُسے ذلت کی دلدل سے باہر کھینچ لے۔ چنانچہ چند روز بعد جمشید مقررہ وقت پر بانو کے پاس پہنچ گیا۔ بانو زیورات اور نقدی کی پوٹلی سنبھالے، برقع اوڑھے اُس کی منتظر کھڑی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ جمشید کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرتی اُس کی ماں نوبیگم اور اُس کا سازندہ بختاور وہاں پہنچ کے اُن کی راہ میں دیوار بن گئے۔ جمشید نے اُنھیں شرافت کے ساتھ سامنے سے ہٹانا چاہا لیکن بختاور نے چاقو نکال لیا۔ مجبوراً جمشید کو بھی پھرتی دکھانی پڑی۔ اُس نے بختاور کا چاقو چھین کے اُسی کے پیٹ میں اتار دیا اور نوبیگم کی انتڑیاں بھی کھال کی قید سے آزاد کردیں۔ اب دو لاشوں کی موجودگی میں زندہ بانو کو لے جانا مصلحت کے خلاف تھا چنانچہ جمشید نے اُسے بے بس کر کے وقتی طور پر وہیں چھوڑا اور خود باہر آگیا۔ اُس کے دوست جارج نے یہ رُوداد سُنی تو اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اُسے پہلی گاڑی سے بمبئی روانہ کردیا۔ بمبئی پہنچ کے جمشید کو نہ معلوم کتنا بھٹکنا پڑا لیکن جلد ہی ایک خوب صورت خانہ بدوش عورت ڈالی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ جمشید نے اُسے اپنا نام شیر دِتا بتایا۔ ڈالی کا شوہر مر چکا تھا اور دنیا میں اُسے ایک گڈّا اور پھیلا ہوا ہاتھ دے گیا تھا۔ ڈالی کو اپنا اور اپنے گڈّے کا پیٹ بھرنے کے لیے بھیک مانگنے کے علاوہ مَردوں کی ہوس کا شکار بھی ہونا پڑتا تھا اس لیے وہ وہاں خوش نہیں تھی۔ دوسری طرف دُہرے قتل کا مجرم جمشید بھی خود کو بمبئی میں غیر محفوظ سمجھتا تھا اس لیے ایک روز ڈالی اور جمشید نے گڈّے کو اٹھایا اور بمبئی سے بھاگ کے ایک چھوٹی سی ریاست راجے پور میں پہنچ گئے۔ جمشید کی وجاہت اور ڈالی کی خوب صورتی کام آئی۔ انھیں راجے پور کے ایک بہت بڑے رئیس پرکاش چندر کی حویلی میں ملازمت مل گئی۔ یہاں جمشید نے اپنا نام موہن داس ظاہر کیا۔ حویلی کا نام پرکاش بھون تھا۔ بھون ایک رنگین جگہ تھی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کے جمشید کو یقین ہوگیا کہ جب تک وہ اور ڈالی جوان ہیں، اُن کی ملازمتیں پکی ہیں۔ پرکاش چندر کے لڑکے راج کمار کہلاتے تھے، نیز بیویاں رانیاں تھیں اور لڑکیاں راج کماریاں۔ تقریباً سبھی رنگے ہوئے تھے۔ ڈالی کو مَردوں نے اور جمشید کو لڑکیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا خصوصاً ایک نوخیز لڑکی شاردا نے مختلف انداز میں جمشید کو اُس کے ہونے کا احساس دلایا۔ وہ اُس پرستان کی سب سے حسین، سب سے نازک اور سب سے منفرد پری تھی۔ جمشید بھی بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا گیا یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے سینوں میں دھڑکنے لگے۔ جمشید شاردا کی قربت میں اپنا خطرناک ماضی بھول سا گیا تھا مگر ایک دن اچانک اُسے پھر پیچھے پلٹنا پڑا۔ ہوا یہ کہ بھون میں دیوراج نامی ایک بڈھا سادھو اکثر آتا تھا۔ اُس کی وہاں بہت عزت تھی۔ سادھو نے قطعی نامعلوم طریقے سے جمشید کی چور آنکھیں پڑھ لیں کہ وہ ایک مجرم ہے اور پرکاش چندر کے ولی عہد مہیش چندر کو بھی آگاہ کر دیا جو کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا چنانچہ مہیش نے رازداری کے وعدے پر اُسے شیشے میں اتارا اور اپنے باپ پرکاش چندر کے قتل پر مامور کر دیا۔ اس خطرناک کام سے بچنے کے لیے جمشید نے بھون سے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن نوبیگم اور بختاور کے ڈھانچے بھوت بن کے اُس کے راستے میں حائل ہوگئے۔ اس کے علاوہ شاردا، ڈالی اور گڈّے کو وہ کس کے سہارے چھوڑ جاتا؟ چنانچہ چار و ناچار اُس نے پرکاش چندر کو ٹھکانے لگانے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن زبردست پہرے کے باعث اُسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور مہیش چندر سے ملی ہوئی مہلت کی آخری رات آپہنچی۔ جمشید مایوسی سے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک پُراسرار بھوگو دوسری بار اُس کے سامنے نمودار ہوئی اور مبہم انداز میں اُسے اطمینان سے سو جانے کی تلقین کر کے رخصت ہوگئی۔ دوسری صبح پرکاش چندر حیرت انگیز طور پر اپنی خواب گاہ میں مُردہ پایا گیا۔ مہیش نے اُس کی موت کا سہرا جمشید کے سر باندھ کے اُسے انعام سے نوازا لیکن جمشید کو خوشی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتا تھا اب مہیش پہلی فرصت میں اُسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا۔ اس صورت میں جمشید کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مہیش کو بھی اُس کے باپ کے پاس پہنچا دے۔ اتفاق سے جلد ہی جمشید کو اس کا موقع مل گیا۔ وہ اس طرح کہ آں جہانی پرکاش چندر کی سب سے کم عمر رانی پاروتی مہیش سے ناراض ہوگئی تھی حالانکہ وہ پرکاش چندر کی موت میں مہیش چندر کی شریک تھی۔ اُس نے جمشید کو اعتماد

میں لے کے مہیش کے قتل کی راہ ہموار کر دی اور مہیش جمشید کے ہاتھوں کتّے کی موت مارا گیا۔ یہ کوئی معمولی قتل نہیں تھا لہٰذا جمشید کے لیے قتل کی محرّک اور مجرم پارو کو قابو میں رکھنا لازم تھا۔ اِس مقصد سے وہ ایک رات دراز اُس کی خواب گاہ میں جا گھسا۔ پارو نے شروع میں مزاحمت کی مگر آخر جمشید کی وجاہت، ذہانت اور پستول کے سامنے اُسے بے بس ہونا پڑا۔ جمشید نے اُس کے ساتھ ایسی رنگین اور سنگین رات گزاری کہ حسین پارو نے اپنی آیندہ کی تمام راتیں جمشید کے نام وقف کر دیں۔ مہیش کے بعد بھون کی باگ ڈور اُس کے چھوٹے بھائی دنیش کے ہاتھوں میں آ گئی۔ دنیش ایک سنجیدہ اور جوہر شناس نوجوان تھا۔ اُس نے جمشید عالم یعنی موہن داس کو ملازم کے بجائے ایک دوست کی حیثیت سے اپنے قریب کیا۔ جمشید نے بھی نمک اور دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جب بھی دنیش کی طرف اندھیرے میں کوئی تیر آیا، جمشید نے اپنا سینہ آگے کر دیا۔

ریاست راجے پور کی تقدیر کا مالک مہاراجا امرناتھ تھا۔ مہاراجا امرناتھ کی کوئی اولاد نہیں تھی، اولاد ہوتی تب بھی اُس کے بعد ریاست کے دو خاندانوں میں سے کسی ایک کو ریاست کی گدی پر براجمان ہونا تھا۔ دونوں خاندانوں کے دو بڑے بیٹے ریاست کی گدی کے حق دار اور امیدوار سمجھے جاتے تھے، ایک دنیش چندر، دوسرا کنور جگ دیپ۔ جگ دیپ بڑی حویلی میں رہتا تھا۔ اُسے بڑی حویلی سے براہِ راست راج محل پہنچنے کی بہت جلدی تھی اس لیے وہ دنیش کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن لوہر موہن داس، دنیش کی ڈھال بنا ہوا تھا، جگ دیپ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ نتیجتہً اُس نے اپنے حملوں کا رُخ سیدھا موہن داس کی طرف موڑ دیا۔ اُس نے ایک بار گھڑ دوڑ میں موہن داس کے اُوپر گھوڑا چڑھا دینے کی کوشش کی پھر مختلف اوقات میں بیک وقت کئی کئی آدمیوں سے اُس پر حملے کروائے، اُسے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کرایا اور طرح طرح کی بہتان تراشیوں سے اُسے رُسوا کرنے کی کوشش کی لیکن جمشید کی آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی تھیں اور اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون کبھی منجمد نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ مخالفوں کے ہر حربے سے بچتا رہا اور اپنے محاذ پر ڈٹا رہا۔ دشمنوں کی نوازش سے اُس کی زندگی ایک ہیجان انگیز انقلابی دور سے گزر رہی تھی اور اُسے روز و شب، صبح و شام انتہائی نازک لمحات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ دو ایک شدید نامحرک موقعوں پر اُسی کی پُراسرار بیٹی کیچو نے اچانک نمودار ہو کے اپنے مخصوص مبہم انداز میں اُس کی ڈھارس بندھائی اور اُسے ایک بوٹی کھلا کے مژدہ سنایا کہ اب اُس پر کوئی زہر اثر نہیں کر سکے گا۔ کیچو کے التفات نے سادھو لیلو راج اور ایک پنڈت الٹیری لال کو جمشید کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ کیچو اور جمشید کا رابطہ جان کے جمشید کے ساتھ نیازمندی سے پیش آنے لگے تھے لیکن جمشید کو نہ اُن سے دلچسپی تھی، نہ اُن کی دیوی سے۔ وہ اپنی زندگی کی بدترین اُلجھنوں میں گرفتار تھا جو وقت دشمنوں سے بچتا، وہ تارا، دنیش اور پارو میں صرف ہو جاتا تھا۔ غرض عجیب عجیب متضاد دن گزر رہے تھے۔ راج کمار دنیش چندر پر اُس کے جوہر کھل رہے تھے اور اب وہ کھلے عام موہن کو ریاست کے قریب کا آدمی ظاہر کرتا تھا۔ اُنھی دنوں راج محل میں انگریز آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ایک خصوصی ضیافت منعقد ہوئی۔ دنیش، جمشید کو بھیس بدلوا کے اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ ضیافت میں اُس نے جمشید کا تعارف ایرانی پروفیسر زاہدی کی حیثیت سے کرایا۔ جمشید کو مجبوراً پروفیسر زاہدی بننا پڑا اور پروفیسر زاہدی نے اپنی خوش خلقی، علمیت، ادب اور بلاغت سے اپنے دوست کے مذاق کی لاج رکھ لی۔ کرنل ہارڈنگ، مہاراجا اور دیگر مہمان پروفیسر زاہدی سے بہت متاثر ہوئے خصوصاً ریتا اور راج کماری کنول کی شیدائیت دیکھنے کے لائق تھی۔ ریتا کرنل ہارڈنگ کی بیٹی اور کنول مہاراجا کی بھتیجی تھی۔ دونوں اپنا جواب آپ تھیں۔ راج محل سے واپسی پر دنیش نے جمشید کا منہ چوم لیا اور اُسے دلّی سے آئی ہوئی ایک مغنیہ ترنم کا تحفہ دیا۔ جمشید نے ترنم کے ساتھ صرف ایک رات گزاری کے اُس کے لیے دلّی کو ٹنا دوبھر کر دیا۔ وہ وہیں تعیم ہو گئی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا لیکن کتّوں نے دنیش اور جمشید کی بُو سونگھنا نہیں چھوڑا تھا اس لیے ایک روز دنیش اُن کی زد پر آ گیا۔ ساتھیوں نے بھرپور حملہ کیا مگر اب بھی دنیش بال بال بچ گیا البتہ اُس کا ڈرائیور بے موت مارا گیا۔ جمشید جانتا تھا کہ یہ حملہ کس جانب سے ہوا ہے۔ اُس نے تمام مروّتیں طاق پر رکھ دیں اور جگ دیپ کی ایک آلۂ کار رنیا رانی اُس کے ایک لیم شحیم گُرگے پرشوتم، جگ دیپ کے باپ کنور پر دیپ اور اُس کے اٹینڈنٹ کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ کام اُس نے ایک ہی رات میں تن تنہا انجام دیا تھا۔ دوسرے روز راج محل، چھاؤنی، بڑی حویلی بلکہ پوری ریاست میں تہلکا مچا ہوا تھا۔ کالی پولیس کے ساتھ گوری فوج نے بھی سرگرمی سے قاتلوں کی تلاش شروع کر دی خصوصاً انگریز چھاؤنی کا ایک رنگین مزاج افسر میجر رابرٹ ضرورت سے زیادہ مستعدی دکھانے لگا تھا۔ جمشید نے اپنی حسین رفیقۂ کار پارو کے ذریعے اُسے ایک سنسان پہاڑی مقام پر بلایا اور اُسے اُس کی جیپ سمیت کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکا دیا۔ یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا چنانچہ جمشید نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پروفیسر زاہدی کا بھیس بدلا اور کرنل ہارڈنگ سے ملنے کے لیے چھاؤنی جا پہنچا۔ کرنل لیے دیے انداز میں دوستوں کی طرح اُس سے ملا مگر اُس کی لڑکی ریتا نے کوئی تکلف ملحوظ نہیں رکھا۔ اُس نے ہلکی ہلکی سُرخ روشنیوں کے تخلیے میں اُس سے دیرینہ شناساؤں کی طرح پوری مغربی بے باکی سے ملاقات کی۔ جمشید نے اُسے پرکاش بھون آنے کی دعوت دی۔ پھر چند روز بعد اُس کا شاہانہ جلوس پرکاش بھون آ گیا۔ جمشید نے اُس کے ساتھ اپنی زندگی کی ایک بیش قیمت رات گزاری۔ ریتا کو لُٹنے قریب سے دیکھ کے اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ مغربی شیشے میں مشرقی شراب بھری ہوئی ہے۔ ریتا کے ساتھ کئی انگریز محافظ بھی بھون آئے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص کا نام جیکسن تھا۔ اُسے اُس کی بدقسمتی پرکاش بھون لائی تھی اسی لیے ایک روز وہ جمشید کے ساتھ چالاکی سے پیش آنے کی بیوقوفی کر بیٹھا۔ اُس نے غیر واضح لفظوں میں جمشید پر میجر رابرٹ کے قتل کا شبہ ظاہر کیا۔ چنانچہ ایک رات جمشید نے بہانے سے اُسے راجے پور کے ویران کھنڈروں میں لے جا کر صرف ایک گولی میں زندگی کے تمام دکھوں سے نجات دلا دی۔ اسے مار کے جمشید لوٹ ہی رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک جیپ آ کے رکی۔ جیپ میں ایک ہندوستانی اور چھ گورے سوار تھے۔ جمشید کے لیے اُن کی آمد غیر متوقع تھی لیکن اُس کے پاس گولیوں کی کمی نہیں تھی اس لیے اُس نے ایک ایک کر کے اُن ساتوں کو جیکسن کے پاس روانہ کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ بھون سے چلتے وقت جیکسن نے جمشید کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کے احتیاطاً چھاؤنی فون کر دیا تھا کہ وہ کھنڈروں کی طرف جا رہا ہے۔ کھنڈروں کی اس لرزہ خیز واردات نے چھاؤنی میں ہلچل برپا کر دی۔ بڑی حویلی اور پرکاش بھون کے بے شمار ملازمین شبے میں گرفتار کر لیے گئے۔ میر جمشید عالم بھی پابہ جولاں چھاؤنی لے جایا گیا اور وہاں اُسے مشقِ ستم بنانے میں کوئی بخل نہیں کیا گیا۔ جمشید نے جرم کا اقرار نہ کرنے کے سبب اپنی زندگی کی سب سے اذیت ناک سزائیں بھگتیں، اُس کی کھال سر سے پاؤں تک اُدھیڑ کے رکھ دی گئی لیکن بدقسمتی نے اُسے موت سے ہم آغوش نہیں ہونے دیا۔ وہ زنداں میں سڑ رہا تھا کہ سادھو لیلو راج اپنے ساتھ کئی سادھوؤں اور پنڈتوں کے ساتھ اُس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے چھاؤنی پہنچ گیا نیز دنیش اور خود کرنل ہارڈنگ کی بیٹی ریتا کی طرف سے بھی اُس کی رہائی کے لیے زور لگایا گیا۔ آخر انگریزوں کو مجبور ہو کے اُسے رہا کرنا پڑا۔

جمشید کی قید کے دنوں میں پارو نے اپنے ایک نمک خوار اینگلو انڈین پولیس انسپکٹر کی مدد سے دو انگریز اور مار دیے تھے تاکہ تفتیش کا رُخ جمشید کی طرف سے ہٹ جائے لیکن پارو کا وار ذرا اوچھا پڑا تھا اس لیے ایک انگریز میں کچھ کچھ جان باقی رہ گئی تھی اور وہ اسپتال میں اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ ریاست کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر اُن دنوں ہائی کمان کی جانب سے تین انگریز کرنل وہاں آئے ہوئے تھے اور تمام تحقیقات انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ وہ یہ کام بہت رازداری سے انجام دے رہے تھے۔ تفتیش کے نتائج کا اُن کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ اسپتال میں پڑے ہوئے زخمی گورے کے بیان سے اُن کی نگاہ پارو کے چہرے پر آ ٹکی۔ پارو کو معلوم ہوا تو اُس کے گلابی رخسار ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔ جمشید نے مصلحتہً پارو کو بٹلر کے ذریعے بڑی حویلی میں قتلِ عام کی راہ سُجھائی۔ پارو کے اشارے پر بٹلر نے ایک دن موقع پا کے وہاں کے کئی افراد ٹھکانے لگا دیے۔ اتفاق سے دنیش کا چھوٹا بھائی نریش اُن دنوں وہیں مقیم تھا۔ وہ بھی مارا گیا۔ اس ہول ناک واردات نے انگریزوں کے اوسان خطا کر دیے۔ اُن کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں اور کرنل ہارڈنگ کو معطل کر دیا گیا۔ جمشید نے اپنی سرگرمی جاری رکھی۔ اُس نے ایک جامع منصوبہ بنا کے دنیش کے ڈرائیور دیوی لال کو اعتماد میں لیا اور ایک رات کار کی ڈکی میں چھپ کے ہائی کمان کے افسروں کی قیام گاہ شانت محل پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے نہایت صفائی سے تینوں کرنیلوں اور تین انگریز سنتریوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں اور اُسی رات پولیس انسپکٹر کو بھی ختم کر کے اپنا اور پارو کا راز محفوظ کر لیا۔ شانت محل سے وہ تین فائلیں لایا تھا۔ اُن فائلوں میں پارو کے سراغ کے علاوہ پورا راجے پور بند تھا۔ فائلوں کے مطالعے سے جمشید کو ریاستی رؤسا کی سرگرمیوں خصوصاً جگ دیپ اور اُس کے گرگوں کی مکمل تفصیلات حاصل ہو گئیں۔ نئے معلوم ہوا کہ راجے پور کی قریبی بستی لاکھی پور کے سرکش قبائل جگ دیپ کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ جمشید نے انھیں ذہن میں چسپاں کر لیا۔ کرنیلوں کی عبرت ناک اموات۔ [illegible] یزوں کو فی الفور اپنی سوچ اور تدابیر کا رُخ تبدیل کرنا پڑا۔ عمارتوں اور سڑکوں سے گورے فوجی واپس بلا لیے گئے اور کرنل ہارڈنگ کو اُس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ واردات کے دوسرے روز دنیش نے جمشید کی زبانی پوری روداد سنی اور یہ بھی سنا کہ جمشید نے ڈرائیور دیوی لال کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اُس نے جمشید کے دفاع کے لیے اُسی روز اپنے ہاتھوں سے دیوی لال کو شوٹ کر دیا۔ دوسری طرف جمشید نے کنور جگ دیپ کو متنبہ کرنے کے لیے پارو کے تعاون سے لاکھی پور کے دس تنہدوں کے جسم چھلنی کر دیے۔ ان متواتر واقعات نے جگ دیپ کو بھی کسی اور طرح سوچنے پر مجبور

کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے جگ دیپ کی حسین و جمیل بہن انیتا نے جمشید کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ پرکاش بھون میں چند دنوں کے لیے آگئی تھی۔ جمشید اُس کی دعوت پر ایک رات اُس کے کمرے میں گیا۔ انیتا اُس سے تپاک کے ساتھ ملی پھر ابھی اُن دونوں میں چند ہی جملوں کا تبادلہ ہوا ہو گا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جمشید پردے کی آڑ میں ہو گیا۔ انیتا نے دروازہ کھولا تو راج کماری پریت گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ پریت پرکاش بھون میں جگ دیپ کی آلۂ کار تھی۔ اُسے دیکھ کے جمشید کی مٹھیاں بھنچ گئیں مگر جب اُس نے اُس کی زبان سے یہ وحشت ناک خبر سُنی کہ بڑی حویلی میں متعدد لوگ مارے گئے ہیں تو اُس کی انگلیاں ڈھیلی ہو گئیں اور منہ کھل گیا۔ اُس کی سمجھ نہیں آیا کہ کسے بڑی حویلی کے مکینوں پر اتنا غصہ آسکتا ہے؟ یہ واردات دلابے پور کی سب سے سنگین واردات تھی۔ پورے اٹھارہ آدمی اجل کا لقمہ بنے تھے۔ ہر طرف چہ میگوئیوں اور قیاس آرائیوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ جمشید کا خیال تھا کہ خود جگ دیپ کے گرگوں نے اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ وہ جیلوں میں جاتے، شکستیں کھاتے اور مرتے مرتے تھک گئے ہوں گے مگر یہ خیال جمشید کے دل کو جچا نہیں کیونکہ اگر جگ دیپ کے گرگے مشتعل ہو گئے تھے تو انھیں یہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ واردات کے وقت جگ دیپ چھاؤنی گیا ہوا تھا۔ اُن دنوں وہ وہاں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ یہ حادثہ تو کسی مغلوب الغضب مخبوط الحواس شخص کی کارستانی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمروں کمروں جگ دیپ کو ڈھونڈتا پھرا۔ وہ نہ ملا تو جو بھی سامنے آیا اُس کی چھاتی میں سوراخ کر دیا۔ لاشوں کا جلوس بہت بڑے پیمانے پر نکلا۔ کرنل ہارڈنگ اور مہاراجا نے بھی شرکت کی۔ سرکار کی طرف سے قاتل کی سراغ رسی پر پچاس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ جمشید نے کوشش کی کہ وہ خود کو قاتل کی حیثیت سے پیش کر دے۔ اس طرح ڈالی اور گنڈا انعامی رقم سے عمر بھر مزے کریں گے لیکن ڈالی اس تجویز پر بتھے سے اُکھڑ گئی اور سینہ کوٹ کوٹ کے جمشید کو کوسنے لگی۔ دلابے پور کا آئی جی مہتا سادھو دیوراج اور جمشید کے ربط ضبط سے واقف تھا اور اس لیے اُس کی عزت کرتا تھا۔ انھی دنوں اُس نے خفیہ طور پر جمشید کو بلایا اور نہایت لجاجت سے یہ مخلصانہ تجویز پیش کی کہ جمشید کچھ دنوں کے لیے دلابے پور سے باہر چلا جائے۔ جمشید سناٹے میں آگیا۔ اب پرکاش بھون کے لوگوں میں وہ اور اُس میں لوگ اتنے شامل ہو گئے تھے کہ وہ انھیں ان حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ شدید تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسی تذبذب میں وہ راج کماری کنول سے ملنے کے لیے راج محل جا پہنچا۔ کنول سے اُس کی فون پر اکثر گفتگو ہوتی تھی لیکن جب اُس نے کنول کے روبرو بیٹھ کے اُس کے یاقوتی ہونٹوں سے کھلنے والے پھول چُنے اور سونگھے تو وحشت میں مبتلا ہو گیا۔ کنول اُس سے بہت واضح، بہت قریبی باتیں کر رہی تھی، ایسی باتیں جمشید، شاداں اور پارو سے بھی سن چکا تھا لیکن کنول میں چونکہ اُس کا دوست اُمر کا مُحسن اُس کا آقا دنیش دلچسپی رکھتا تھا اس لیے جمشید کو اپنا رویہ متعین کرنے میں مشکل پیش آئی پھر بھی اُس نے اپنی کشمکش کا اظہار کنول پر نہیں ہونے دیا۔ کنول نے غیر رسمی طور پر اُسے مہاراجا سے بھی ملوایا۔ مہاراجا کا خیال تھا کہ موہن داس جیسے نوجوان کو راج محل میں ہونا چاہیے۔ کنول نے مچل کے اس بات کی تائید کی۔ اس طرح جمشید راج محل سے بہت مضبوط ہو کے اور بہت ٹوٹ کے واپس آیا۔ بھون آکے اُس نے ایک خاص غرض سے پارو کی زبانی یہ افواہ اُڑوا دی کہ جگ دیپ نے راج کماری کنول کے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا اور مہاراجا نے آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ اُسی رات راہ داری میں جمشید کو سندھیا ملی۔ سندھیا، دنیش کی ایک نوخیز اور شریر بھانجی تھی۔ وہ جب بھی جمشید سے ملتی، ایک دم چھلانگ لگا کے جوان ہو جانے کی کوشش کرتی۔ اُس وقت وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جمشید نے اُسے لائبریری کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں سندھیا نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا۔ سندھیا کم عمری کے باوجود جمشید سے اس حد تک متاثر تھی کہ کچھ مدت قبل اُس نے آشا دیوی نامی ایک راج کماری کی زبان سے جمشید کی برائی سُن کے اُسے چپکے سے شوٹ کر دیا تھا اور آج اُس نے جمشید کو یہ بتا کے سر سے پاؤں تک دہلا دیا کہ بڑی حویلی کی حالیہ واردات اُس کے غصے کا کرشمہ تھی کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ اُس کے دیوتا موہن داس پر تیر کہاں سے پھینکے جاتے ہیں۔ ہائے افسوس تھا کہ جگ دیپ بچ گیا۔ جمشید سُن ہو گیا اور اُس نے بے اختیار اُسے اپنے سینے میں بھر لیا۔ دونوں رات بھر ایک دوسرے کے سینے میں چھپے ہوئے روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور سونے کا وقت نہ رہا۔

پہلے وہ نیچے اتری۔ زینے کی آخری سیڑھی پر میں نے اُس کا بھیگا ہوا چہرہ اپنے دامن سے صاف کیا۔ وہ میرے سینے میں چھپنے لگی۔ اندھیرے کا رنگ سُرمئی ہو گیا تھا۔ میں نے ہچکیوں کے ساتھ اُسے آگے دھکیل دیا اور خود سیڑھیوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا واپس اوپر آگیا۔

کمرے میں ابھی تک اُس کی سرگوشیاں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ میرے سر کو کوئی اور جگہ نہ ملی تو میں نے اُسے گھٹنوں میں چھپا لیا۔ دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور مجھ میں اُسے بند کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ خنک ہوا کمرے میں لپکتی ہوئی در آئی اور میرا جسم ہلانے لگی۔ میں اپنی گٹھری سمیٹے یوں ہی بیٹھا رہا۔ نچلی منزل پر قدموں کی آہٹ ہوئی تو میں نے اپنا بھاری سر اُٹھا کے دیکھا۔ روشنی پھیل چکی تھی۔ میں اُٹھ کے تیزی سے باہر کی جانب بھاگا لیکن دروازے پر ٹھٹک کے رہ گیا۔ قالین کا کونا مڑا ہوا تھا اور سندھیا کے بالوں میں لگے ہوئے گلاب کی پتیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں جلدی جلدی چُنا اور منہ میں چھپا لیا۔ قالین درست کرنے اور کرسیاں میز کے گرد ترتیب سے رکھنے کے باوجود وہاں اب بھی ایک نشانی موجود تھی اور وہ تھی سندھیا کی سانسوں کی مہک۔ میں نے گہری گہری سانسیں لے کے اُسے بھی اپنے سینے میں محفوظ کرنے کی کوشش کی اور تھک کے باہر چلا آیا۔

کنڈی میں ٹوٹا ہوا تالا لٹک رہا تھا اور گولی کا نشان دروازے پر صاف نظر آرہا تھا۔ تالا جیب میں ڈال کے اور دروازہ آہستہ سے بند کر کے میں نیچے کی آہٹیں سونگھتا ہوا پنجوں کے بل اترنے لگا۔ لائبریری کی نچلی منزل پر مطالعے کا کمرہ کھل چکا تھا۔ اندر کوئی صفائی کر رہا تھا۔ میں ستونوں کی آڑ لیتا ہوا عمارت سے باہر آنے میں کامیاب ہو گیا لیکن باہر آتے ہی میرے قدم زمین میں دھنسنے لگے۔

سادھو دیوراج اپنی لاٹھی ٹیکے ہوئے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک اور ہونٹوں پر بے نام مسکراہٹ تھی۔ میں نے کترا کے آگے نکل جانا چاہا مگر ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں میرے ہی انتظار میں دیر سے کھڑا تھا اور جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے کہ میں نے رات کہاں گزاری ہے اور میرے ساتھ کون تھا۔ ممکن ہے اُس نے سندھیا کو عمارت سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہو۔ میں نے ایک مجرم، ایک ناتواں شخص کی طرح گردن جھکا دی۔ "اب بھی کچھ دیری ہے بالک؟"
سادھو دیوراج نے سرد آواز میں مجھے مخاطب کیا۔
"کاہے کی دیری مہاراج؟" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"اب چلے چلو بالک!" اُس کے لہجے میں التجا شامل تھی۔

اُس کا اس طرح اچانک میرے راستے میں مزاحم ہونا بے سبب نہیں تھا۔ ریاست کے بدلتے ہوئے پیچیدہ حالات کا اُسے پوری طرح علم ہوگا۔ اُس سے کوئی بات چھپانا ممکن نہیں تھا۔ سادھو دیوراج کی نیت کا تجربہ مجھے پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ الیشوری لال نہیں تھا، سارے راجے پورے میں اُس کے پیروں کی دھول ماتھوں پر ملی جاتی تھی۔ شہر سے کچھ دُور ویرانے میں مندروں، کٹیوں اور دھرم شالوں پر مشتمل اُس کا اپنا ایک بڑا استھان تھا۔ جہاں دُور دراز کے پنڈت سادھو آکے گیان دھیان میں مصروف ہو جاتے تھے۔ راجے پور کا یہ بڑا سادھو مجھ سے نرم اور شفیق لہجے میں مخاطب تھا۔

یہی وہ شخص تھا جس نے بہت سے لوگوں کی بھیڑ میں مجھے پہچان لیا تھا اور دنیش کے بڑے بھائی مہیش چندر کو اشارہ کیا تھا کہ وہ جس شخص کی تلاش میں ہے، وہ اُس کی چھت کے نیچے موجود ہے۔ اگر وہ اُس دن مہیش چندر کے سامنے میری جانب انگلی کا اشارہ نہ کرتا تو آج سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ میں ضرور بالو کو ڈھونڈ لیتا۔ کدئے ڈالی بالو اور جانج کے ساتھ میرا چھوٹا سا کنبہ کسی چھوٹے سے مکان کے آنگن میں دھوپ اور چاندنی کی سیر کر رہا ہوتا۔ جب ذرا فضا موافق نظر آتی، میں ڈالی کو لے کے ریاست سے کہیں دُور نکل جاتا۔ سادھو دیوراج ہی وہ شخص تھا جس نے میرے راستے میں مہیش چندر کا پتھر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے اپنی صفائی کی کوشش ضرور کی تھی۔

اُس وقت مجھے سادھو دیوراج کی حیثیت کا اتنا اندازہ نہیں تھا، سادھو دیوراج کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دینا میری خام خیالی تھی۔ اُس نے میری تمام لغزشیں درگزر کر دی تھیں۔ جب آئی جی مہتا سینہ پھلا کے مجھے بھون سے لے جا رہا تھا تو سادھو بپھرتا ہوا درمیان میں آ گیا تھا اور بھاؤنی کے صدر دروازے پر احتجاج کرنے والے سادھوؤں کے گروہ میں وہ سب سے آگے تھا۔ جکسن کے ساتھ میری ٹانگ میں لگنے والی گولی کا زخم بھرنے کے لیے وہ ایک تریاق لے کے آیا تھا۔ ایک بار، دوبار کی بات نہیں تھی، سادھو دیوراج نے متعدد مرتبہ میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ پنڈت الیشوری لال نے بھی اُس کی پیروی کی تھی۔ نہ جانے انھیں میرے اندر کیا نظر آتا تھا۔ شاید کیچو نظر آتی تھی جس کے بارے میں مَیں خود سب سے کم جانتا تھا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کیچو کون ہے؟ تو میرے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ ایک مہربان سایہ ہے۔ ایک عورت کا سایہ، میں نے اُسے مجسم شکل میں بھی دیکھا ہے۔ وہ ایک حسین و جمیل عورت کا روپ ہے، روپ ہے یا عورت ہے سایہ ہے یا سائے کی تجسیم ہے، جو کچھ ہے وہ میرا اضطراب، میرا وہم نہیں ہے۔ میں نے اُس کا جلوہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر مجھے اُس کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ ہوا کا، سائے کا، روشنی کا پتہ کہاں ہوتا ہے۔ وہ دو آدمی جب مجھ سے اشارۃً کیچو کا ذکر کرتے تھے تو مجھے ہنسی آتی تھی۔ دماغ میں تنکا چبھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں غور و فکر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا اس لیے میں نے سوچنا ہی موقوف کر دیا تھا۔

کیچو ہو یا پنڈت الیشوری لال یا سادھو دیوراج، وہ خود ہی جب اُن کا جی چاہتا، میرے سامنے آ دھمکتے تھے، میں نے اُن کی طلب نہیں کی تھی۔ جب وہ ایک بار مصائب کے دوران میں مجھے اُن کا خیال آیا تھا تو انھوں نے میرا خیال نہیں کیا تھا۔ چھاؤنی کی کال کوٹھری میں میرے جسم سے کھال جُدا کی جا رہی تھی تو کیچو نہیں آئی تھی اور میں نے کسی بھی جگہ جانے سے پہلے ان لوگوں سے مشورہ نہیں کیا تھا کیونکہ میرے ذہن نے ہمیشہ اُن کی نفی کی تھی۔ مجھے ان کی دیوار اور تکیے کی آرزو نہیں تھی بلکہ جب وہ سامنے آجاتے تھے تو مجھ سے میرا یقین چھیننے کی کوشش کرتے تھے۔ جہاں پہلے رنگ پر نیلا رنگ چڑھا دیا جائے تو ہڑبڑا جائے، جہاں چابی کھو جائے تو پہیا گھومنے سے انکار کر دے، جہاں روز مقررہ وقت پر دن نکلتا ہو، شام ہوتی ہو، جہاں گزرا عہد پیچھے ہٹتا رہا ہو، آگے بڑھتا رہا ہو اور ریاست کا موسم اُس کی ایک جنبشِ نگاہ سے بدل جاتا ہو، جہاں گھڑی کی سوئی ٹک ٹک کرتی ہوئی شب و روز میں دو چکر پورے کر لے، تغیر نہ کرے، جہاں زر نہ ہو تو آدمی کے رنگ میں چمک نہ پیدا ہو، اتنی صاف باتوں کے درمیان سادھو دیوراج، پنڈت الیشوری لال اور کیچو سرکس کے جوکر نظر آتے تھے۔ مداری، کھلاڑی، تماشے باز، میں ان میں اتنی ہی دیر غیر سنجیدہ ہو سکتا تھا جتنی دیر وہ نظر آتے تھے۔ پرکاش بھون میں اتنی بڑی لائبریری موجود تھی۔ شاردا، مارکس، ہیگل، روسو، والٹیر، نطشے اور نہ جانے کتنے دیو قامت سادھوؤں کا ذکر کرتی تھی مگر اسی عمارت کے مہمان خانے سے ملحق ایک بڑا مندر تھا جہاں روز پھولوں کی بارش ہوتی تھی اور گھنٹیاں بجتی تھیں اور پنڈت الیشوری لال اپنا کرچھا گھماتا مسکراتا سب کو پرنام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

سادھو دیوراج میرے رُو برو کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اسے میری گزری ہوئی رات کا سارا افسانہ معلوم ہو چکا ہے۔ سندھیا نے خلوت میں مجھے اور دیوراج کو جو باتیں بتائی ہیں، یہ اُن سے بھی آشنا ہے اور اب حساب کتاب کے لیے مستعد کھڑا ہے کیونکہ اُس نے مجھے شکن آلود پیشانی، بجھے ہوئے چہرے اور کسمساتی ہوئی آنکھوں سمیت پکڑ لیا ہے۔ یہ یقیناً اب کوئی بڑا مطالبہ پیش کرے گا اور میرے پاس پہلو تہی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا لیکن وہ تو اپنا پُرانا مطالبہ دُہرا رہا تھا اور اُس کے لہجے میں حسرت اور یاس نمایاں تھی۔ وہ ریاست کا کوئی عام خاص آدمی نہیں تھا، اُن آدمیوں کی طرح جو کسی کے بارے میں کچھ جان لیتے ہیں تو بات کرتے ہوئے اُن کا انداز تیکھا، لہجہ زہرناک، زبان دُکان دار کی اور سر اُٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اُس کے تیور دیکھ کے میری ہمت بندھی اور میں نے نیچی آواز میں پوچھا۔ "کہاں جانے کو کہتے ہو مہاراج؟"

"جہاں آکاش اور دھرتی کا سمبندھ گہرا ہوتا ہے۔" وہ اپنی مرتعش آواز

میں بولا: ”جہاں ان دونوں کے بیچ میں کوئی دیوار نہیں ہوتی، پیڑوں کی چھاؤں ہوتی ہے تو دھرتی کی اچھا سے ہوتی ہے۔ پہاڑ کی کھوہ ہوتی ہے تو دھرتی کی اپنی اچھا سے ہوتی ہے۔ بالک! تو نے اِدھر بہت سمے بتا لیا، اب اُدھر چل، اپنے نین سکھی کرنے۔ تیری آنکھیں تھک گئی ہوں گی، اتنا ہی بہت ہے۔ اُدھر دیکھ، اب اُسے تیرا انتظار ہوگا، اچھا ہے تو خود ہی وہاں پہنچ جائے۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا: ”مہاراج! کیسی باتیں کرتے ہو، نہ جانے کن خوابوں میں رہتے ہو، کس کا انتظار؟ کہاں کا انتظار؟“ میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا: ”دُور جانے کو کیوں کہتے ہو، آدمی دھرتی اور آکاش کے بیچ ہی کیوں رہے، دھرتی کا حصہ کیوں نہ بن جائے، دھرتی ہی میں نہ مل جائے۔ جل کے خاک ہو جائے یا دھرتی میں چھپ جائے۔ آدمی اپنی آنکھیں کھلی کیوں رکھے، آنکھیں کھلی رہیں گی تو آدمی کو آدمی نظر آئیں گے اور پتھر نظر آئیں گے اور پیڑوں پہ لگے ہوئے پھل نظر آئیں گے، چاہے وہ میدان ہو یا پہاڑ، آدمی تو آدمی رہتا ہے۔ اُس کا سر دھڑ پہ لگا رہتا ہے۔ کہیں اور جانے کی کٹھنائی کیوں کرتے ہو سادھو دیو راج جی؟ جسے انتظار ہوگا، وہ خود آ جائے گا۔“

وہ اضطراب میں گردن ہلانے اور اپنی لاٹھی سے زمین کریدنے لگا۔

”پر تو خود جائے گا تو اور بات ہوگی، تیرے کارن ہم بھی تیرے پیچھے پیچھے چلیں گے بالک؟“ وہ میرے پاس آگیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا: ”باتیں بنانے میں سمے اور آدرش دونوں نکل جائیں گے۔ مذاق مت کر، تیرا جو انتظار کر رہا ہے اُس سے ایسا مذاق نہیں کیا جاتا۔ ایشور نے جو جیون دیا ہے اُسے یوں نہیں لوٹایا جاتا جیسا تو سمجھ رہا ہے۔ یہ آنکھیں جو تیرے شریر پہ چمک رہی ہیں اور یہ سر جو تیرے دھڑ پہ لگا ہوا ہے، ان دونوں کا میل نہیں ہوتا تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اُن کا میل بنانے میں جیون بیت جاتا ہے۔ جب تک یہاں رہے گا تیری آنکھیں نہیں ٹھہریں گی اور جب تک آنکھیں نہیں ٹھہریں، سر بھی نہیں ٹھہرتا۔ تو تو بڑا بھاگیہ وان ہے۔ تجھے پہاڑوں پر اس لیے نہیں جانا کہ اپنی آنکھیں اور سر ٹھہرا کے خود کو پہچاننے کا کٹھن کام کرے، تیرے لیے تو دُوار کھلا ہوا ہے۔“

”کیسا دُوار؟“ میں نے جھنجلا کے کہا۔

”آدرش کا دُوار، بھاگیہ کا دُوار۔ بالک! انجان نہ بن، اپنا جیون تو اِن آنکھوں سے دھند ہٹانے میں بیت گیا ہے اور ابھی دھند ہی دھند دکھائی دیتی ہے۔ تجھے ہمارے سمان ہاتھ باندھ کے تو نہیں لگانی، لکیریں مٹانے کی کوشش نہ کر، اپنا کھوج لگا، تو کہاں کھو گیا ہے؟“ وہ تاسف اور تلخی سے بولا۔

سادھو دیو راج سمجھتا تھا کہ پہاڑوں پر کوئی میرا انتظار کر رہا ہے اور میں جان بوجھ کے انجان بنا ہوا ہوں اور جو سامنے نظر آ رہا ہے، میں نے دانستہ اُس سے نظریں چرا لی ہیں۔ ایشوری لال بھی یہی کہتا تھا۔ میں اُن کی باتوں پہ اپنے تجسس کا اظہار کر کے خود کو ایک جاہل اور اجنبی شخص کے طور پہ پیش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شروع شروع میں اُن کی معنی خیز باتوں پہ میں نے یہ مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لی تھی، انھیں میرے اندر اگر کچھ خوبیاں نظر آتی تھیں تو یہ اُن کی کوتاہی تھی۔ میں یہ جہل کے اپنے اِرد گرد اُن کی دلچسپیاں ختم کرنے کی کوتاہی کیوں کرتا کہ میرے پاس ایسا کوئی وصف نہیں ہے جس کے وہم میں وہ مبتلا ہیں اور ایسی حالت میں جب ریاست کے بہت سے افراد کندھوں پہ بندوقیں اور جیب میں ریوالور چھپائے میرے تعاقب میں رواں ہوں اور کسی مناسب جگہ میرے ستانے کے منتظر ہوں، ان چند لوگوں کی میرے تئیں رغبت ہی غنیمت تھی۔

سادھو دیو راج یاد دہانی کے لیے پھر حاضر ہو گیا تھا اور میرے پاس وہی ایک فرسودہ عذر تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا مگر وہ وقت آئے گا کب؟ میں اس کا کوئی تعین نہیں کر سکتا تھا، ملیں گے، ہاں ضرور ملیں گے۔ اس وقت اسی طرح کی باتیں کر کے میں اُسے اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ ایک بار وہ میری اس حیل و حجت سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب وہ دوبارہ اس قسم کا ذکر نہیں کرے گا لیکن اُس کی زبان پہ تو پھر وہی ورد تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس سے صاف صاف کہہ دوں کہ وہ کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے، میرے خواب و خیال میں بھی ایسا کوئی شخص نہیں ہے جسے پہاڑوں میں میری طلب ہو مگر میں زبان کھولتے کھولتے رہ گیا۔

آئی جی مہتا بھی مجھے ریاست سے نکل جانے کی ہدایت دے چکا تھا اور بڑی حویلی کے خوں ریز واقعے کے بعد ریاست کی کشتی ڈولنے لگی تھی۔ ایسے عالم میں سادھو دیو راج مجھے یہاں سے دُور چلنے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ یقیناً اُس کا ذہن پیش آنے والے واقعات کا مشاہدہ کر رہا ہوگا۔ اُسے اگر میری ذات سے کوئی بڑی توقع تھی تو ایسے حالات میں اس کی توقع قائم ہی رہنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اُس کی توقع غلط نہ ہو اور واقعی کوئی شخص میرا انتظار کر ہی رہا ہو۔ سادھو دیو راج کو مجھ سے اور کیا لاگ ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے وہ کیچو ہی کے سلسلے کی کوئی ہستی ہو۔ وہ جب اتنے وثوق سے اُس کا تذکرہ کرتے تھے تو انھوں نے ضرور کچھ دیکھا ہوگا۔ پنڈت ایشوری لال کا تجسس بھی بے بنیاد نہیں تھا۔ اُس نے میرے پاس آنے والی مہربان کیچو کی خوشبو حیرت انگیز طور پر سونگھ لی تھی۔ اتنے اضطراب اور اشتیاق کا اظہار کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ دونوں سادھو اور پنڈت راجے پور میں رہنے والے ایک ایسے شخص پر کیوں مائل ہو گئے تھے جس کی حیثیت ایک عام ملازم سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ کیچو میرے پاس آتی تھی۔ کبھی آتی تھی، کبھی نہیں آتی تھی۔ وہ اُسے دیوی کہتے تھے۔ ایک دن پنڈت ایشوری لال دیوی کا دیدار کرنے کے لیے پاگلوں کی طرح میرے

کوارٹر میں آیا تھا اور اپنے حال پہ ماتم کرتا رہا تھا کہ اُس نے آنے میں دیر کر دی۔

میں بھول گیا اور بھول اس لیے گیا کہ میرا ذہن یہ باتیں جوں کی توں تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ انگریز ہندوستان پر اپنی مشینوں اور زاروں اور برتر اسلحے سے قابض تھے، کیچھو نے خودکشی یا کہ اشارہ کیا تھا کہ مجھے کچھ درپیش ہے۔ آخری مرتبہ جب وہ آئی تھی تو اُس نے کہا تھا کہ اب وقت آ ہی گیا ہے۔ جب میں نے اُس سے تشریح چاہی تھی تو وہ اپنی عادت کے مطابق اُڑنچھو ہو گئی تھی۔ جو بات کیچھو کہتی تھی، وہی سادھو دیوراج، وہی پنڈت الیشوری لال کہتا تھا اگر میرا دماغ، میرا دل نہیں کہتا تھا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ کوئی اپنے دل اور دماغ کا اس قدر تابع کہاں رہ سکتا ہے۔ اُن سب کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ اب مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے ورنہ اندیشے ہی اندیشے ہیں، وہ ہر خطرے سے پہلے مجھے متنبہ کر دیتے تھے۔ میں اپنے ذہن پہ زور دے کے ہر اوقت ٹال دیتا تھا مگر تابکے! حالات کسی وقت بھی اتنے بے وفا ہو سکتے تھے۔ اتنے ناراض کر اپنے پورے میں سر چھپانے کو جگہ نہ دیتے۔ ممکن ہے اُن کا مقصد یہی ہو کہ اب بھی موقع ہے، بھاگ جاؤ، پہاڑوں میں روپوش ہو جاؤ ورنہ جب تعاقب کیا جائے گا تو کہیں اماں نہ ملے گی، انگریزوں کو اس دیس کے گلی کوچے ہندوستانیوں سے زیادہ معلوم ہیں۔ پنڈت الیشوری لال اور سادھو دیوراج نے ممکن ہے میری آنکھوں میں ایک جگہ ٹھہرنے کی، اندھیرے جسم میں گرمی سردی برداشت کرنے کی کوئی صلاحیت دیکھ لی ہو۔ ممکن ہے انہیں معلوم ہو کہ میرا نام جمشید عالم ہے۔ جمشید عالم جب پہاڑوں میں اُن سادھو سنتوں کے ساتھ بیٹھیں گے تو کیسے اچھے لگیں گے۔ مجھ میں انکار کی مجال نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے شاید مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔

میں نے سادھو دیوراج سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ لرزیدہ آواز میں یہ بتانا مناسب سمجھا کہ ابھی ابھی سندھیا کس عالم میں واپس گئی ہے۔ وہ تو یہیں سے میرے ساتھ جانا چاہتی تھی، میں نے اُسے بمشکل گھر لوٹایا ہے۔ رات بھر اُس پہ گرہن طاری رہا تھا۔ اتنے آنسو جمع کر لیے تھے کہ ایک رات بھی ناکافی ثابت ہوئی، لبالب آنکھوں کے ساتھ واپس گئی ہے۔ میں اُس سے کہے بغیر چلا جاؤں گا تو وہ فوراً اپنے ماتھے کا نشانہ باندھ لے گی اور جھونک میں بہت سے اور لوگوں کو بھی ساتھ لیتی جائے گی۔ میں نے اُسے رات بھر اپنے سینے میں رکھا تھا۔ اُس نے میرے اور میں نے اُس کے کپڑے بھگو دیے تھے۔ سادھو دیوراج نے بھون کے اور بہت سے لوگوں کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اُس سے وضاحت کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑی کیونکہ اُس کے لہجے میں خود عجز شامل تھا، ایک افسوس آمیز عجز۔ افسوس شاید اس بات کا تھا کہ میں گرمی میں جھلسنے پر بہ ضد ہوں اور اُس کی بات توجہ سے نہیں سن رہا ہوں۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا بالک؟" اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ہاں" میں نے چونک کے جھجکتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی۔ "مہاراج! اگر یہ تمہارا حکم ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں، میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیے دیتا ہوں اور اگر یہ تمہارا مشورہ ہے تو میں تم سے کچھ وقت کی اجازت اور چاہوں گا۔ کہیں نہ کہیں تو جانا ہو گا مہاراج!"

"نا نا" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں تجھ پر زور نہیں دے سکتا، پر اگر میرا بس چلتا تو میں تجھے گردن میں رسی ڈال کے لے جاتا۔"

"مجھ پہ تمہارا زور بھی چلتا ہے، میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے لیکن ہو سکے تو ابھی کچھ وقت اور ٹھہر جاؤ۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ہونہہ" وہ کچھ سوچنے لگا اور فکرمندی سے بولا۔ "سمے نکل جائے گا تو میری بات تجھے بہت یاد آئے گی، بہت ستائے گی، سادھو دیوراج تجھ سے منتی کر رہا ہے پگلے! چکنے فرش پر چلنا ہے گا، اتنا پیر پھسلنے کا ڈر رہے گا۔" وہ لجاجت سے بولا۔ مجھے اُس کے تخاطب پر حیرت ہوئی اور خوف بھی آیا کہ میری ذات کا جو ہیولا اُس کے ذہن میں بنا ہوا ہے آگے جا کے وہ مسمار ہو گا اور میری بابت جب اُسے بے حد مایوسی ہو گی تو اُس کی اُداسی اور برہمی کا کیا عالم ہو گا۔ "تو اپنا رستہ کھوٹا کر رہا ہے۔ تیری یہ جگہ نہیں ہے۔ کیا تو کچھ نہیں جانتا؟" وہ ناگوار حیرانی سے بولا۔

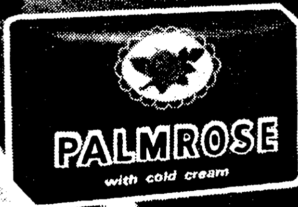
"میں سب کچھ جانتا ہوں" میں نے تیزی سے کہا۔ "پر جسے میرا انتظار ہے، اُسے معلوم ہو گا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔"

اُس نے مڑ کے میرا چہرہ دیکھا پھر اُس کے لبوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی، وہ چپ ہو گیا۔ شاید بہت دیر بعد میں نے ایک معقول بات کہہ دی تھی۔ بھون میں آج تک کسی نے اُسے اس حال میں نہیں دیکھا ہو گا کہ اُس کا ہاتھ ایک لڑکے کے کندھے پر پھیلا ہوا ہو اور وہ اُس سے رازدارانہ باتیں کرتا ہوا سب سے بے نیاز چل رہا ہو۔ عمارت کے اندر پرکاش چند کے خاندان کے سامنے اُس نے مجھ سے اس بے تکلفی کا اظہار کر دیا تھا مگر یہاں تو سبھی دیکھ رہے تھے۔ راستے میں ان گنت لوگ ٹکرائے، مہتر، گوالے، سائیس، پہرے دار، سنتری، باورچی، منشی، بوڑھے، بچے، جوان، باندیاں اور مختلف کاموں پر تعینات خدام، کوئی زمین پر جھک گیا، کسی نے راستہ بدل دیا، کوئی اپنی جگہ ٹھہر گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کے پرنام کرنے لگا۔ کوئی سادھو دیوراج کے پیر چھونے کے لیے آگے بڑھا۔ سب کی نظروں سے حیرت ہویدا تھی کہ سادھو اپنا جسم مجھ سے اس قدر قریب لگائے ہوئے ہے۔ سادھو دیوراج نے کسی کے نمسکار کا جواب نہیں دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے لاٹھی ٹیکے دوسرا ہاتھ میرے شانے پہ پڑے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رہا۔ میں نے یہیں مندر میں

درخشاں چہرے۔ حسین لمحات

پام روز

ٹائیلٹ صابن



پام روز ٹائیلٹ صابن کے ملائم جھاگ
سے لطیف احساسات جاگ اُٹھتے ہیں.
اور اس کی مسحور کن خوشبو سے
انگ انگ مہک اُٹھتا ہے۔

کریسنٹ پاک انڈسٹریز لمیٹڈ
کراچی

بسیرا کرلیا ہے۔ جب تیرا ما تھا جلنے لگے تو میرے پاس آجانا یا میرا دوچار کر لینا، میں خود تیرے پاس آجاؤں گا۔" اُس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سکون سے آنکھیں بند کیں۔ سادھو دیوراج تھکے تھکے انداز میں مہمان خانے کے دروازے تک آ گیا تھا۔ جب ہم مہمان خانے سے گزرے تو مجھے ترنم دکھائی دی لیکن سادھو کی موجودگی کے باعث وہ تتلی کی طرح پھڑ پھڑا کر سمٹ کے رہ گئی۔ مندر کی سیڑھیوں پر سادھو نے اپنا ہاتھ میرے شانے سے اُٹھایا اور وداع ہونے سے پہلے چند لمحوں تک مجھے گھور کے دیکھتا رہا۔ میں اُس سے نظریں نہیں ملا سکا کیوں کہ اُس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ میں نے اپنا رُخ تیزی سے بدل لیا۔ سادھو کی لاٹھی کی آوازیں دُور تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ترنم میری واپسی کی منتظر ہوگی۔ اُس کی نغمگیں آواز نے مجھے روک لیا۔ "آداب!"

"کیسی ہو ترنم؟" میں نے جھینپ کے پوچھا۔

"ہم بہت اچھے ہیں۔" وہ مصنوعی خوش گواری سے بولی۔

"کچھ زندگی کا مزہ آرہا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"بہت۔" اُس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے سرشاری سے جواب دیا۔ "ہمارے لیے یہ تمام لذتیں نئی ہیں۔ پہلے ہم انتظار، دُوری اور طلب کے صرف گیت گاتے تھے اب ہم ان کے کیفیت آشنا بھی ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "ہمارے حجرے میں نہیں بیٹھیے گا؟"

"نہیں اس وقت نہیں۔" میری آواز بھرّانے لگی اور میں نے سنبھل کے ندامت سے کہا۔ "بہت مصروفیت رہی، ادھر آنا نہیں ہو سکا حالانکہ کئی بار ارادہ کیا۔"

"ہمیں آپ کی مصروفیت اور دُکھ کا اندازہ ہے، دُکھ آپ کے چہرے سے نمایاں ہے، آنکھیں سوجی ہوئی ہیں، شاید کئی راتوں سے جاگ رہے ہیں۔ کاش! لے کاش آپ ہمیں بھی کوئی کام بتلاتے۔ ہمیں حکم دے کے دیکھیے۔ ہمیں اپنا دُکھ بتائیے۔ ہماری آرزو بس یہی ہے کہ آپ کبھی کوئی حکم دیں۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔

"ترنم! تم واپس چلی جاؤ۔" میں نے کرب سے کہا۔

"کیا یہ موت کا حکم ہے؟" اُس نے اداسی سے کہا۔

"نہیں ترنم! میں تمھیں موت کا حکم نہیں دے سکتا۔"

"تو پھر آپ واپسی کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، تم میری بات نہیں مانتیں تو مت مانو مگر ایک نہ ایک دن تم ضرور یہ فیصلہ کرو گی۔" میں نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "حالات بہت بگڑ چکے ہیں، کل اور خراب ہو سکتے ہیں۔ تم پھر واپس آجانا، تمھاری یہاں موجودگی سے میرے اعصاب پر ایک بوجھ ہے۔ تم ایک بہت نرم و نازک اور شیشہ بدن لڑکی ہو، ٹوٹ جاؤ گی۔ تم نے ایسے وقت یہاں قدم رکھا ہے جب ہر طرف دھواں اُٹھ رہا ہے اور زمین سے خون اُبل رہا ہے۔ کاش تم پہلے آئی ہوتیں یا مجھے کہیں اور مل گئی ہوتیں پھر میں تمھیں اس طرح مجروح نہ کرتا۔ تمھاری طلب میں بڑی تاثیر ہے مگر ترنم بیج نم مٹی میں اُگتا ہے۔ اِس مٹی میں تو پتھر نکل آئے ہیں اور پانی سُوکھ گیا ہے۔ تمھیں اگر میری خوشی ملحوظ ہے تو میری درخواست قبول کر لو۔"

اُس نے کسی کا خیال نہیں کیا اور مہمان خانے کے سامنے ہی میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ ہمیں گنہ گار کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی خوشی ہر اعتبار سے عزیز ہے لیکن ہم آپ سے ایک بات کہے دیتے ہیں، ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اگر ہم واپس چلے گئے تو پھر نگار خانے میں ہمیں دوبارہ اُسی طرح اپنی نمائش کرنی پڑے گی، پھر ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے، ہماری آواز بیٹھ جائے گی، گھنگروؤں سے ہمارے پاؤں زخمی ہو جائیں گے اور ہم سے ناچا نہیں جائے گا۔ جب بھی واپسی کا خیال آتا ہے، ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہماری بات کسی اور طرح مت سمجھیے گا۔ ہم اگر واپس ہوئے تو ہمیشہ کے لیے واپس ہو جائیں گے۔" اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "ہم آپ سے معافی کے طلب گار ہیں، ہم نادم ہیں کہ ہم نے آپ کے سامنے آ کے آپ کی پریشانیوں میں اضافہ کیا لیکن ہم کیا کریں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اب خود کبھی آپ کے سامنے نہیں آئیں گے۔ آپ کا انتظار کرتے رہیں گے اور کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم آپ کے اعصاب پُرسکون رہنے کی دُعا کریں گے۔ خدا ہماری دعا ضرور سُنے گا کیونکہ وہ ہمارے دل سے نکلی ہوئی دعا ہو گی۔ ہم آپ سے صرف اتنی منت کرتے ہیں کہ ہمیں کہیں جانے کو نہ کہیے۔ ہم اسی کونے میں پڑے رہیں گے اور آپ کو بالکل نہیں ستائیں گے۔"

"ترنم! ترنم!" میں نے وحشت سے اپنے کان بند کر لیے۔ "خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ، میں اپنے لفظ واپس لیتا ہوں جو تمھارے جی میں آئے کرو، کہیں بھی رہو، کہیں بھی رہو۔ تم سے کوئی جانے کو نہیں کہہ رہا۔"

"خدا ہمیں معاف کرے لیکن ہم نے یہ سب کچھ دانستہ نہیں کہا، بس ہمارے منہ سے نکل گیا۔ ہم نے قسم کھائی تھی کہ آپ کے سامنے زبان نہیں کھولیں گے۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "کہیے کہ آپ نے درگزر کر دیا؟"

"ترنم!" میں نے خستگی سے کہا۔ "مجھے موقع نہیں ملا کہ تم سے یہاں کے تمام حالات بیان کر سکوں۔ میں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی ہے کہ مجھے حکام کی جانب سے ریاست سے نکل جانے کا حکم ملا ہے۔ تم بھی کسی سے اس کا تذکرہ مت کرنا۔ ہر آنے والا لمحہ بے یقین لمحہ ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار اشاروں میں اپنی ناگفتنی کیفیتوں کا حال بیان کیا تھا۔ تم نے اُس پہ غور نہیں کیا۔ یہ ایک ریاست ہے ترنم! اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح جما لو کہ یہ ایک ریاست ہے، یہاں کی سیاسی سماجی فضا مختلف ہے۔ یہاں افراد کی حکمرانی

ہے اور یہاں وہ تمام اُلجھنیں موجود ہیں جو ایک خاندان یا برادری کے مختلف افراد کے درمیان ہوتی ہیں۔ تم دلّی سے آئی ہو۔ دلّی اور راجے پور میں بہت بڑا فرق ہے۔ شاید، شاید میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے اُلجھتے ہوئے کہا "کہ بس تمھیں کچھ نہیں معلوم۔"

"ہمیں بہت کچھ معلوم ہے اور ہم یہ سوچ سوچ کے پریشان ہوتے رہتے ہیں کہ ہم آپ کے کیا کام آسکتے ہیں۔ ہم نے باندیوں، ڈالی بہن اور یہاں کے بہت سے لوگوں سے حالات کی کچھ کچھ سُن گُن لی ہے مگر ہمیں کوئی پروا نہیں، ہم سود و زیاں پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے تو آپ کو تلاش کر لیا ہے یہی بہت ہے اور اب جو کچھ بھی آپ کے ساتھ ہے، وہی ہمارا بھی نصیب ہے۔ ہم اپنی قسمت پہ شاکر رہیں گے لیکن آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ریاست سے نکل جانے؟..." اُس کی بات گلے میں رُندھ گئی۔

"ہاں، ممکن ہے حکم عدولی پہ وہ مجھے لینے آجائیں، تمھیں معلوم ہوگا کہ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔"

"لیکن کیوں؟ کیوں؟ یہ کیسے لوگ ہیں جو آپ کا چہرہ نہیں دیکھتے؟ ہمیں یقین ہے کہ آپ کوئی گناہ نہیں کر سکتے۔"

"تمھارے یقین سے کیا ہوتا ہے ترنم! اور گناہ چہروں پہ کب لکھے ہوتے ہیں اور خصوصاً یہاں تو گناہ کی کچھ اور ہی ریت ہے۔ یہاں گناہ کا مطلب بیداری ہے، یہاں گناہ ایک تلوار، ایک ڈھال ہے، جو بھی ذرا جوکتا ہے، گناہ کا اطلاق اُسی پہ ہوتا ہے اور جو جواب دینے کی قوت نہیں رکھتا اُسے مسلسل گناہوں کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھو گی کیونکہ تم نے اپنی مختصر عمر سوز و ساز اور خواب و خیال میں گزاری ہے۔"

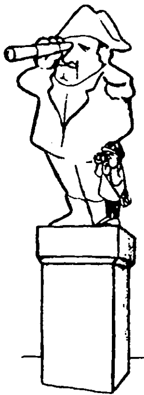
"اب ہم ایسے بھی نہیں ہیں کہ سفید اور سیاہ کی تمیز نہ کر سکیں۔ خود آپ کی عمر کون سی بڑی ہے۔ دیکھیے، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم اگر آپ کی مجبوریاں جانتے نہیں تو محسوس ضرور کرتے ہیں۔ بتائیے پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر وہ خدانخواستہ آپ کو لینے آ گئے؟ خدا نہ کرے اگر وہ پھر بدگماں ہو گئے ....؟"

"تو مجھے اُن کے ساتھ جانا پڑے گا اور واپسی کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کبھی واپسی نہ ہو۔ ترنم! اتنی ہی سنگین صورتِ حال ہے۔"

"نہیں، نہیں، ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری دعائیں بے اثر نہیں جائیں گی۔ کیا.... کیا آپ اُن کے حکم کے مطابق کچھ دنوں کے لیے ریاست چھوڑ نہیں سکتے؟" وہ سادگی سے بولی۔

"نہیں، فی الحال یہ ناممکن ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کاش وہ آپ کی جگہ ہمیں لے جائیں۔ کاش یہاں آنے سے پہلے اُن کے دل آپ کی طرف سے صاف ہو جائیں، کاش وہ اپنا ارادہ بدل دیں، کاش آپ انھیں نظر ہی نہ آئیں...." اُس کے رخساروں پر شبنم گرنے لگی۔



ہم مہمان خانے سے مندر کی طرف جانے والے راستے میں کھڑے تھے۔ دنیش چندر کے حکم سے مہمان خانے کے خاص حصّوں میں سے ایک حصّہ ترنم کو تفویض کر دیا گیا تھا۔ ترنم سے سرِ راہ اتنی دیر تک باتیں کرنا ایک نازیبا بات تھی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کی خیر خبر لے کے فوراً آگے بڑھ جاؤں گا مگر میں رُکا رہا۔ کئی لوگ کن انکھیوں سے ہم دونوں کو مہمان خانے کے ستون کے پاس گفت گو کرتے ہوئے دیکھ کے گزر چکے تھے۔ دلّی سے آئی ہوئی اس نوخیز مغنّیہ کا اتنے دنوں تک بھون میں قیام سب کے لیے حیرت کا موجب ہوگا۔ ترنم کو بھی کچھ خیال نہیں رہا، مجھے دیکھ کے وہ ہر احتیاط بھول گئی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ دعا کے علاوہ وہ میرے لیے اور کیا کر سکتی ہے۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ زندگی میں جتنے کم خواب دیکھے جائیں، اتنا ہی زندگی کے لیے سود مند ہے۔ اُس کی آنکھوں کی نیل گوں جھیل میں بار بار ارتعاش ہو جاتا تھا اور اُس کے لبوں کی گلابی مچھلیاں بار بار تڑپ جاتی تھیں۔ مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آئی جی مہتا کی بات اُسے نہیں بتانی چاہیے تھی۔ یہ سُن کے اُس کے رخساروں پہ زردی جم گئی تھی۔ میں اُسے اس عالم میں چھوڑ کے آگے بھی نہیں بڑھ سکتا تھا اور اتنا اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اُس سے کچھ کہنا فضول ہے۔ اب اُس کی سُرخی واپس کرنے کے لیے یہی کہنا رہ گیا تھا کہ پہلے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ ہے۔ وہ اُسے چھیڑنے کے لیے ایک مذاق تھا۔ اتنی سی بات پر اُس کا یہ حال ہو گیا مگر مجھے تردید کرنے کی فرصت نہیں ملی کیونکہ پیچھے کہیں دُور سے ایک نعرہ بلند ہوا۔ میں نے پلٹ کے مندر کی طرف دیکھا، پنڈت الیشوری لال کرچھا گھماتا ہوا وحشیانہ قدموں سے میری جانب آ رہا تھا۔ ترنم نے مجھے اور میں نے اُسے بے چارگی اور کس مپرسی سے دیکھا۔ میں کچھ کہے بغیر چپکے سے آگے کی جانب کھسک گیا۔ الیشوری لال کے نعرے تیز ہو گئے تھے مگر میں تقریباً بھاگتا ہوا مہمان خانے

کے احاطے سے دُور نکل آیا۔

میں گزشتہ رات نو بجے سے دنیش چندر کے محل سے غیر حاضر تھا اور اب دھوپ منڈیریں چھوڑ رہی تھی۔ دنیش نے میری تلاش میں ہرکارے دوڑا دیے ہوں گے۔ اول تو وہ دیر تک جاگتا رہا ہوگا اگر اُسے نیند آ بھی گئی ہوگی تو وہ صبح اُٹھ کے بے تاب ہو رہا ہوگا کہ اب میری کوئی خبر آتی ہی ہوگی۔ وہ اپنے آپ پہ سخت برہم ہوگا کہ اُس کی نظریں چند لمحوں کے لیے مجھ سے اوجھل کیوں ہو گئیں۔ اُسے بڑی حویلی کی واردات میں مجھ پہ انگلی اُٹھائے جانے کی سُن گُن مل گئی تھی بلکہ اسے سُن گُن کہنا غلط ہے۔ راج کمار دنیش چندر اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ میرے بارے میں تکلف سے کام لیا جا رہا ہے اور یہ تکلف محض انھی کی خاطر ہے۔ اُن کی برگشتگی کا خیال دامن گیر ہے کہ جواب دیتے وقت وہ کہیں اوسان نہ کھو بیٹھیں، خواہ مخواہ کی اُلجھن ہوگی۔ بہتر ہے کہ کوئی درمیانی راستہ اختیار کیا جائے تاکہ اُن کی زبان بھی بند رہے اور میرے ہاتھ بھی باندھ لیے جائیں۔

مگر دنیش چندر کے پاس جانے اور اپنی غیر حاضری کا معقول عذر کرنے کے بجائے میری آنکھیں سندھیا کے لیے مچل رہی تھیں۔ میں نے اُس سے چلتے چلتے کہا تھا کہ وہ لباس تبدیل کرکے دنیش ماما کے محل میں آ جائے کیونکہ اندھیرے کے سبب میں تمام رات اُسے اچھی طرح دیکھ نہیں سکا ہوں۔ سندھیا، تمام رات ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ میرے ہی جسم کا حصہ ہے۔ وہ جب چلی گئی تو ایسا لگا جیسے جسم میں کسی چیز کی کمی ہو گئی ہے۔ وہ اتنی بڑی تھی کہ میں اُسے نگل نہیں سکتا تھا اور وہ اتنی چھوٹی تھی کہ میرے بازوؤں کو اُس کے چھٹنے اور ٹوٹنے کا ڈر رہتا تھا۔ وہ اُس کی مخملیں، عنبریں، کلی کلی انگلیاں، میں نے رات بھر انھیں ہونٹوں سے لگائے رکھا تھا۔ اُن انگلیوں نے پستول کا بوجھ اُٹھایا تھا۔ لاکھی پور کے بدمعاش بے غیرت نکلے۔ اتنے ساتھی جُدا کروانے کے بعد بھی انھیں جھرجھری نہیں آئی۔ میں نے اُن کے متعلق خوش گمانی کرکے بڑی کج فہمی کا ثبوت دیا تھا۔ نمک تو اُن کی نس نس میں گھل گیا تھا۔ نمک آدمی کو کتنا کمزور، کتنا بزدل کر دیتا ہے۔ اچھا ہوا کہ سندھیا نے مجھے بروقت مطلع کر دیا۔ میرے ذہن کا غبار چھٹ گیا اور مجھے اُن کے قد میں ترمیم کرنے کا موقع مل گیا۔ دل بدمعاشوں کو بہ داد بڑے بخل سے دے رہا تھا۔

دنیش چندر کے محل کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اُس کی وحشت کی خبریں مل گئی تھیں۔ شاید کسی نے بتا دیا تھا کہ صبح سویرے مجھے سادھو دیو راج کے ساتھ مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مہمان خانے سے کچھ دور ایک بدحواس پہرے دار نے مجھے راستے ہی میں آ لیا اور ہانپتے ہوئے راج کمار کی فوری طلبی کا حکم سنایا۔ میں نے رفتار تیز کر دی لیکن ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ دنیش کے محل کے پورٹیکو میں مجھے پولیس کی جیپ نظر آئی۔ پولیس کی ان گاڑیوں کی مجھے اچھی خاصی شناخت ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے چلنے والے پہرے دار کو دفعتہً روک لیا۔ ”اس گاڑی میں کون آیا ہے؟“ میں نے تلخ و تند لہجے میں پوچھا۔ میرے اچانک ٹھہر جانے سے وہ پہلے ہی سٹ پٹا گیا تھا اس لیے گھور کے گاڑی دیکھنے لگا اور لرز کے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم موہن بابو! یہ گاڑی ابھی آئی ہے۔ جب میں راج کمار کے کمرے سے آیا تھا تو وہاں کماری شاردا کے سوا کوئی نہیں تھا۔ راج کمار نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کو اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں۔“ گاڑی پولیس کی تھی اس لیے میں آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ٹھہر کے فیصلہ کرنے لگا۔ یہ نوجوان پہرے دار بھی راجے پور کے جیل خانے میں اپنے جسم پر متعدد نشانات ڈلوا کے آیا تھا اس لیے گاڑی آسانی سے پہچان گیا۔ ”تم اپنے کام پر جاؤ، راج کمار پوچھیں تو کہہ دینا کہ تم نے مجھ تک پیغام پہنچا دیا ہے۔“ میں نے حکمیہ انداز میں اُس سے کہا۔

”ٹھیک ہے موہن بابو! اگر آپ کہیں تو میں اُس طرف واپس ہی نہ جاؤں۔ جب یہ لوگ چلے جائیں گے تو آپ خود ہی راج کمار کے پاس پہنچ جائیں گے۔“ وہ ایک سمجھ دار نوجوان تھا۔ جیل کے رشتے سے اپنا ہم جماعت تھا لیکن مجھے اُس کے اس اخفا اور رازدارانہ انداز سے سُبکی محسوس ہوئی۔

”زیادہ بات مت کرو۔“ وہ میری بھاری آواز سے سہم گیا۔ ہم دونوں نے راستہ بدل دیا۔ گیراج کے قریب کچھ دیر ٹھہر کے میں نے دنیش کے محل کے پچھواڑے کی جانب رُخ کر لیا۔ پہرے دار راستے ہی میں مجھ سے جُدا ہو گیا۔ ہر حرکت کی کوئی علت ضرور ہوتی ہے۔ اس وقت پولیس جیپ کی آمد بھی کسی خاص مقصد سے ہوگی۔ سب سے پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا، وہ اس کے سوا کچھ اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کہ آئی جی مہتا کی حجت تمام ہو گئی ہے اور اُس پہ کچھ ایسا دباؤ ڈال دیا گیا ہوگا، ایسی شہادتیں پیش کرکے قائل کر دیا گیا ہوگا کہ اُس کے پاس مفر کی کوئی صورت نہ رہی ہوگی۔ انسانوں نے بڑی ترقی کر لی ہے اور سب سے زیادہ ترقی دلیلیں ایجاد کرنے کے پیشے میں کی ہے۔ سادھو دیو راج کی صبح صبح آمد اور حسرت و یاس کا منظر میری نظروں میں اُجاگر ہو گیا۔ بہرحال اب بھی کچھ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں یہیں سے باہر کی طرف کوچ کر سکتا تھا اور پہاڑیوں پہاڑیوں گزرتا ہوا راجے پور کی سرحدوں سے دُور ہو سکتا تھا۔ راستے میں پیش آنے والے خطروں کے لیے میرے پاس پستول موجود تھا۔ دوسری صورت میں پستول بھی چھنتا اور اُسے چلانے والے ہاتھوں پر تالا بھی ڈال دیا جاتا یا پھر میں دو تین جستوں میں جیل خانے جانے والے راستے پر گام زن ہو سکتا تھا۔ سادھو دیو راج نے اشارہ کیا تھا کہ دل میں اُس کی طلب کی جائے گی تو وہ کشاں کشاں چلا آئے گا۔ میں نے

سوچا سادھو کو آزما کے دیکھوں پھر اُس کے ساتھ باہر جانا نہ جانا تو آخر وقت تک میرے اختیار میں ہوگا۔ ذرا اس بے تار کے تار سلسلے کا تجربہ تو ہو جائے گا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

آئی جی مہتا کل سے پہلے آتا تو شاید میں انکار کی جسارت اس شدّومد سے نہ کر پاتا جتنی اب کرنے کی قوّت اپنے اندر رکھتا تھا۔ پرسوں رات شاردا نے اپنے آنسوؤں سے میرے مُرجھائے ہوئے اعصاب کو نمو دی تھی چنانچہ سویرے سویرے میں نے راج محل جانے کی ہمّت باندھ لی۔ رات سندھیا نے جسم کے اس ناتواں پودے پر اپنے آفتاب و ماہتاب بدن کی کرنیں چھینکی تھیں۔ ہر آدمی کے پاس ایک دریا، ایک آفتاب، ایک ماہتاب، ایک جاڑا، ایک گرمی، ایک برسات ہوتی ہے لیکن اُن پہ اُسے اختیار نہیں ہوتا۔ حُسنِ طلب اور شدّتِ شوق کی بات ہوتی ہے تبھی سوتے پھوٹتے ہیں۔ کسی کے جسم پر جاڑے کا موسم غالب آتا ہے تو کوئی ہم نفس، ہم نشیں ہی اپنی حرارتیں نچھاور کر کے اسے ٹھٹھرنے سے بچاتا ہے۔ یہ میکانکی عمل ہے، کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ کیا کچھ ہو گیا۔ کسی کے قریب آنے سے کیا ہوا۔ آدمی آدمی کے درمیان یہ حُسنِ طلب، یہ شدّتِ شوق پیدا ہو جائے تو زندگی کی کھیتی ہری بھری رہا کرے۔ پر یہاں تو کوئی بادِ بہاری چلاتا ہے کوئی چشمے کی طرح بہتا ہے کوئی کرنیں بکھیرتا ہے اور کوئی یہاں آگ بھر دیتا ہے یا اولوں کے پتھر پھینک دیتا ہے کچھ اور نہیں بنتا تو گولی کا نشانہ لیتا ہے اور خنجر لے کے دیوانگیاں کرتا پھرتا ہے۔

آئی جی مہتا اور ریاست کے دوسرے افراد کی نظر میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی کہ مجھے ایک تنہا شخص نہیں ہونا چاہیے میرے بارے میں جب بات ہوئی ہو گی تو اُس نے دوسرے افسران اور متعلقہ لوگوں کو یہ باور کرانے میں جھجک محسوس نہیں کی ہو گی کہ جب میں چھاؤنی کے زنداں میں مقیم تھا تو کھنڈرات میں دو انگریز مارے گئے تھے، جگ دیپ کے ہاں جس دن سریش چندر کے ساتھ دوسرے لوگوں کو گولی ماری گئی، اُس دن میں پولیس افسران کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ حالیہ واقعے میں کماری انیتا نے گواہی دی تھی کہ میں وقوعے کے وقت اُس کے ساتھ تھا۔ کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہائی کمان سے آنے والے تین کرنیلوں اور تین انگریز سنتریوں کا کام تمام کرنے کے لیے شانت محل میں صرف ایک شخص داخل ہوا تھا یا یہ اسی کے ذہنِ رسا کی کرشمہ سازی تھی۔ آئی جی مہتا نے مجھ پر کمند پھینکنے سے پہلے ان پہلوؤں پر متعلقہ حضرات کی توجہ ضرور مبذول کرائی ہو گی، تاہم کنور جگ دیپ کا شدید اصرار ہو گا کہ اُس شخص کو ایک بار اور آزما لیا جائے اگر وہ تنہا نہیں ہے تو سرغنہ ضرور ہے۔ اُس رات آئی جی سے نصیحت سُن کے میں نے اپنی جانب سے دو دن کی رعایت رکھ لی تھی۔ دو دن بعد آئی جی کو پوچھنا چاہیے تھا کہ میں نے کیا سوچا ہے لیکن تیسرا دن بھی گزر گیا اور آئی جی نے خبر نہیں لی۔ اب اگر وہ راج کمار دنیش چندر سے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی رسمی اجازت لینے یا انھیں اطلاع دینے کے لیے آیا ہے تو صورت کیا بنے گی۔ راج کمار آئی جی مہتا پر قہر و غضب کا اظہار کریں گے مگر سر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ میں ظاہر ہے بھون میں موجود ہوں گا اور مجھے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا جائے گا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں آئی جی مہتا اور سادھو دیو راج کی ہدایت کے مطابق ریاست کو خیرباد کہہ ہی دوں۔ آئی جی کم سے کم اتنی مروّت ضرور کرے گا کہ اپنی بند گاڑیوں میں مجھے عزّت اور احترام کے ساتھ سرحد کے باہر چھوڑ دے یا پھر میں مہاراجا امرناتھ والیٔ ریاست راجے پور اور راج کماری کنول کی فرمائش کے مطابق راج محل جا کے کورنش بجا لاؤں۔ وہاں کنول ہو گی جس کی جلد اتنی نازک ہے کہ ایک ذرا بے احتیاطی کرو تو بال پڑنے کا اندیشہ لاحق ہو لیکن راج محل جانے کا بھی صرف یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ مزید ایک دن کی مہلت مل جائے گی تیسرے دن پھر وہی نقشہ ہو گا تو راج محل کو بھی پرنام۔

میں پچھواڑے میں ملازموں کے کوارٹروں سے گزرتا ہوا ایک طویل راستہ کاٹ کے راہ داری میں داخل ہو گیا اور آگے بڑھنے کے بجائے ایک زینے کے نیچے بیٹھ کے خیالوں کے جال بُننے لگا۔ فرض کیجیے آئی جی یا اُس کے ماتحت پروانہ لے کے آئے ہیں تو کچھ اور مہلت لینے کا وقت گزر چکا ہے۔ مجھے اپنی شہ رگ تڑختی ہوئی محسوس ہوئی۔ آئی جی سے مجھے گزارش کرنی تھی کہ ازراہِ عنایت صرف چند دن اور عطا فرما دیں۔ بعد میں شاید اس زحمت کی ضرورت ہی نہ پڑے، تعلّقِ خاطر کی وجہ سے اُمید تھی کہ شاید یہ منّت اُس کی بارگاہ میں قبولیت کا شرف حاصل کر لے۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس وقت اُن کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کا مطلب

ایک

صاحب نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بُلایا تھا۔ مقرّرہ وقت پر مدعو مہمانوں کے ساتھ غیر مدعو طفیلی بھی دعوت میں پہنچ گئے۔ میزبان نے کھانے سے پہلے مہمانوں کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا "خواتین و حضرات! میں حیران ہوں کہ آپ میں سے کس کا شکریہ ادا کروں؟ اُن صاحبان کا جنھیں میں نے بُلایا تھا اور وہ تشریف لائے یا اُن حضرات کا جنھوں نے بُلائے بغیر آنے کی تکلیف برداشت کی۔



کسی

شریر اور بدتمیز لڑکے نے بڑی عمر کے ایک آدمی سے کہا "چچا! ذرا ٹھیریے۔ میری ہتھیلی میں کھجلی ہو رہی ہے۔ ایک چپت کھاتے جائیے۔"

بڑی عمر کے آدمی نے جواب دیا "بھتیجے! مجھے ذرا جلدی ہے تم یہ چپت میرے بھائی کو مار دینا۔"

تھا کہ خود سے ایک طویل یا مکمل انقطاع۔ سندھیا کو مایوس کرنے کے خیال سے میرے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ پہلے آئی جی نے رعایت دی تھی، اب خود مجھے اُس سے بہر حال رعایت لینی تھی۔ اور اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا تو کچھ اور سوچنا ہوگا۔ لمبا سفر کرنے سے پہلے بہت سے معاملات نمٹانے ضروری تھے۔

میں فوراً اُٹھ گیا۔ آدمی کی رفتار اُس کے فیصلے سے مشروط ہوتی ہے۔ فیصلہ نہ ہو تو وہ سیدھا نہیں چلتا۔ میں ایک فیصلہ کر کے اُٹھا، دُوسرے راہ داری میں کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جلد ہی میں ایک کمرے میں داخل ہو گیا جو بلیرڈ کھیلنے کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں وقت گزاری کے لیے اور بھی بہت سی چیزیں تھیں، روزانہ اس کی صفائی ہوتی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میزیں چمکانے والے خادم نے مجھے آتا دیکھ کے اپنا کام روک دیا۔ میں نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔ فوراً فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، دوسری طرف سے فون اٹھانے میں دیر ہوئی، پھر جیسے ریسیور میں شعلہ سا لپکا۔ تنار دا کی بے قرار آواز چہکی "کہاں ہو تم؟" ایک لمحے کے لیے تو میں گنگ ہو گیا۔ تنار دا کی آواز سے اُس کا مضطرب سراپا آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ میں نے سنبھل کے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ "ابھی زندہ ہوں۔"

"اوہ مگر..." وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ اُس کے قریب ہی چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی آوازیں ریسیور میں گونج رہی تھیں۔

"سنو تنار دا! باقی باتیں پھر ہوں گی۔" میں نے اُس کی جھجک کے توقف کے دوران میں سرگوشی کی۔ "مناسب ہو تو دنیش بابو سے میری بات کرا دو۔"

"مگر — تم، تم۔" وہ کرب سے ہکلانے لگی۔

اُس کی آواز رُندھنے سے پہلے میں نے چپکے سے کہا۔ "ایک اہم بات ہے۔"

میں اُس سے اثبات یا نفی میں پوچھ سکتا تھا کہ وہاں موجود لوگوں کو میری طلب ہے یا اُن کی آمد کا مقصد کچھ اور ہے؟ لیکن تنار دا کا مزاج ان سوالوں کا متحمل نہ ہوتا، وہ تو چھلک پڑتی۔ بدقسمتی تھی کہ فون اُس نے اُٹھایا۔ گھبرا گئی ہو گی کہ میں نہ جانے کہاں سے بات کر رہا ہوں۔ ریسیور پر چند لمحوں تک سکتہ طاری رہا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں قریب ہی موجود ہوں اور کوئی خاص بات نہیں ہے حالانکہ فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ فون کرنے اور اس طرح بات کرنے کا یہ عمل ہی مشکوک اور مخدوش ہے۔ پھر دنیش کی آواز پر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ شاید اُسے تنار دا نے نہیں بتایا تھا کہ فون پر میں مخاطب ہوں۔ میرے نام پر وہ جز بز ہونے لگا۔ "کیا مجھے اس وقت آ جانا چاہیے؟" میں نے اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بجائے مختصراً کہا۔

"آؤ نا، یہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔" پہلے وہ گھبرایا پھر اُس کا لہجہ شگفتہ ہوتا گیا۔ "مجھے تم سے کچھ کام ہے۔"

"میں آ رہا ہوں۔" میں نے دوبارہ تائید چاہی۔

"میں تمھارا منتظر ہوں۔" اُس نے مہذب لہجے میں کہا۔ کسی کو گمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ وہ ایک ملازم مسمی موہن داس سے مخاطب ہے لیکن اتنی مختصر بات چیت میں سب کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اُس سے کوئی بہت ہی قریب کا شخص ہم کلام تھا۔ دنیش کی آواز چہکی ہوئی تھی۔ میں نے فون رکھ کے تین چار لمبی لمبی سانسیں کھینچیں کیونکہ اگر فی الحال آئی جی جیتا یا اُس کا کوئی نمائندہ میرا پروانہ لے کے نہیں آیا ہے تو بھی یہ مطلع صاف ہونے کی نشانی نہیں ہے، ابھی تلوار میان میں نہیں رکھی گئی ہے۔ بلیرڈ روم سے نکل کے میں خراماں خراماں راہ داری کا سرخ قالین عبور کرتا ہوا ملاقاتی کمرے میں پہنچا تو دنیش کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں مگر اُس نے بردباری کا ثبوت دیا، میری آمد پر کسی گہرے تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ وہاں ریاست کی پولیس کے دو اعلا افسران کے ساتھ تین اور اجنبی لوگ افسرانہ تیوروں سے بیٹھے ہوئے تھے، سوٹ بوٹ کیل کانٹے سے لیس، عمریں کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں تھیں۔ میں نے رسمی طور پہ انھیں پرنام کیا۔ باقی دو افسران میرا چہرہ پہچانتے تھے، وہ اپنے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹیں لا کے رہ گئے۔

"راج کمار دنیش چندر کا خاص آدمی موہن داس!" ایک پولیس افسر نے تیکھے لہجے میں دوسرے افسروں کو مخاطب کیا۔ دنیش نے اپنے ہونٹ سکوڑ لیے۔

"اور موہن داس! ان سے ملو۔" دنیش کی آواز میں تلخی کی لرزش تھی، "یہ تینوں صاحبان بڑی حویلی میں ہونے والی واردات کی تحقیق کے لیے مختلف مقامات سے آئے ہیں۔ ان کے شبھ نام ہیں مسٹر کیول، مسٹر سراج، مسٹر سوشیل۔"

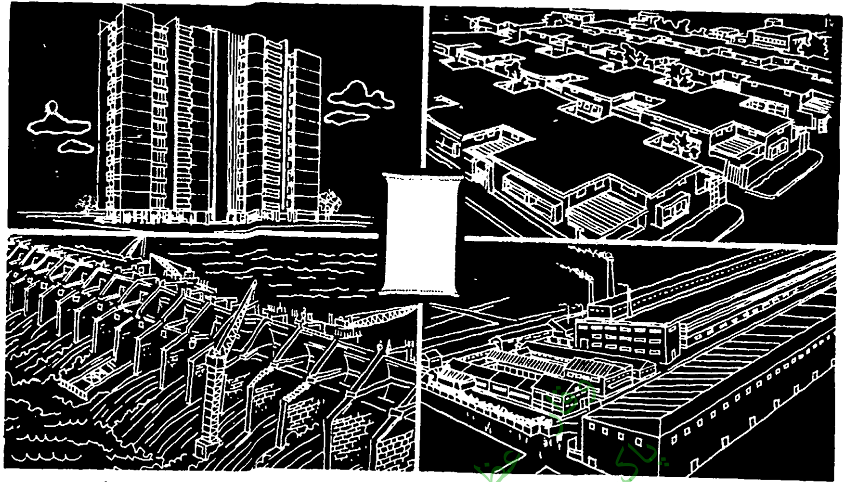
میں نے انھیں دوبارہ پرنام کیا۔ انھوں نے درشتی سے مسکرا کے جواب دیا۔ اُن میں سے ایک بولا۔ "جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ہم یہاں آپ کے تعاون کے بغیر اپنا کام بخیر و خوبی انجام نہیں دے سکتے۔"

میرا جی چاہا کہ زبان کھولوں لیکن تنار دا کا خیال کر کے خاموش رہا۔ تمام افسران ہمارے اثباتی جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ "آپ بھی اپنی جیسی کوشش کر لیجیے۔" دنیش نے اکتا کے کہا۔ "جہاں تک تعاون کا معاملہ ہے، پرکاش بھون میں یہ پھل خوب ملتا ہے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ۔" تقریباً سب ایک ساتھ بھن بھنائے۔

"لیکن ایک بات ہے۔" میں نے درمیان میں دخل دیا۔ سب کے چہروں پہ حیرانی پھوٹ پڑی۔ "ایک بات کا خیال رکھیے۔" میں نے پورے تحمل سے کہنا شروع کیا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ حضرات تفتیش کے کام کے ساتھ ساتھ شہر راجے پور کے جغرافیائی، تاریخی اور سماجی پس منظر کا بھی مطالعہ کرتے رہیں۔ اس سے آپ کے کام میں آسانی ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں، موہن سچ کہتے ہیں۔ مثلاً یہاں کی آب و ہوا کیسی ہے، مٹی کیسی ہے، پانی کیسا ہے، کون سی فصلیں اُگتی ہیں، درجۂ حرارت کس موسم میں کیا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔" دنیش کی کسیلی ہنسی میں سب اُس کا ساتھ دینے لگے۔ آدمی



ہر طرف تعمیر ہی تعمیر... اور سیمنٹ کی بے تحاشہ مانگ

عوامی حکومت کی بے مثال سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی بدولت سرکاری اور نجی دونوں شعبوں میں تعمیر و ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ کراچی اسٹیل ملز اور بندرگاہوں جیسے عظیم منصوبے اور متعدد بند۔ پل۔ کیمیائی کھاد کے کارخانے۔ سیمنٹ۔ فیکٹریاں۔ بھاری انجنیئرنگ کے کارخانے اور کیمیکل پلانٹ بڑی تیزی کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ ملک میں اس وقت تقریباً ۲۰ لاکھ مکانوں کی کمی ہے۔ جسے پورا کرنے کے لئے حکومت نے لاکھوں پلاٹ الاٹ کئے ہیں۔ مالیاتی اداروں کو مکانوں کی تعمیر کے لئے قرضے دینے کی ہدایت کی ہے اور کم لاگت کے مکان نیز بڑے بڑے شہروں میں کئی منزلہ عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کے لئے تعمیرات کو باقاعدہ صنعت کی حیثیت دے دی ہے۔ شہروں میں تعمیرات کی کثرت کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں سیمنٹ کا استعمال بڑھ جانے کی وجہ سے سیمنٹ کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان نے ۷۳-۱۹۷۲ کی ۲۸ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن کی پیداوار کے مقابلے میں ۷۵-۱۹۷۴ میں ۳۲ لاکھ ۶۸ ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا ہے اور آج سیمنٹ کے کارخانے رات دن کام کر کے اپنی گنجائش کی ۹۵ فیصد کی حد تک پہنچ چکے ہیں لیکن پیداوار اور مانگ میں اب بھی بہت فرق ہے اور یہ فرق ۱۹۷۸ میں اس وقت دور ہوگا جب سیمنٹ کے موجودہ زیر تعمیر کارخانے کام شروع کر دینگے دراصل ۱۹۶۸ کے بعد سیمنٹ کا کوئی نیا کارخانہ لگانے کی طرف سابقہ حکومتوں نے توجہ ہی نہیں دی اس کا خمیازہ قوم کو آج بھگتنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ آج تعمیرات کی لاگت کم کرنے اور سیمنٹ کی بچت کی بہت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ـــــ

- ماہرانہ مشورے حاصل کیجئے
- تعمیر میں بے جا صرف سے گریز کیجئے
- سیمنٹ رکھنے کا مناسب انتظام کیجئے

سیمنٹ بچائیے اور اپنی رقم بھی

ضرورت سے زیادہ سیمنٹ ہرگز استعمال نہ کریں



اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان

کہیں اُٹھے بیٹھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔" نہیں نہیں۔" دنیش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے ناہر زمین کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کوئی زمین بہت نرم کوئی بہت سخت، کوئی سیدھی سادی کوئی بڑی تیز و طرار ہوتی ہے۔ انسانوں کا مطالعہ اُن کے ماحول کے جائزے کے بغیر ادھورا ہے۔"

"بلا شبہ، بلا شبہ، ہمارے پیش نظر ہر بات رہے گی۔" ایک افسر نے سنجیدہ ہو کے مخاطب لہجے میں کہا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ توقعات پر پورے اُتریں۔"

اُسی لمحے خاطر تواضع کی ٹرالی آ گئی۔ نِشا دا اُٹھ کے اندر چلی گئی لیں بھی وہ اُن سے الگ تھلگ بیٹھی تھی اور آنکھیں کسی کتاب پر، کان اس طرف کیے ہوئے تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے اپنے اعصاب نسبتاً آسان محسوس کیے۔ باندیوں نے چائے بنا کے اُن کے سامنے رکھ دی اور شکر دان کا پٹ کھول دیا۔ نمک اور شکر کا اثر سب پہ ہوتا ہے۔ پرکاش بھون میں اپنے اس اعزاز کا ذکر نوواردوں کو اپنے اپنے گھر واپس جا کے تو کرنا ہی تھا اور یہاں بھی اس کا ذائقہ انھیں قدم قدم پہ یاد رہے گا۔ یہ ذائقے زندگی کا لبِ لباب ہوتے ہیں، وہ ذائقے جو گزر گئے، تلخ شیریں ترش، وہ ذائقے جو آنے والے ہیں۔ ذائقوں کا سلسلہ ساری زندگی جاری رہتا ہے، دکھ کا، خوشی کا، نفرت کا، محبت کا، خوشبو کا، تعفن کا، لوسے کا، بدن کا، کڑوا، میٹھا، نمکین کھٹا اور کسیلا ذائقہ۔ اور ذائقے کی کسوٹی صرف زبان نہیں، آنکھ بھی ذائقہ محسوس کرتی ہے، دل بھی کرتا ہے، سر بھی کرتا ہے، سینہ بھی کرتا ہے، ناک بھی کرتی ہے اور کان بھی کرتے ہیں۔ مساموں کی بھی زبان ہوتی ہے۔ اندر باہر جو کچھ بھی آدمی کے پاس ہے سب کی زبانیں ہوتی ہیں اور سب اپنی اپنی بساط کے مطابق ذائقہ محسوس کرتے ہیں۔ کہے جانے والے لفظوں کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ راج کمار دنیش چندر زندگی کی اس رمز سے واقف تھے۔ انھوں نے اُن نوواردوں کے لیے لذتِ کام و دہن کا بھی اہتمام کیا اور انھیں اپنی ذات، اپنی حیثیت کے مختلف ذائقوں سے بھی روشناس کرایا۔ ضروری نہیں کہ آدمی ہر وقت شیریں ذائقے ہی مہمانوں کی خدمت میں پیش کرے، یہ مہمانوں کی آمد و رفت کی نوعیت پہ منحصر ہوتا ہے۔ بیماروں کو کڑوی دوائیں دی جاتی ہیں۔ میں نے بھی راج کمار دنیش کی تقلید کی، چونکہ میرا مسئلہ اُن سے زیادہ نازک تھا، وہ پرکاش بھون میں پیدا ہوئے تھے، اُن کے لیے تو اپنی دیوار ہی بہت تھی۔ اس موقع پر اُن سے اپنا تعلق ثابت کرنے کے لیے میں نے بھی اجنبی افسران کے سامنے اپنے کھٹ مٹھے ذائقے پیش کرنا ضروری سمجھا۔ پہلے یہ صورت تھی کہ دنیش سے تعلق چھپایا جاتا تھا کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے، اب اسے افشا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ کسی کی نظر چوک نہ جائے۔

رات لائبریری میں سندھیا نے میرے لباس پہ اپنے آنسوؤں کے دھبے اور اپنی آہوں کی شکنیں ڈال دی تھیں۔ راج کمار دنیش چندر کے خاص آدمی کو شایانِ شان لباس میں ہونا چاہیے تھا، اکڑے ہوئے تنے ہوئے لباس میں مگر لیندا زِمستی بھی قُربِ خاص کی نشانی ہے۔ بہر حال میں اپنی باتوں سے لباس کی اس کوتاہی پہ استری کرتا رہا۔ جہاں سے آدمی بولنا شروع کرتا ہے وہیں سے لباس کی موزونی، ناموزونی کا تعین ہوتا ہے۔ لباس بدن ڈھانپنے کے لیے پہنا جاتا ہے مگر یہ آدمی کو اُسی وقت تک چھپا سکتا ہے جب تک وہ بولنا شروع نہ کرے گویا لباس زبان اور انداز و اطوار کا ہوتا ہے۔ اگر اُن میں اور لباس میں تضاد ہے تو اطلس ٹاٹ اور ٹاٹ اطلس نظر آتا ہے۔ خوش لباسی اور بدلباسی دونوں کے لیے خوش زبانی، خوش اطواری لازم ہے اور اِن دونوں خوبیوں سے مُراد یہ نہیں ہے کہ آدمی مٹھائی کی دُکان بن جائے۔ زبان ایک شوکیس ہے جس کا شیشہ اور فریم خراب ہو گا تو اندر رکھا ہوا لباس بوسیدہ نظر آئے گا، اچھا ہو گا تو لباس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔

میں اُن کے سامنے اپنی گواہیاں دیتا رہا کہ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیں، یہ درخت راج کمار دنیش کی جاگیر میں بہت گہرا سمایا ہوا ہے، نئے لوگ تھے، یہاں کی روایات سے ناواقف تھے۔ نئے لوگوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ بات پوری سن لیتے ہیں۔ اور پہلا تاثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ یہ داغ مٹانے میں وقت لگتا ہے اور مجھے اب ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گھڑی کی سوئیوں نے اپنے معمول سے تیز چلنا شروع کر دیا ہے۔ جب وہ اُٹھنے لگے تو انھوں نے بہت زوردار مصافحہ کیا، مصافحے میں بھی بڑی معنویت ہوتی ہے۔ آنے والے تینوں افسران کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور پیشانیوں پر فکر کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے سُنا زیادہ کہا کم۔ ایک یہی بات اُن کے اشرف ہونے کی دلیل تھی۔ وہ جا رہے تھے کہ سندھیا اپنا وہی پسندیدہ لباس ہرے رنگ کا چھنے والا لباس میکسی پہنے نمودار ہوئی۔ ہرے رنگ میں اُس کا سُرخی مائل گلابی چہرہ بہت تازہ اور شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ صیادوں کا صید سامنے تھا۔ سندھیا نے انھیں مغائرت کی نظر سے دیکھا بلکہ اُن کی موجودگی پہ ناگواری کا سا اظہار کیا۔ ناک سکوڑی، آنکھوں میں تنکے روشن کیے اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ میں نے نظروں نظروں میں خیریت پوچھی، اُس نے کسی قدر ناراضی سے جواب دیا۔ میں اُن لوگوں کو راہداری کے آخری سرے تک پہنچانے گیا۔ چلتے چلتے مسلمان افسر سراج نے میرے قریب آ کے کہا۔ "موہن صاحب! راج کمار کو ہر وقت زحمت دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا، ہم آپ سے ملاقات کرنا چاہیں تو اس کی کیا صورت ہو گی؟"

"میں یہیں بھٹکتا رہتا ہوں۔" میں نے مسکرا کے جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آپ کو بار بار زحمت دینی پڑے گی۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "یہ واقعات خاصے دلچسپ اور گمبھیر معلوم ہوتے ہیں۔"

"لیے حد۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا خاصا لُطف آئے گا۔ میری زحمت کی فکر مت کیجیے، ریاستوں میں یا تو آدمی زحمت دینے کے لیے رہتا ہے یا زحمت لینے کے لیے۔"

"آپ ریاستی مزاج سے خوب آشنا معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وہ

حیرت سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔" ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہوگی۔"

" احساس کی بات ہے سراج صاحب! عمریں گزر جاتی ہیں اور آدمی احساس اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔" میری آواز خود بخود لہرا گئی۔

دروازے پہ انھیں رخصت کر کے میں تیز قدموں سے اندر آ گیا، سندھیا دنیش کے پہلو میں بیٹھی تھی اور دنیش نے اُس کا سر اپنے زانوؤں پہ رکھ لیا تھا۔ وہ اُس کے سنورے ہوئے بال بگاڑ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب دنیش کے ناراض ہونے کا وقت آ لگا ہے چنانچہ میں نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔

" آپ پریشان ہوں گے کہ میں رات بھر کہاں رہا۔" میری آواز پر سندھیا نے سر اُٹھا کے دیکھا، دنیش نے مجھے اُس کی موجودگی کا احساس دلایا لیکن میں نے کوئی خیال نہیں کیا۔" میں رات بھر ایک بڑا عجیب خواب دیکھتا رہا۔" دنیش نے کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔" میں نے بڑی حویلی میں ہونے والی واردات کا مجرم دیکھا۔"

سندھیا اور دنیش دونوں سیدھے ہو گئے۔ میں نے سندھیا کا رنگ دیکھا، گل گوں، شہابی، حنا رنگ۔" کون تھا وہ؟" وہ خوف زدہ تلخی سے بولی۔

" وہ۔" میں نے خواب ناک آواز میں کہا۔" اُس کے چہرے پر پھولوں کی نزاکت تھی اور شبنم کے قطرے تھے۔ اُس کا دل بلور کا بنا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایک دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اُس کی باتوں میں..." سندھیا کے نتھنے پھول گئے۔ میں نے دنیش کی موجودگی میں بے اختیار اُس کے رشمیں ہاتھ کھینچ کے زور سے بھینچ لیے۔" اُس نے مجھ سے کہا بے خبر! تو پریشان کیوں ہوتا ہے۔ جنھیں جانا تھا، وہ تو چلے گئے۔ جو رہ گئے ہیں، اُن کی فکر کر۔ آگے کی طرف دیکھ۔ کوئی دیوی تھی جو تمام رات میرے ساتھ رہی اور میرے خیال میں وہ بس اپنی ایک جھلکی دکھا کے چلی گئی، صبح جب ہوش آیا تو پتہ چلا کہ ایک رات گزر گئی ہے۔"

" موہن! موہن!" دنیش نے عاجزی سے کہا۔" سندھیا اب اتنی بچی نہیں رہی ہے جو تمھاری باتوں پہ دھیان نہ دے۔ بہلانے کی کوشش مت کرو، معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ وہ ہر طریقے سے گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

" اُنھیں خبر نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ ایک دیوی ہے جسے غصّہ آ جاتا ہے تو وہ کسی کی پروا نہیں کرتی۔" سندھیا نے اپنے ناخن میرے ہاتھ میں زور سے چبھو دیے۔" رات واقعی میں نے ایک خواب دیکھا ہے دنیش بابو!" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔" اسی لیے میں ادھر نہیں آ سکا۔ میں باغ میں تھا اور وہ دیوی میرے پاس تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا" ابھی نہیں، پھر کبھی چلیں گے۔"

" اوہ موہن!" دنیش نے پلکیں بھینچ کے کہا۔" بس کرو، یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم۔ تم...." اُس کی آواز بوجھل ہو گئی۔" میں تم سے



کوئی جواب طلب نہیں کر رہا ہوں، رات سے جی بہت پریشان ہے۔ تم نے سُنا نہیں کہ اُدھر کیا ہو گیا ہے۔"

" کیا ہو گیا؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

اُس نے کن انکھیوں سے سندھیا کی جانب اشارہ کیا۔ سندھیا نے اپنے مامک کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔ دنیش کے اضمحلال سے وہ بھی متوحش ہو گئی تھی مگر دنیش نے اُسے حکم دیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اندر شاردا کے پاس چلی جائے۔ سندھیا خلافِ توقع مچل گئی کہ اُسے بھی پریشانی سے آگاہ کیا جائے مگر دنیش کے لہجے کی مضبوطی سے وہ اپنی ضد پہ قائم نہ رہ سکی۔ وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے اُٹھی اور بے چارگی سے ہمیں دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی، پھر دنیش ملاقاتی کمرے میں نہیں ٹھہرا، مجھے لے کے خواب گاہ سے ملحق کمرے میں آ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ دنیش کوئی اچھی خبر نہیں سنانے والا ہے لیکن جب اُس نے دل سوز انداز میں راج کماری کنول اور کنور جگ دیپ کے درمیان ہونے والے رشتے کا ذکر کیا تو مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کسی کو اپنی تخلیق کی اس مستعدی سے داد ملے تو اس سے بڑی سرخوشی ممکن نہیں۔ دنیش نے مجھے یہ بات ایک ہارے ہوئے آدمی کی طرح سنائی۔ کل ہی میں نے جب اُسے یہ بتایا تھا کہ میں راج محل میں راج کماری کنول کے دیدار سے مشرف ہو کے آیا ہوں تو اُس کی آنکھوں میں چراغ جل اُٹھے تھے۔ جس وقت میں نے پارو کو ہدایت دی تھی کہ وہ بھون میں یہ افواہ عام کر دے تو مجھے دنیش پر مرتب ہونے والے اثرات کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ ایک لمحہ سرمستی کا گزر گیا تو مجھے اپنے ستم کا شدت سے احساس ہوا، دنیش پہ اک عالمِ یاس طاری تھا۔ اُس کی کیفیت دیکھ کے میرا دل ہولنے لگا۔ میں نے ارادہ کیا، اُسے سب کچھ بتا دوں کہ یہ خبر اُس کے سننے کے لیے نہیں تھی۔ ایک رات اُس پہ بڑی بھاری گزری ہوگی۔ بھون میں بہت سے لوگ مرے تھے، سریش چند، مہیش چند، بنارانی، پرکاش چند اور آشا دیوی جیسے لوگ مارے گئے تھے۔ خود دنیش پہ گولیاں چل چکی تھیں مگر دنیش میں اتنی خستگی، ایسی محزونی کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔" موہن! جب سے ہم نے یہ سُنا ہے

ہم اپنے آپ کو بہت حقیر سمجھ رہے ہیں۔"

میں نے اُس کا چہرہ اپنے شانے پر ٹکا لیا۔ "دنیش بابو! یہ محض ایک افواہ بھی ہو سکتی ہے۔ آپ تو بہت بہادر آدمی ہیں، اتنی سی بات پہ پریشان ہو گئے۔ آپ کے عزم کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔ آپ پر یہ اُداسی سجتی نہیں۔" میری کوئی بات اُس کی ژولیدہ، درماندہ حالت میں تازگی پیدا نہ کر سکی بلکہ وہ کچھ اور گرتا گیا۔ وہ رات سے انتظار میں ہوگا کہ میں آؤں گا تو میرے شانے میں اپنی آنکھیں چھپا لے گا۔ دنیش چندر بھون میں جس منصب پر فائز تھا، اُس کے لیے آنکھیں خشک ہونا اور آواز مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اتنے بڑے بھون میں شاردا کے سوا کوئی نہیں تھا جو دنیش چندر، ایک آدمی کا سر اپنے سینے، اپنی آغوش میں رکھ لے مگر شاردا تو خود دنیش کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ دنیش اُسے بے امانی کا کوئی احساس نہیں دینا چاہتا ہوگا۔ بات منہ میں تلملاتی رہ گئی، میں نے تحمل کیا۔ ریاست میں رہتے رہتے آدمی موقع شناس ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ اِن خبر کی ایجاد بھی اُسی کی ضرورت کے تحت کی گئی تھی۔ اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے خود دنیش کا کردار بہت اہم تھا۔

میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ بھون کے کئی لوگ راج کماری کنول میں دنیش کی دل چسپی کی سُن گُن رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے دنیش کو اُسی انداز سے پیش آنا چاہیے تھا جس کی اس خبر کے بعد وہ توقع کرتے ہوں گے۔ دنیش کا چہرہ اس خبر کی سب سے بڑی تصدیق ہوگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں دنیش کے سکون کے لیے اپنی جھولی سے بہت سے لفظ نکال کے اُس پہ نچھاور کر دیتا۔ ہر بولنے والا لفظوں کے معاملے میں اتنا آسودہ حال ضرور ہوتا ہے لیکن اس طرح میں اپنی ہی دلیل کی نفی کرتا۔ اُسے توقع ہوگی کہ میں یہ سُن کے بے قرار ہو جاؤں گا۔ آدمی اپنے غم اُسی سے کہتا ہے جس پہ اُن کا اثر ہو۔ بے شک میرے اعصاب پہ دنیش کی پژمردگی سے ندامت کا غلبہ ہوا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں راج کماری کنول کو، راج محل سے چوری کر کے اُس کے قدموں میں بکھیر دیتا۔ آج میری نسّوں میں پہلے جیسی توانائی اور شوریدہ سری نہیں تھی اس لیے دنیش کا اختلاج اور بڑھ گیا اور میں نے دل پہ جبر کر کے دنیش کو اس حال میں مبتلا رکھا۔ اس طرح راج کمار کے ذہن میں وہ شدت اور وہ برداشت پیدا ہونے کی بھی اُمید تھی جو کنور جگ دیپ کے مزاج کا خاصہ تھی۔ ظاہر ہے دنیش چندر اس طرح دن دہاڑے دیر تک مجھ سے راز و نیاز میں مصروف نہیں رہ سکتا تھا۔ جب دیر ہو گئی تو پارو نے مہذب انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دنیش فوراً سنبھل کے بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پارو کس کی تلاش میں ادھر آئی ہے۔ میں سامنے موجود تھا۔ اُس نے مجھے بس ایک نظر دیکھا۔ یہ نظر اتنی کاری تھی کہ ترازو ہو گئی۔ ملاقاتی کمرے میں راجے پور کے رئیس رانا اقبال سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نظر بچا کے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں شاردا اور سندھیا موجود تھیں۔ میرے پہنچتے ہی دونوں خاموش ہو گئیں۔ شاید میری بُرائیاں کر رہی تھیں، ایک دوسرے سے سچ بول رہی تھیں۔ چند لمحوں میں پارو کا اضافہ بھی ہو گیا۔ میں نے خود کو کسی اسٹیج پر کھڑے ہوئے محسوس کیا۔ کبھی کبھی ہر آدمی کا جی چاہتا ہوگا کہ اُس کے پاس دو ہاتھوں کے بجائے کئی ہاتھ ہوتے، کئی سر، کئی چہرے ہوتے۔ چار آدمی ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے موضوع تلاش کر رہے ہوں تو اس سے زیادہ خفقان کی صورت کوئی نہیں ہوتی۔ پھر پارو ہی نے اس کرب ناک خاموشی کا طلسم توڑا۔ میں مسلسل کئی راتوں سے اُس کے پاس پہنچنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ وہ مسلسل کئی راتوں سے میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ گزشتہ شام اُس کا ساغر چھلک گیا تھا لیکن رات بھی میں اُس کے پاس نہیں جا سکا۔ اُس کی آنکھیں سب کچھ بتا رہی تھیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ اب کے اُس سے کوئی معذرت، کوئی وعدہ نہیں کروں گا، بس ایک دم اچانک دھم سے اُس کے کانوں کے قریب پہنچ جاؤں گا اور بھوں کر کے اُسے ڈرا دوں گا، وہ خوف زدہ ہو کے چیخے گی تو اُسے گود میں اُٹھا لوں گا۔

رانی پارو بہت ذہین، بہت متین لڑکی تھی۔ جانتی ہوگی کہ میں وعدے کے باوجود نہیں آیا ہوں تو کسی سبب سے نہیں آیا ہوں گا۔ بات اُس نے موسم کی نامہربانی سے شروع کی تھی اور گفت گو بڑی حویلی پہ آ کے ٹھہر گئی۔ اس طرح اُس نے ذہانت سے اپنی معلومات کا خزانہ مجھ تک منتقل کر دیا۔ اُسے میری آمد کا آج بھی یقین نہیں ہوگا۔ پارو کے بیان کے مطابق اگر اس مرتبہ بھی قاتل نہ پکڑا گیا تو ریاستی پولیس میں بہت بڑی تبدیلیاں کی جائیں گی۔ ممکن ہے پولیس کے پورے نظام پر نظرِ ثانی کی جائے۔ سندھیا یہ سب کچھ بہت تجسس سے سُن رہی تھی اور گاہے گاہے بے چین ہو کے میری جانب اُٹھتی ہوئی نگاہ سے دیکھ لیتی تھی۔ میں نے پارو کو اشارہ بھی کیا کہ یہ باتیں ہر وقت اچھی نہیں لگتیں لیکن وہ بہاؤ میں سندھیا کے سامنے بہت سی ناگفتنی باتیں بھی کہہ گئی اور مجھے خوف لاحق ہوا کہ اس دوران میں سندھیا کوئی کمزور اور مجہول بات نہ کہہ دے۔ کاش میں کچھ دنوں کے لیے سندھیا کے کانوں میں روئی ٹھونس دیتا، اُس کے ہونٹ سی دیتا اور اُس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتا۔

مہارانی مایا دیوی اور کسُم نے نہایت موزوں وقت میں اِدھر آنے کا خیال کیا۔ اُن کے آنے کے بعد گفت گو کا موضوع بدل گیا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا لیکن سندھیا وہیں موجود رہی۔ میں اُسے گدی سے کھینچ کے باہر نہیں لا سکا۔ کاش مجھے اتنا اختیار ہوتا۔



خواب گاہ سے وابستہ کمرے میں آ کے میں نے لباس تبدیل کیا۔ دنیش رانا اقبال سمیت راجے پور کے کئی رئیسوں کے درمیان گھرا ہوا بیٹھا تھا۔ سربراہی کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کا جی رونے کو چاہتا ہے

مگر اُسے ہنسنا پڑتا ہے۔ سربراہی کی قیمت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی تنہائیاں بیچ دیتا ہے۔ دوسروں پہ اختیار حاصل کرتا ہے اور خود اپنا اختیار گروی رکھ دیتا ہے مگر کسی پہ آدمی ایک ہی نشست سے بیٹھ سکتا ہے زمین پر لوٹ پوٹ سکتا ہے۔ میرا ارادہ بھون سے باہر جانے کا تھا مگر بارو کی احتیاط پسندانہ باتیں سُن کے ڈانواڈول ہو گیا۔ یہ وقت ریاست کی سڑکوں پر گشت کا نہیں تھا، شہر کی بات تو کسی حد تک ٹھیک تھی مگر دور دراز کے لیے شگون کے بغیر سفر کرنا نامناسب تھا۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا، فی الحال اس کمرے میں کسی کے آنے کا خدشہ نہیں تھا تاہم احتیاطاً میں نے دروازہ بھیڑ دیا تاکہ کھلنے پہ آہٹ ضرور اُبھرے۔ پھر تیزی سے میری اُنگلیاں ڈائل پر مچلنے لگیں۔ راج کماری کنول ہی نے فون اُٹھایا۔ اُس نے میری آواز سُنی تو اتنے تعجب کا اظہار کیا جیسے برسوں بعد رابطہ قائم ہوا ہو۔ "ہم سمجھ رہے تھے، نہ جانے کیوں ہمیں یقین تھا کہ اس وقت تمہارا فون آئے گا۔" وہ سرشاری سے بولی۔

"کاش آپ اس وقت کچھ اور مانگتیں تو مل جاتا۔"

"تم سے بڑی کوئی چیز ہماری نظر میں نہیں ہے۔" میرے کانوں میں سناٹا طاری ہو گیا۔ فون ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ "ہیلو۔" اُس نے تشویش سے پوچھا۔ "تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"کنول دیوی!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کچھ غریبوں کا خیال کیا کیجیے۔ ہم بھی آپ کی رعایا ہیں۔"

"تم ریاست کے سب سے بڑے رئیس ہو۔" وہ جوش میں بولی۔ "تم سب سے بڑے حاکم ہو۔ خبر ہے، کل رات مہاراجا کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے سرد آہ بھری۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ موہن کو راج محل ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ اور کہہ رہے تھے کہ وہ اور کسی ایسے نوجوان سے نہیں ملے جو تم جیسی جرأت، بصیرت اور ذہانت رکھتا ہو۔"

"گویا آپ بہت ڈرا رہی ہیں۔ اب میں کس منہ سے وہاں آؤں گا، مجھ سے تو سر بھی نہیں اُٹھایا جائے گا۔"

"اوہ موہن! تم اب اور سر اونچا کر کے آؤ گے۔ اچھا بتاؤ کب آ رہے ہو؟ ہم منتظر ہیں، اور سنو اب کے آؤ تو ایک بات کا خیال رکھنا۔ اتنی آپا دھاپی میں مت آنا۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل ساری رعایا پر واجب ہے مگر میں کل ہی تو آیا تھا۔ بے وقار ہونے کا خطرہ لاحق ہے حالانکہ آج بھی آنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مہاراجا اور آپ نے کل جس لہجے میں بات کی تھی، اُس پہ شک ہوتا ہے۔ تصدیق کے لیے دوبارہ آنا چاہتا تھا اور کچھ لیں بھی۔۔۔"

"تو آ جاؤ نا۔" اُس کی بے تاب آواز اُبھری۔ "ہم تمہارے وقار میں اضافے کی ضمانت دیتے ہیں۔ جتنی جلدی تصدیق کر سکتے ہو کر لو۔"

"ضرور آؤں گا مگر آج نہیں۔۔۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"پھر کب؟"

"جلد ہی کچھ غیر ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟" وہ تردد سے بولی۔

"نہیں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے تاہم۔۔۔" میں نے جھجک کی۔

"مناسب سمجھو تو ابھی بتا دو۔"

میں نے توقف کیا اور تذبذب سے کہا۔ "ہاں۔۔۔ کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اصل میں ایک جسارت کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کہو کہو۔" وہ اشتیاق سے بولی۔ "ہم بے تاب ہو رہے ہیں۔"

"ایک مشورہ ہے کہ آپ۔۔۔" "آپ یوں ہی برسبیلِ رسم دو ایک بار بڑی حویلی ہو آئیں۔ تفصیل مت طلب کیجیے گا۔ فی الحال اتنی عرض پہ قناعت کیجیے۔"

"بڑی حویلی!" اُس کی حیرت بھری آواز اُبھری۔ "مگر ہم وہاں تو جاتے رہتے ہیں خیر، ہم تم سے وجہ نہیں پوچھیں گے۔ تمہارے مشورے پر ضرور عمل کریں گے آج ہی اور کہو تو ابھی؟"

"نہیں، اتنی عجلت بھی نہیں ہے۔ میں جب آؤں گا تو بات ہو گی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑی حویلی کو راج محل کے گداز کی ضرورت ہے حالانکہ مہاراجا سے ملاقات کے بعد خود مجھے اس واردات میں راج محل کی غیر معمولی سنجیدگی کا اندازہ ہو چکا ہے۔ تھوڑے کہے کو بہت جانیے۔"



"تم نے ہمیں مضطرب کر دیا ہے۔" وہ مضطربانہ بولی۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسی کوئی اہم بات نہیں ہے۔ لطافت کا خیال پیشِ نظر ہے، نازکی اسی میں ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ذرا سیر بھی ہو جائے گی۔ ہو سکے تو کنور صاحب سے دو باتیں خیر خواہی کی کر لیجیے گا۔"

"ہم اُن کے خیر خواہ ہیں۔"

"کبھی کبھی دو لفظوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ کنور صاحب تو خیر مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں مگر شوستے بازوں کو یہ تکلفات بہت پسند آتے ہیں۔ فرض کیجیے کسی داستاں طراز نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ راج محل کی ایما ہر معاملے میں شامل رہتی ہے اور خون اوپر سے نازل ہوتا ہے اور آگ فلاں سمت سے لگائی گئی ہے تو آپ ...." میں نے وقفہ لیا۔ "میں آؤں گا کنول دیوی! ایک دو بار اُدھر زحمت کر ہی لیجیے گا۔" میں نے چپ سادھ لی۔ فون پر اُس کے سینے کا زیر و بم صاف سنائی دے رہا تھا۔ "ہم سمجھ رہے ہیں موہن!" اُس نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

"مہاراجا کو پریشان نہ کیجیے گا۔ اور سنائیے جی کیسا ہے؟"

"بہت خراب ہے۔" وہ مہکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جی پر برف رکھ لیجیے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہم تو سر بسر سرد خانے میں ہیں۔"

میری زبان پر بھی سردی کا اثر ہو گیا۔ لفظ منہ میں یخ ہو گئے۔ میں نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ سمجھی ہو گی کہ کوئی سامنے آ گیا ہے۔ پہلے بھی کئی بار اچانک فون بند کرنا پڑا تھا۔ بعض لڑکیاں اپنی ذات میں انجمن ہوتی ہیں، ایک مے کدہ۔ اُن کے اِرد گِرد ایک طلسمی حصار ہوتا ہے۔ جب اس انجمن میں شریک ہو، اِس مے کدے میں داخل ہو، اِس حصار میں قدم رکھو تو سانس درست کرنے کی مہلت نہیں ملتی اور زبان بہکنے لگتی ہے۔ آنکھوں میں ڈورے پڑ جاتے ہیں۔ بعض لڑکیوں کا تصور ہی ایک مے کدہ ہوتا ہے۔ اُن کی نگاہ نشتر، اُن کی آواز شراب ہوتی ہے۔ راج کماری کنول میں ایک اور خصوصیت تھی، اُس کی ذات ایک دربار بھی تھی، دربارِ سرکار میں تکلم کا سلیقہ چاہیے۔ میں لفظوں کی نشست و برخاست بہت دیر تک ذہن میں بٹھاتا رہا تھا۔ اب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی غلطی ہو گئی ہے، نہ جانے کیا زبان سے نکل گیا ہے، کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا اور کیا سُنا۔

مگر جلد ہی ذہن کی یہ گھٹا چھٹ گئی۔ شام ڈھلے پرکاش بھون میں یہ خبر آ گئی کہ راج کماری کنول نے پھر بڑی حویلی کا دورہ کیا اور وہ خاصی دیر تک کنور جگ دیپ کے ساتھ رہی۔ یہ خبر سب سے پہلے پارو نے آ کے مجھے سُنائی۔ راج کماری کے تیور بتانے کا اُسے موقع نہیں ملا مگر شدہ شدہ یہ بات بھی کانوں میں پہنچ گئی کہ راج کماری کا انداز شگفتہ اور لہجہ بے ساختہ تھا۔ کنور جگ دیپ نے بھی آج خاص اہتمام سے راج کماری کا خیر مقدم کیا۔

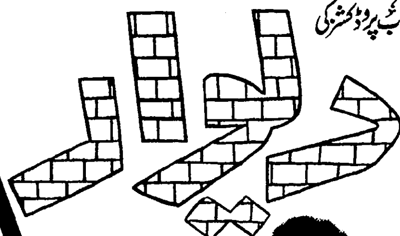
خود کنور جگ دیپ پہ جب یہ اطلاع منکشف ہوئی ہو گی اور آج راج کماری نے بہ نفسِ نفیس قدم رنجہ فرمایا ہو گا تو صحنِ دماغ میں ایک لمحے کو راج محل کے چمن زاروں کے سارے پھول کھل اُٹھے ہوں گے۔ کوئی انوکھی خبر نہیں تھی۔ موقع اور وقت مناسب تھا۔ رسمِ دُنیا بھی تھی، دستور بھی تھا، اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ ریاست میں یہ گھڑیاں فیصلوں کی گھڑیاں تھیں۔ کنور جگ دیپ کو یقین آنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوئی ہو گی۔ اچھی خبروں کے لیے ویسے بھی آدمی اپنے ذہن میں ہزار تاویلیں تلاش کر لیتا ہے۔ ہوا کا ایک موافق جھونکا چلنا شرط ہے۔ خواہشیں سینے میں سلگی ہوئی ہوں تو آگ بھڑکنے میں دیر نہیں لگتی۔ ممکن ہے کنور کو کسی کے سامنے تردید کرنے کی ضرورت بھی پڑ جائے مگر آرزوؤں کی تردید مشکل سے ہوتی ہے۔ آنکھیں اور زبان اُس تردید کی صاف چغلی کھاتے ہیں۔

شاید کنور جگ دیپ کی آج کی رات فیصلوں پر نظرِ ثانی میں کٹ جائے۔ کل کی افواہ کے پس منظر میں آج کماری کنول کے دو لفظ زیادہ سمجھ میں آئے ہوں گے، ذہن اُن کی طرح طرح تشریح کر رہا ہو گا۔ شاید آج رات کنور پہ بہت بھاری گزرے۔ اگر کرنل ہارڈنگ سے مراسمِ خاص کی داغ بیل ڈال دی ہو گی تو اس وحشت پہ پچھتاوا بھی آئے گا اور سودے بازی پہ ندامت بھی ہو گی کہ ہاتھ گھما کے سر سے گزار کے ناک پکڑنے کی کیا ضرورت تھی، ذرا انتظار کر لیا ہوتا۔

رات گئے تک بھون میں کانا پھوسیاں، سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ کچھ لوگ ملاقاتی کمرے میں دنیش کے چہرے کا رنگ دیکھنے کے لیے آ گئے۔ انھیں مایوسی نہیں ہوئی ہو گی۔ اِدھر مجھے پارو کا خیال تھا، اُس نے اپنے آپ کو بتدریج اتنا نازک کر لیا تھا کہ اب ہر وقت اُس کے کمھلانے اور ٹوٹنے کا ڈر رہتا تھا۔ رات سر پہ آئی تو میں دنیش اور شاردا کی نظروں پہ پردہ ڈال کے راہ داری میں آ گیا۔ پارو نے اُدھر بے تابانہ دروازہ کھولا، اِدھر سرکشانہ میں نے اپنی آغوش کے دریچے وا کیے۔ نہ کوئی بات کی، نہ کوئی بات سُنی۔ پارو کا سینہ گرج رہا تھا۔ جب بہت سے بادل اکٹھے ہو جاتے ہیں تو گرجنے لگتے ہیں۔ آسمان کے بادل زمین پر گر جاتے ہیں مگر سینے کے بادل تو سینے ہی پہ کُھل کے برستے ہیں۔ میرے دماغ میں وقت کا بچھو مسلسل ڈنک مار رہا ہوتا تو میں اُس کا سینہ صاف کر کے آتا۔ میں نے اُس کا سراپا احتیاط سے اُٹھا کے بستر پہ رکھ دیا اور اُسے جھنجوڑ کے بیدار کیا اور شکایت کی کہ وقت بہت گراں ہے۔ اُس نے خود کو نہ سنبھالا تو اور گراں ہو جائے گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ تو ایک مثال ہے، وہ تو ایک ستون، ایک روشنی ہے۔ اُس نے اپنی خوبیاں ضائع کر دیں تو اُس پہ

انشاء اللہ ۱۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو شاندار افتتاح

شباب پروڈکشنز کی











بابرہ شریف
غلام محی الدین
اور
جمشید انصاری

کہانی، مکالمے و ہدایات
شباب کیرانوی

موسیقی: ایم اشرف

جاریکردہ
کاشف لمیٹڈ، کاشف چیمبرز گارڈن روڈ، کراچی نمبر ۳
فون نمبر: ۷۰۸۰۱-۷۲۸۸۸

انحصار کرنے والوں کا کیا ہوگا، وہ کدھر جائیں گے، اُس کا آسرا ایک توانائی ہے۔ توانائی نڈھال ہوگئی تو کیا ہوگا۔ ایسے عالم میں تو اُسے مضبوطی سے زمین پہ کھڑے رہنا چاہیے کیونکہ بنجر ہواؤں کی یلغار سے محفوظ رہنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔

میری بات اثر کر گئی۔ پارو کے احساس میں بے طرح جنبش ہوئی۔ اُس نے میرا چہرہ والہانہ اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ "موہن!" اُس کی کرب ناک آواز اُبھری۔ "موہن! مجھے معاف کر دو۔ میں بھول گئی تھی کہ میں تمھارا گھر ہوں کیونکہ مجھے خوف آنے لگا تھا کہ تم اپنے گھر سے بیگانہ ہو گئے ہو۔"

پارو ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ بڑی حویلی کا تازہ واقعہ کس جرات آزما کس رندِ سرمست کی خرابات ہے۔ اُس شخص کا عقدہ چونکہ نہیں کھلا تھا اس لیے پارو کی تشویش حق بجانب تھی۔ میں نے اُس کی توجہ لاکھی پور کے شورہ پشتوں کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی مگر اُس کی سیری نہیں ہوئی۔ پارو ایک وکیل، ایک پولیس افسر کی طرح جزئیات پہ گہری نظر رکھتی تھی۔ اُس کی عقل پیچ در پیچ گرہیں پڑ گئی تھیں۔ شہر لاکھے پور سے کچھ دور مِل کے انگریزوں کی چھاؤنی تھی جہاں ایک بڑی فوج ہر وقت موجود رہتی تھی اور جس کا رابطہ ہندوستان میں انگریزوں کی ہائی کمان سے قائم تھا۔ ہائی کمان کا تار سمندر پار لندن شہر سے ملا ہوا تھا۔ اس طرف جھون سے کچھ فاصلے پر راج محل تھا جس کی دیواریں اُونچی اور موٹی تھیں۔ شہر کے درمیان لاکھی پور کے بدمعاشوں کے اڈے پھیلے ہوئے تھے جو ایک چھاپا مار فوج کی حیثیت رکھتے تھے اور مال کے بدلے خون کا سودا کرتے تھے۔ اُن کا سب سے بڑا گاہک کنور جگ دیپ تھا جو اُلّو کی آنکھیں اور سُور کا دل رکھتا تھا۔ اس پورے نقشے میں جب پارو کسی مقام پہ میرا مجسمہ نصب کرتی ہوگی تو اُس کی ہمت پست ہو جاتی ہوگی۔ پارو کو بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ تخلیے میں یہ ملاقات بھی بڑی جدوجہد کے بعد ہوئی تھی اور ملنے جلنے کے مواقع وافر ہوتے تو بھی میں اُس کے سامنے اُس بدمست اُس پاگل کا نام نہیں لے سکتا تھا جس کا نام سندھیا تھا۔ میں پارو کو اُس کی سماعت کی استطاعت کے مطابق ہی جواب دے سکتا تھا۔ شانت محل میں مقیم کرنیلوں سے حاصل کی ہوئی فائلوں کے نوٹس پارو کے پاس محفوظ تھے۔ اُس کے پاس آنے سے پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ بس اُسے اپنا چہرہ دکھا کے، اُس کی زلفوں کی خوشبو سانسوں میں بھر کے اور اُن یادداشتوں پہ ایک سرسری نگاہ ڈال کے واپس آ جاؤں گا لیکن یہاں آ کے وہی تماشا ہوا۔ پارو کے لہر لہر بدن پہ اضطراب طاری تھا۔ جب میں نے وہ نوٹس دیکھنے کی خواہش کا آہستگی سے ذکر کیا تو وہ اور بھڑک اٹھی۔ "انھیں میں نے جلا دیا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"دکھا دو پارو! یقین کرو میں انھیں صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں، کوئی اور مقصد نہیں ہے۔" میں نے اُس کی ٹھوڑی پکڑ کے منت کی۔

"نہیں نہیں، میں نے انھیں جلا دیا ہے۔" اُس نے صاف انکار کر دیا۔

"پارو!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "بہت ضروری ہے۔"

"کیا ضروری ہے۔" وہ ناراض ہوگئی۔ "تمھارا دل بھر جانا چاہیے۔ اب تک جو ہو گیا، ٹھیک ہے۔ تم نے دیکھ لیا، لاکھی پور کے لوگوں کی فکر و نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں تسلیم نہیں کرتی کہ بڑی حویلی پہ غصہ انھوں نے اُتارا ہوگا۔ اب کوئی اور خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو کچھ ہو چکا ہے اُس پہ مٹی ڈالنے سے پہلے کسی دوسرے معاملے میں اُلجھنا بہت بڑی حماقت ہوگی۔"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ سادھو ولبھ راج کے استھان جانے والے راستے کا واقعہ دُہرانے کا کوئی منصوبہ میرے ذہن میں نہیں ہے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پہ میں اُن کے نام ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں۔ صرف برائے احتیاط۔"

وہ مجھے ایک شرط پہ نوٹس دکھانے پہ آمادہ ہوئی کہ اُس سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم نہیں اُٹھاؤں گا۔ میں نے اُس سے وعدہ کرنے میں بخل نہیں کیا۔ ہر آدمی اس معاملے میں فیاض ہوتا ہے۔ اُس نے نوٹس میرے حوالے کر دیے۔ یہ محض اپنی یادداشت کی تصدیق تھی۔ انھیں دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے پارو کو خواہ مخواہ زحمت دی۔

لاکھی پور کے بدمعاش، پارو سچ کہتی تھی، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلے۔ کیا عجیب لوگ تھے، کوڑیوں کے مول سر بیچتے تھے۔ ضمیر کہنا غلط ہے، ایسی کوئی چیز شاید اُن کے پاس موجود نہیں تھی۔ ہوتی تو رنگ کھیلتے۔

"کیا تم سمجھتے ہو؟" پارو نے ترشی سے کہا۔ "کیا انھیں یہ باور نہیں کرایا گیا ہوگا کہ وہ صرف تمھی تھے جنھوں نے اُن سے اُن کے ساتھیوں کو جُدا کیا۔ جیسے ہی حالات نارمل ہوئے اور پولیس تھک کے اپنی گرفت کمزور کرنے لگی، وہ تمھاری طرف کتوں کی طرح جھپٹیں گے، دیکھ لینا۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور اس صورت میں ہم نے انھیں چھیڑنے کی نادانی کی تو....."

پارو کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ "موہن! وہ بہت کمینے ہیں، بہت جنگلی۔"

"میں اُن کے تمام خواص سے واقف ہوں، کرنیلوں نے اُن کے بارے میں جو تعریف و توصیف لکھی تھی، وہ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ پڑھی تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں انھیں کس قدر مطلوب ہو سکتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ اُن کی تعداد میں ایک خفیف کمی کا سبب میں ہوں، اس وجہ سے کہ انھوں نے کچھ اور نقدی کنور صاحب سے پیشگی وصول کر لی ہوگی۔ انھوں نے ایک نیا معاہدہ کیا ہوگا۔ کنور صاحب سے بڑا گاہک شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔"

"اور ہم نے کچھ نہیں کیا۔" پارو تلملا کے بولی۔ "دنیش راج کماری کنول کے غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہم بھی اگر لوہا بولتے تو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔"

"حالات اب بھی اتنے خراب نہیں ہیں پارو!" میں نے مسکرانے کی

ناکام کوشش کی۔" اور دنیش چندر اب بھی ایک ممتاز آدمی ہیں۔"

"ہوں!" وہ بجلی کی طرح چمکی۔ "تم بھی کیا خوب مذاق کرتے ہو۔"

"دیکھ لینا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بس تم اپنا کام انجام دیتی رہو۔ تم میری نگاہ ہو پارو! بس اپنے آپ کو زمین پہ قائم رکھنا۔ تم نے بھون میں راج کماری سے متعلق جو خبر دھائی بسائی ہے اُس کا یقیناً کوئی نتیجہ نکلے گا۔"

"مگر موہن!" وہ آنکھیں پٹ پٹاتی ہوئی بولی۔ "مجھے شبہ ہے کہ اس خبر میں کوئی نہ کوئی صداقت ضرور ہے۔ آج راج کماری کنول کا غیر متوقع طور پہ بڑی حویلی جانا بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اُس کی زلفیں سنوارتے ہوئے کہا۔ "وہ محض ایک افواہ تھی اور راج کماری کا بڑی حویلی جانا بھی محض ایک اتفاق ہے، بہت خوب صورت اتفاق، اسے حسنِ اتفاق کہتے ہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔" وہ جھنجلا کے بولی۔ "اتفاقات یوں بھی میرے ذہن کو قبول نہیں ہوتے اور اتفاق کی بات تسلیم کر بھی لی جائے تو تم اس اتفاق کے بارے میں کیا کہو گے؟ فرض کرو، اگر مہاراجا نے از خود اس قسم کا کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ راج کماری کنول اپنی عمر کے اُس دور میں ہے جہاں اُسے کسی نہ کسی شخص کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ فرض کرو، اگر اس اتفاقی ملاقات میں کنور جگ دیپ کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے اظہار کا موقع مل جائے اور راج کماری جذبات میں آ کے کوئی ایسا فیصلہ کر لے جس کا خاکہ تم نے بنایا ہے؟"

"ہاں ہو سکتا ہے۔" میں نے یقیناً اس پہلو پہ غور نہیں کیا تھا۔ کنور جگ دیپ کی صلاحیتوں کا تجربہ خود مجھے بھی کئی بار ہو چکا تھا اور بڑی حویلی کے واقعے کے بعد ریاست میں اُس کی حیثیت ایک مظلوم کی ہو گئی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ مگر مچھ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے کماری کنول کے قدم ڈگمگانے لگیں مگر نہیں، یہ پارو کا اپنا تخمینہ تھا۔ اسے کنول کے خیالوں اور خوابوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ "اگر ایسا ہوا تو کچھ بُرا بھی نہیں ہو گا۔"

کنور جگ دیپ کو اُس کی مُرادِ آسانی سے مل جائے گی حالانکہ راج کماری سے وابستگی راجے پور کی گدی سے مشروط نہیں ہے مگر یہ ایک ذریعہ ضرور بن سکتی ہے۔ آگے رہی کنور کی قسمت۔ تم کیوں گھبراتی ہو۔"

"تم کیسے آدمی ہو، اب قسمت کا ذکر لے بیٹھے۔ معلوم ہوتا ہے تمھارے ذہن میں کوئی واضح بات نہیں ہے یا پھر تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"مجھے اجازت دو۔" میں نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یاد رکھو کہ راج کماری مہاراجا کے اشارے کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھائے گی اور مہاراجا وہی کریں گے جو اُن کے بہترین مفاد میں ہو گا، وہ ایک دور اندیش اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔"

پارو نے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ "نہ جانے وہ وقت کب آئے گا جب گھڑی کے بجائے تمھاری نظر صرف مجھ پر ہو گی۔"

"میری نظر اب بھی تم پہ ہے کیونکہ تم گھڑی سے بہت خوب صورت ہو۔ تمھاری زلفوں کی چھاؤں میں زندگی گزر جائے اور وقت کا پتہ نہ چلے مگر پارو..." میں نے اُس کے لبوں کی قاشیں چوم لیں۔ "مجھے جانا چاہیے۔"

راہ داری کے سکون نے مجھے اپنی جلو میں لے لیا۔ نثار دا دنیش کا سر اپنے زانوؤں پر رکھے ہوئے آہستہ ہولے ہولے دبا رہی تھی۔ میں بھی چپکے سے صوفے پہ بیٹھ گیا اور میں نے دنیش کے پیر کے انگوٹھے چٹخانے شروع کر دیے۔



شب کے آخری حصے میں نثار دا نے تحکمانہ لہجے میں ہم دونوں کو خوابیدگی کا حکم دیا اور ہمیں کمروں میں جب تک بند نہیں کر دیا، خود نہیں سوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگی لیکن جیسے ہی صبح کے آثار ہویدا ہوئے، میں نے لپک کے فون گود میں رکھ لیا۔ راج کماری غالباً گہری نیند سو رہی تھی، فون کی گھنٹی دیر تک بجتی رہی۔ پھر اُس کی غنودہ آواز تاروں پر مستانہ وار رقص کرتی ہوئی میرے کانوں میں گونجی اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری گود میں فون نہیں، خود کنول بیٹھی ہو، جیسے میں ایک جھیل ہوں، ایک تالاب، جس میں کنول کا پھول کھل گیا ہو۔ میں نے اپنے مخصوص لہجے میں اُسے مخاطب کیا تو اُس کی آواز جھن جھنا گئی۔ میری چشمِ تصور نے اُسے بستر پہ تڑپتے اور ہڑبڑا کے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ شب خوابی کا لباس اُس کے اطلسیں بدن پہ پھسل رہا ہو گا۔ میرے ذہن کے نگار خانے میں اس منظر کی کئی تصویریں اُبھریں، نقش بنے اور بکھر گئے۔ کہنے لگی، کل ہم وہاں گئے تھے، میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "وہ ایک دن بعد ایک بار اور زحمت کر لیجیے گا۔ حسین بدن اور حسین چہرے کے ساتھ دماغ بھی حسین ہو تو حُسن سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ شاید اسے حسنِ کامل کہتے ہیں۔" کہنے لگی، مگر لوگ زیادہ باتیں بنا سکتے ہیں۔ میں نے برجستہ کہا، یہی باتیں بنانے کے لیے تو آپ سے درخواست کی گئی تھی۔ "وہ کیوں؟" وہ حیرانی سے بولی۔ میں نے جواب دیا، اس لیے کہ اسی طرح بدقیاسوں کی بدگمانیاں دُور ہو سکتی تھیں۔ تارا رارام فون میں نغمے بکھر گئے، ہنستی ہوئی بولی۔ "اوہ موہن! تم کبھی اپنے قد سے کم نہیں بولتے۔"

راج کماری نے آج پھر اصرار کیا کہ بس اب فون بند کر کے فوراً موٹر میں بیٹھوں اور پلک جھپکتے ہی راج محل کے دروازے پہ پہنچ جاؤں، دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔ اِدھر وہ اتنی دیر میں ناشتے کی میز سجانے کا حکم دے گی۔ شاید مہاراجا بھی شریک ہو جائیں۔ میں نے کہا، دعوت اُدھار رہی۔ کہنے لگی، ہم اُدھار کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے کہا۔ یہ شُرفا کا اُدھار ہے۔ روٹھنے کے انداز میں بولی، تم پہلے بھی یہ بات کہہ چکے ہو، اب خاصا اُدھار ہو چکا ہے۔ میں نے کہا کسی دن سب بے باق کر دوں گا۔



سورج نے اپنی کرنوں کا دائرہ وسیع کیا تو میں نے بہت احتیاط سے

کوتوالی کا نمبر ڈائل کیا، آواز بدلنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ کوئی اجنبی پولیس افسر مخاطب تھا، شمشیر سنگھ۔ اُس کے نام کی طرح آواز میں بھی تلوار کی کاٹ تھی: "کہاں سے بول رہے ہو؟" وہ خالص پولیس والے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا: "اس سے تمھیں کیا، کام سے مطلب رکھو۔ دھیان سے سنو ورنہ پچھتاؤ گے اور اِدھر اُدھر ٹاک ٹوئیاں مارتے رہو گے۔"

وہ کچھ نرم پڑ گیا، بولا: "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔" لیکن جب میں نے بڑی حویلی کا نام لیا تو اُس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔" اس نے وقفے کی درخواست کی۔ اس وقفے کے دوران میں اُس نے کاغذ پنسل فراہم کیے ہوں گے۔ میں عالی دماغ انگریز کرنیلوں کی رشحات کا حافظ تھا اور لاکھی پور کے ستم کاروں کے ایسے نام اور ٹھکانے جانتا تھا جن سے راجے پور کی پولیس ناآشنا تھی یا جنھیں خواہ مخواہ کے فساد کے خوف سے درگزر کرتی ہوگی یا بھتا وقت پر پہنچ جاتا ہوگا۔ ہر جگہ انگریزوں کی معلومات مقامی لوگوں سے وسیع تھیں، یہی علم و فضل اُن کی حاکمیت کا سبب تھا۔ ذکر چلا تو میں نے راجے پور کے دو ایک رئیسوں کے نام بھی لے دیے۔ پولیس افسر شمشیر سنگھ کی زبان میں لکنت آگئی۔ کہنے لگا: "تمھاری معلومات اگر غلط ہوئیں تو؟"

میں نے پوچھا: "اور اگر صحیح ہوئیں تو؟"

"تو پولیس تمھیں مالا مال کردے گی، نہرو جی کے قاتل کے لیے پچاس ہزار روپے کا انعام رکھا گیا ہے۔" وہ جوش میں بولا جیسے اعلان اُسی کی طرف سے جاری کیا گیا ہو۔

میں نے سرد مہری سے کہا: "خیر، وقت آنے پر نام پتا بھی بتا دوں گا۔ ذرا احتیاط سے ہاتھ ڈالنا تاکہ شبہ تک نہ ہو اور کام بن جائے، پہلے پوری طرح تسلی کرلینا۔ پرت اتاروگے اور کام ہوشیاری سے کروگے تو ہاتھ خون اور کیچڑ سے لتھڑ جائیں گے، مرضی ہو تو یقین کرو، باقی تم جانو، تمھارا کام۔ تم نے اگر رعایت کی تو میں اسی طرح مہاراجا کو فون کھٹ کھٹاؤں گا اور مہاراجا نے رعایت کی تو گوروں کو۔ سمجھے؟" میں نے فون بند کر دیا۔

شمشیر کرنیل کھڑ کھڑاتا رہ گیا ہوگا۔ زیادہ بات کرنے سے بات کا حسن ختم ہوجاتا ہے، بسیار گوئی بچوں ہی کو اچھی لگتی ہے۔ مجھے جو بات کہنی تھی وہ میں نے مختصراً اشاروں کنایوں میں کہہ دی اور مجھے اطمینان تھا کہ آواز نے لاج رکھ لی ہے۔ راجے پور میں اتنے دن رہتے رہتے لہجہ کچھ کچھ ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔

بہ ظاہر تو یہ کوئی ایک خاص کارروائی نہیں تھی، پولیس کو ایسے دسیوں فون روز موصول ہوتے ہوں گے۔ کوئی عجب نہیں کہ خود میرے بارے میں اس سے زیادہ کھُل کے باتیں کی جاتی ہوں۔ میں نے تو بڑی رازداری، لہجے اور آواز کا خیال رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ فون کسی منتقم مزاج اور شرپسند شخص کی شرارت سمجھا جاتا، سمجھا جائے، میری بلا سے۔ میں نے اپنی جیسی کوشش کی تھی اور کسی بڑے نتیجے کی توقع باندھ کے نادم ہونے کا خیال نہیں تھا۔ پولیس کو کسی نے اس پہلو پر پہلی بار توجہ دلائی ہوگی۔ ایسے مختلف نام لیے ہوں گے جن کا سان و گمان بھی نہ ہوگا۔ کوئی بہت ہی باخبر اور اندر کا آدمی ایسی باتیں بتا سکتا ہے۔ اس گرم اور گمبھیر وقت میں جب باہر سے آئے ہوئے محقق ایک ایک نکتے کی تحلیل کر رہے ہوں، یہ خفیہ اطلاع روشنی کی ایک کرن ثابت ہونی چاہیے کیونکہ سندھیا نے کوئی سکتہ اُن کی روشنی کے لیے نہیں چھوڑا تھا۔ درگزر کرنے کی کوشش کریں گے لیکن دل میں کانٹا چبھا ہوا ہوگا۔ بار بار اسی طرف نگاہ جائے گی۔ میں نے جن لوگوں کے نام بتائے تھے، وہ کوئی ایسی ہستیاں نہیں تھیں جن کا دامن صاف رہا ہو، صاف رہتا تو کرنل اُن کا ذکر کیوں کرتے۔ اس اطلاع کی صداقت ناصداقت کے لیے اُن گلی کوچوں اور عمارتوں کا جائزہ ضرور لیا جائے گا جہاں یہ سینہ سیاہ کار بستے ہیں اور ایک ذرا سا شبہ، ذرا سا امکان میری بات سچ ہونے کے لیے بہت سمجھا جائے گا۔

میری بات صرف اس حد تک سچ تھی کہ بے شک اُن کا دامن متعدد وارداتوں میں آلودہ تھا مگر بڑی حویلی کے واقعے سے اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پولیس کی سختیاں سہہ کے واپس آجائیں گے اور پولیس پھر اُس شخص کے لیے غضب بن جائے گی جس نے فون پر اُس کے ساتھ مذاق کیا تھا لیکن میرا مقصد یہ تھا بھی نہیں کہ پولیس انھیں آنکھ بند کر کے بڑی حویلی کے خوں ریز واقعے کا مجرم قرار دے دے۔ ایسا ہونا ناممکن تھا۔ اس سے پہلے بھی پولیس نے متعدد آدمی شبہے میں گرفتار کیے تھے، کل مجھے بھی لے جا سکتی تھی۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ پولیس انھیں بھی گرفتار کرلے۔ اس طرح ایک تو لاکھی پور کے باقی بدمعاشوں میں سنجیدگی پیدا ہونے کا امکان تھا، دوسری طرف کنور جگ دیپ کے لیے بھی اُن کی جدائی باعثِ تشویش تھی۔ یہ بات طے تھی کہ گرفتار شدگان کے ساتھ پولیس کا رویہ اس بار بڑا سخت ہوگا۔ مگر جب نہڑوں اور کوڑوں سے دُہری کی جاتی ہے تو آدمی کو شعور لاشعور کی ساری فراموش باتیں یاد آجاتی ہیں، کوئی کم ظرف کنور جگ دیپ سے پچھلی سوہے بازیوں کا راز فاش کرسکتا تھا، کوئی اور اپنی سزائیں کم ہونے کا لالچ کر کے کسی اور واقعے کو قبول کرسکتا تھا۔ اُدھر کنور صاحب کی بہن کماری اینلا نے بتایا ہوگا کہ موہن داس وقوعے کے وقت بھون میں موجود تھا۔ کنور صاحب نے اپنی بہن کو سمجھایا ہوگا کہ یہ ذکر ضروری نہیں ہے تاہم انھوں نے اس امر پر حیرت سے غور کیا ہوگا کہ موہن داس نہیں تھا تو وہ کون شخص یا اشخاص تھے۔ لاکھی پور کے ان غنڈوں کی گرفتاری سے اُن کے ذہن میں یہ شک ضرور تقویت پائے گا کہ کہیں یہ اُن کے اپنے لوگ، اپنے نمک خوار، نمک حرام تو نہیں تھے۔

ہر طرف ایک الجھاوا تھا، جتنا اور جس طرح سوچیے معاملہ اتنا ہی پیچیدہ نظر آئے گا۔ یہ مبہم صورتِ حال ایسے وقت میں بہت ضروری معلوم ہوتی تھی۔ کنور جگ دیپ اپنے کئی ساتھیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، کچھ گرفتار ہو

گئے تھے، باقیوں نے سرِ دست فیصلہ کر لیا تھا کہ توبہ کر لیں گے یا کچھ دنوں کے لیے پہاڑیوں پر واقع اپنے آبائی مکانوں میں چلے جائیں گے۔ پھر کنور جگ دیپ کا ذہنی عمل کیا ہوگا؟ یہ دیکھنے کی بات تھی۔ پھر وہ کرنل ہارڈنگ اور لالہ جی کماری سے راہ و رسم میں تیزی پیدا کرے گا بشرطیکہ سانس درست رہے اور اوسان بحال ہوں کنور کے اوسان کے متعلق مجھے بدگمانی نہیں تھی۔ اس کے اعصاب قدرت نے فرصت میں بنائے ہوں گے لیکن میں یہاں بیٹھے بیٹھے اتنا ہی کچھ کر سکتا تھا۔ آدمی وقت پر زمین میں تخم ڈال دیتا ہے اب موسم کا مزاج ہی ناساز ہو مزاج ہی نہ مل رہا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے کھڑی فصلیں دھوکا دے جاتی ہیں۔



آئی جی مہتا کی طرف سے کوئی نامہ و پیام نہیں ہوا چونکہ باہر سے تفتیش کنندگان آ گئے تھے اس لیے مہتا کو میرے سلسلے میں وقت کی رعایت لینے کا عذر مل گیا ہوگا۔ پولیس افسر شمشیر سنگھ کو فون کرنے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب کچھ دنوں کے لیے دفتر کی چھٹی ہو گئی ہے، کالج بند ہو گیا ہے یا امتحان دینے کے بعد نتیجہ آنے کے وقت کا دورانیہ ہے جس طالبِ علم کے پرچے صدفی صد اچھے ہوئے ہوں اسے نتیجے کا شدت سے انتظار نہیں ہوتا لیکن جس کی نیّا ڈانوا ڈول ہو اس کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی تھیں اور اب ایک تپتا ہوا انتظار میرا مقدّر تھا۔ شہر میں ہر طرف پولیس پھیلی ہو اور لاکھی پور کے بدمعاش مجھ جیسی شباہت کے ایک شخص کی تلاش میں چلرانے ہو رہے ہوں ایسی حالت میں بھون سے جیب کے لیے نکلنا مفید نہیں تھا۔ اس موسم میں خوب کپڑے ورپڑے پہن کے ہی باہر نکلا جا سکتا تھا۔ میں بستر پہ چار رس نشانے چت لیٹ گیا کچھ دیر بعد کسی کے دروازہ کھولنے کی آہٹ ہوئی، پھر کوئی قریب آیا اور خوشبو کا ایک جھونکا میری رگوں میں پیر گیا۔ میں نے گردن نہیں اٹھائی، وہ نشاردا کی خوشبو تھی۔ اس نے میرے جسم پہ چادر ڈال دی اور بال آہستگی سے درست کیے پھر دبے قدموں واپس چلی گئی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

کچھ دیر بعد میں خود اٹھ گیا، بستر پہ جی نہیں لگا اس لیے کہ عادت چھوٹ گئی تھی۔ نشاردا اسی انتظار میں تھی۔ میں باہر آیا تو اس نے مجھے دوبارہ اندر بھیج دیا۔ میرا لباس تیار تھا، غسل خانے میں گرم پانی بھی موجود تھا، مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا۔ نہا دھو کے بالوں میں کنگھی کر کے میں باہر نکلا تو ناشتے کی گاڑی کمرے میں کھڑی تھی، نشاردا ٹوسٹ سینک رہی تھی اور دنیش چائے کی چسکیاں لے رہا تھا، کمرہ بند تھا، میں خاموشی سے ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ آدمی کے اعصابی کھنچاؤ اور دل کے مرض کی طبعی وجوہ تو اپنی جگہ ہیں مگر اس کی اور بہت سی وجوہ بھی ہیں، یہ آدمی ہی ہیں جو ایک دوسرے میں اتنے پیوست ہو جاتے ہیں کہ دل کمزور کر لیتے ہیں۔ کوئی پاس بلاتا، کوئی دور بھگاتا ہے کوئی پتھر پھینکتا ہے کوئی مرہم رکھتا ہے، کوئی شرمندہ کرتا ہے کوئی شرمندہ ہوتا ہے۔ کوئی سینے

برُوں کے ساتھ نیکی کرنا ایسا ہے جیسا نیکوں کے ساتھ بُرائی کرنا۔
——— شیخ سعدی شیرازیؒ

دولت آدمی کو شریف نہیں بنا سکتی۔
دشمن ایک بھی بہت ہے اور دوست زیادہ بھی کم ہیں۔
غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
بہترین بخشش وہ ہے جو سوال کرنے سے پہلے کی جائے۔
بچے ملک کی امانت ہیں۔ اُن کے سینوں میں مستقبل چھپا ہوا ہے۔
——— محمد علی جناح

علم فروخت کرنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ دولت فراخ دلی سے تقسیم ہونی چاہیے۔ علم کا بخیل، مال کے بخیل سے بڑا مجرم ہے۔
——— سیّد دلاور علی شاہ

ہمارے ملک میں جو بھی شخص کام کرے، لوگ اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر حمید احمد خاں نے بہت کام کیا اور معمول سے زیادہ دشمنی مول لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ وقت سے پہلے یونی ورسٹی سے دست بردار ہوئے۔
——— ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم

میں یادیں بھر دیتا ہے کہ کھرچتی رہیں اور سینہ فگار کر دیں، کوئی نیر چلاتا ہے کوئی چائے بناتا ہے کوئی بال سنوارتا ہے، کوئی روتا ہے کوئی ہنستا ہے کوئی گاتا ہے، کوئی......

میں سر جھکائے باہر آ گیا اور میری نظریں محلات میں سندھیا کو ڈھونڈتی رہیں۔ وہ مجھے راستے ہی میں مل گئی مگر وہاں بہت بھیڑ تھی، بہت سے آدمی آ جا رہے تھے ورنہ میں وہیں اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیتا۔ میرے بازوؤں میں کھولن ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر کشمکش ہونے لگی تھی مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ انسان وقتوں میں کتنی تنہائی، کتنا بوجھل پن محسوس ہوتا ہوگا۔ مجھ پر خود کئی بار ایسی کیفیت گزر چکی تھی۔ میں اس کے قریب ہو گیا اور میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”ٹھیک تو ہو نا؟“

اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کے بے دلی سے جواب دیا۔ ”مجھے کہیں لے چلو۔“

”تمام راستے بند ہیں، ذرا حالات درست ہو جائیں۔“

”ہم پہاڑیوں میں چھپتے ہوئے نکل جائیں گے۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”اس وقت باہر نکلنا بالکل نامناسب ہے۔ یہیں جی لگانے کی کوشش کرو سندھیا جی! اور دستو، ذہن ہر اندیشے سے خالی کر دو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بڑے بڑے تیس مار خاں آئے ہوئے ہیں۔“

”ہمنت، مجھے ان کی فکر نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”میں جانتا ہوں مگر سندھیا جی! میری بات یاد ہے؟ اب مجھے بتائے بغیر کچھ نہیں ہوگا ورنہ کُٹّی ہو جائے گی، دانہ پانی بند۔ اس دوران میں کتابیں پڑھا کرو، گھڑ سواری کی مشق کرو، ٹینس کھیلو، یہ وقت کسی نہ کسی طرح گزار دو۔“

"موہن! بس ایک ہی جی چاہتا ہے کہ تمھارے ساتھ رہوں۔ تمھارے بغیر کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے فون بھی کیا، تمھاری آنٹی نے اُٹھایا، میں نے بات نہیں کی۔ سوچا تھا، شاید تم مل جاؤ گے۔"

"سندھیا جی! آدمی وقت اور حالات کے خلاف تو نہیں جا سکتا ورنہ ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ تمھیں خود کو بہت قابو میں رکھ کے یہ دن گزارنے ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ تم بہت سی کتابیں پڑھ لو۔ آیندہ بہت کام آئیں گی اور اس وقت تمھارا جی بھی بہل جائے گا۔ میں تمھیں ۔ ۔ ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم ایک بہت پڑھی لکھی لڑکی بنو۔"

"جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔" وہ جھنجلا کے بولی "مگر تمھارا خیال آتا ہے تو بس ۔ ۔ ۔ بس کچھ نہیں ہوتا۔"

"میرے خیال ہی کے لیے تو تمھیں ایسا کرنا چاہیے۔"

اُس نے جواب میں وحشت سے بال بگاڑ لیے۔ میں آگے کی طرف نکل گیا، سندھیا مخالف سمت میں آگے بڑھ گئی۔ پر بیت آ رہی تھی۔ اُس کی چال میں متانت تھی، نپے تلے قدم تھے۔ مجھ سے اُس کی نظروں کا ٹکراؤ ہوا تو اُس نے آنکھیں اُدھر کر لیں۔ میں نے مخاطب ہونے کا ارادہ کیا مگر جنون دیکھ کے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید یہ میرا وہم تھا کہ آج وہ تیور کچھ بدلے ہوئے تھی، رخساروں پہ ٹھیراؤ تھا، لباس بھی شوخ نہیں تھا، سفید ساڑی میں کمان جیسا بدن بھی بجلی کی طرح تڑپ نہیں رہا تھا۔ کچھ تھی تھی سی ڈھلی ڈھلی سی لگ رہی تھی۔ میں اپنے کوارٹر میں آ کے صحن میں لیٹ گیا۔ ڈالی موجود نہیں تھی، وہ جب آئی تو شام ہو چکی تھی۔ گڈا بخار میں مبتلا تھا، ڈالی نے مجھے اُسے ہاتھ لگانے نہیں دیا۔ کچھ دیر میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر ڈالی کی نگاہ اوجھل ہوئی تو میں گڈے کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہوا میدان میں آ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو دنیش چند کے ایک مہربان پولیس افسر کھنّا نے بتایا کہ لاکھی پور کے چند بدمعاش گرفتار کر لیے گئے ہیں اور مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ ان گرفتاریوں سے بڑی حویلی کا پُراسرار واقعہ ایک نیا رُخ اختیار کر سکتا ہے، بعض نئے اور اہم انکشافات کی اُمید ہے، اُمید ہے کہ اس بار کوئی نتیجہ خیز صورت سامنے آئے گی۔ اُدھر دنیش نے اِدھر یا اُدھر نے یکے بعد دیگرے مجھے یکساں اطلاعات پہنچائیں۔ بھون سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے کچھ اور خبروں کا انتظار کر لینا مناسب سمجھا۔ اس دوران میں چھاؤنی سے ریتا کے کئی فون آ چکے تھے مگر میری بات ایک ہی بار ہوئی۔ باقی ہر بار دنیش نے میری جانب سے میری ذات کی اطلاعیں منتقل کر دی تھیں۔ کرنل ہارڈنگ نے اپنی بیٹی کو اس قدر رعایت ضرور دے دی تھی کہ وہ فون پر اپنے احوال مجھے سُنا سکے۔ لیں چھاؤنی میں سکون طاری تھا۔ تین کرنیلوں، تین سنتریوں کی موت اس طرح دب گئی تھی جیسے وہ انگریز نہیں، ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی

بھی کم تر درجے کے۔ لیکن یہ محض تھا، ریاست میں جو شخص بھی انگریز کرنیلوں کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کے بارے میں جانتا ہو گا، اُس کی یہی رائے ہو گی۔ انگریزوں نے شکست کے مناظر بھی دیکھے تھے، پیچھے ہٹنا، آگے بڑھنا، آگے بڑھنا، پیچھے ہٹنا۔ اسی شان سے وہ آدھی دنیا میں آگے بڑھ گئے تھے۔ سرکار کے لبوں پر خاموشی تھی، سرکار کوئی طوفان دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ طوفان کس نوع کا ہو سکتا تھا؟ سنگین اُٹھانے اور توپوں کا رُخ شہر کی جانب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی پندرہ سولہ گورے مارے جا چکے تھے۔ اب اس سنگین نقصان کی تلافی کی ایک ہی صورت تھی کہ مہاراجا کفّارہ ادا کریں اور مہاراجا آمادہ تھے مگر یہ آمادگی اُسی حد تک ہو سکتی تھی جس حد تک اُن کا ذہن قبول کرتا۔ اُن کے بجائے کوئی نیا آدمی اُن سے زیادہ فراخ نظری سے بات کرتا۔ مہاراجا سے پورے گوروں کا دل بھی اُکتا گیا ہو گا۔ وہ اسی لیے ہر جگہ اُکھاڑ پچھاڑ کرتے رہتے تھے کیونکہ پُرانے آدمیوں سے کیے ہوئے عہد نامے اسی طرح کالعدم قرار دیے جا سکتے تھے۔ پُرانے آدمیوں سے دوستیاں مروّتیں آڑے آ جاتی ہوں گی۔ میں اگر مہاراجا ہوتا، اوّل تو ہوتا ہی کیوں، بہرحال اگر ہوتا تو گوروں کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتا، ساری جھجک بے کار تھی۔ مہاراجا کو اتنا ہی غم تھا تو اُنھیں ہندوستان کے اُن کفن بردوش لوگوں پر در پردہ خزانہ لٹانا چاہیے تھا جو دیا سلائی لیے ہندوستانیوں میں آگ لگا رہے تھے۔ مہاراجا نے تو گوروں کی خاطر ریاست میں اُن کے لیے جگہ ہی تنگ کر دی تھی۔ پہلے دورے کے کوئی چار دن بعد راج کماری کنول نے دوبارہ مجھے نادم کیا۔ بڑی حویلی میں اُس کا دوسرا دورہ لوگوں کے لیے یقیناً عبرت اور حیرت کا باعث ہو گا۔ اس عرصے میں کنور جگ دیپ بھی مہاراجا کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے لیے ایک بار راج محل جا چکا تھا۔ اگر یارڈ کی پھیلائی ہوئی باتیں بھون کے مکینوں کے چہروں پر اتنی نمایاں نہ ہوتیں تو میں راج کماری کنول سے دوبارہ بڑی حویلی جانے کی درخواست نہ کرتا۔ یارڈ اضافے اور ترمیم کے ساتھ اپنا فریضہ تن دہی سے انجام دیتی رہی تھی۔ یہ خبریں بھون میں خوب گھوم گھام کے دنیش کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ میرا چہرہ دیکھتا اور میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ ریتا نے فون پر مجھے اطّلاع دی کہ کنور کرنل سے ملنے چھاؤنی بھی آیا تھا۔ کنور جگ دیپ کی دہشت اس لیے بڑھ گئی ہو گی کہ پولیس نے لاکھی پور کے کچھ اور بدمعاشوں کے ٹھکانوں پر چھاپا مارا تھا۔ کنور نے اپنی فوجِ ظفر موج اس طرح کٹتی ہوئی دیکھ کے فوراً چھاؤنی اور راج محل کا رُخ کیا ہو گا اور اس وقت سب سے زیادہ گداز اُسے راج محل میں نظر آیا ہو گا۔

ابھی مرنے والوں کا دسواں نہیں ہوا تھا۔ سورج نے ابھی اندھیرے سے اپنا چہرہ نکالا ہی تھا اور دنیش خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ خواب گاہ سے باہر آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی نے ملاقاتی کمرے کی اونگھتی اور نسبتہً پُرسکون فضا زیر و زبر کر دی۔ دنیش کے چہرے پہ خزاں چھا گئی اور اُس نے سراسیمگی کے عالم میں فون اٹھایا۔ چونکہ

کے ڈوبتے ہوئے لہجے میں بتایا کہ کماری ہیما نے خودکشی کر لی۔

مجھے یقین نہیں آیا۔ سوچا، مذاق کر رہا ہے۔ ہیما ایک جواں سال گل بدن لڑکی کل ہی میں نے اُسے راہ داری میں دیکھا تھا، کچھ اُداس اُداس تھی مگر اُس کے چہرے پر موت کی کوئی کیفیت مرقوم نہیں تھی مگر دنیش سچ ہی کہہ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد مہارانی مایا دیوی کمرے میں آہ و بکا کرتی ہوئی آ گئیں اور دنیش اور شاردا کو اپنے ساتھ لے گئیں، میں بھی تھکے ہوئے قدموں سے اُن کے پیچھے پیچھے گھسٹتا رہا۔

کماری ہیما نے واقعی خودکشی کر لی تھی۔ بھون کے تمام لوگ محل کے اسی حصے میں جمع ہو گئے تھے۔ میں بھی اُس کا چہرہ دیکھنے گیا مگر مجھ سے دیکھا نہیں جا سکا۔ اُس کا شہابی رنگ نیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں بند تھیں اور تراشیدہ ہونٹوں سے نکلتی ہوئی خون کی لکیر جم گئی تھی۔ بھون کا ڈاکٹر رفتے کا اجازت نامہ دے چکا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ خودکشی حرکتِ قلب بند ہو جانے کا سانحہ قرار دے دی گئی تھی، بھون کے ڈاکٹر نے لوگوں سے یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر کسی کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ کماری ہیما کو زہر دے دیا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اتنی متضاد باتیں سننے میں آئیں کہ کماری ہیما کی موت ایک معما بن کے رہ گئی۔ دنیش، شاردا اور پاروتی دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیما کی لاش کے قریب بیٹھے آنسو بہا رہے تھے، اس طرح اچانک ہیما جیسی شوخ اور تیز و طرار لڑکی کا زندگی سے روٹھ جانا کسی بڑی وجہ کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اُس کا ایک ایک منظر میری آنکھوں میں اُبھر رہا تھا۔ جب وہ گھوڑے پر بیٹھتی تھی تو گھوڑے کی شان ہی کچھ اور ہو جاتی تھی، گھوڑا بھی اپنے سوار پر نازاں ہوتا ہوگا۔ مجھے اُس نے کئی بار خطابات سے نوازا تھا، یہ خطابات اُس کے منہ سے اتنے بُرے نہیں لگتے تھے۔ کبھی کتا کہتی تھی، کبھی گدھا۔ بہت حساس، بہت ذہین نکلی۔ زندگی کا کھیل سمجھ گئی تھی، سب کو منہ چڑا گئی۔

دستور کے مطابق شہر بھر کے معززین چہروں پر اُداسیاں بکھرائے پرکاش بھون میں جمع ہونے لگے۔ راج محل سے راج کماری کنول بھی مہاراجا کی ناسازیٔ طبع کا عذر لے کے آئی اور کچھ دیر ٹھہر کے واپس چلی گئی۔ چھاؤنی کے آفیسران کمانڈ کرنل ہارڈنگ کا ایک نمائندہ بھی پھولوں کی چادر کے ساتھ پوری شان و شوکت سے حاضر ہوا۔ بڑی حویلی کے لوگ بھی اشک بچشم آہ بلب سب سے آگے تھے۔ پھر اُس وقت میری آنکھوں میں سوزش ہونے لگی جب میں نے کنور جگ دیپ کو دنیش سے گلے ملتے دیکھا۔ جگ دیپ کی بہن کماری انیتا بھی بڑی حویلی سے آنے والے غم گساروں میں شامل تھی۔ کچھ کمزور کمزور سی معلوم ہو رہی تھی۔ مجھ پر اُس کی نظر پڑی تو وہ میری طرف آنے کے لیے لپکی مگر ایک قدم چل کے کچھ سوچ کے رہ گئی۔

دُلھن کی ڈولی کھلے میدان میں رکھ دی گئی، پنڈت وداعی اشلوک پڑھنے لگے۔ ان آوازوں میں آہوں اور سسکیوں نے مل کے سماں باندھ دیا۔



میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور میں نے واپسی کا ارادہ کیا مگر اُسی وقت نگاہ کنور جگ دیپ سے ٹکرا گئی۔ جس طرح میرے سینے میں بجلی کوندی اسی طرح اُس کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد اُس نے پلکیں پھیر لیں پھر میں خود ہی نگاہ جھکا کے ایک طرف نکل آیا۔ ارتھی زیادہ دیر نہیں رو کی گئی۔ دوپہر ہی کو بھون سے ایک بڑا جلوس خاموش ہیما کو شمشان گھاٹ لے گیا۔ میں بھون میں رہ گیا۔

جب تک پارو نہیں آئی میرے ذہن میں کیڑے رینگتے رہے۔ پارو بہت عجلت میں آئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں اُس کا رنگ دیکھ کے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُس کے پاس کہنے کے لیے بہت اُداس لفظ ہیں۔ پارو مجھے اپنی اُداسی اور دُکھ دے کے چلی گئی۔ میں نے اُس سے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہیما نے بہت اخفا سے کام لیا۔ وہ لوازمے سے شیشہ نکلی، موم کی گڑیا اور گڑیا پتھر کے بنے ہوئے گڈے سے اتنی متاثر تھی۔ کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گڈے کی آرزو میں پریت سے زیادہ فعال ہوگی، خود پریت کو بھی خبر نہیں تھی۔ کنور جگ دیپ نے بھون کی کتنی ہی لڑکیوں سے ایسے وعدے کیے ہوں گے جیسے ہیما سے کیے تھے۔ میں صرف شاردا کو جانتا ہوں جس نے اُس کی سحر انگیز نگاہوں کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ پارو کے بیان کے مطابق کل رات ہیما بڑی حویلی گئی تھی۔ اُس کے جانے سے پہلے شام کو راج کماری کنول نے بڑی حویلی کا دورہ کیا تھا۔ ہیما کو معلوم ہوا ہوگا کہ کنور ان دنوں اکثر راج محل جاتا رہتا ہے۔ پارو ہی نے بھون میں یہ افواہ اُڑائی تھی حالانکہ کنور اُن دنوں صرف ایک بار راج محل گیا تھا۔ نہ پارو کو نہ مجھے اور نہ بھون میں کسی اور کو بھون کی کسی لڑکی سے اتنی شدت کی توقع تھی۔ کماری ہیما کی اچانک موت کا سانحہ ایک پہیلی سمجھا جاتا، اگر وہ اپنی ماں کا منی کے نام ایک خط چھوڑ کے نہ جاتی۔ اپنے خط میں اُس نے وصیت کی تھی کہ میری ارتھی کو صرف کنور جگ دیپ آگ لگائے۔ اِس خط کی اُنھی لوگوں کو خبر ہوئی جو سب سے پہلے وہاں پہنچے تھے، بعد میں مہارانی مایا دیوی نے یہ خط چھپا

لیا اور کنور جگ دیپ سے ہیما کی وصیّت کا اظہار تک نہیں کیا۔ ہیما کی روح بے قرار ہی رہی۔

مگر ہونٹوں سے نکلی ہوئی بات کہاں چھپتی ہے۔ جب سہ پہر کے وقت لوگ شمشان گھاٹ سے ہیما کو وداع کر کے آئے تو بھون کی تقریباً تمام عورتوں کو اُس کے آخری پیغام کا علم ہو چکا تھا۔ رات کو دنیش کے محل میں دیر تک لوگوں کا ہجوم رہا۔ پربیتا بھی ایک گوشے میں سوگوار بیٹھی تھی۔ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ رات کو چھٹ چھٹا کے صرف چند لوگ ملاقاتی کمرے میں رہ گئے، پھر کماری اینتا، کُسم اور پربیتا بھی چلی گئیں، صرف پاروتی بیٹھی رہی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ پارو کا خیال تھا کہ میں رات کے اس آخری حصّے میں اُس کے پاس آؤں مگر میری ہمت نہیں پڑی۔ جب وہ چلی گئی تو میں خاص دروازے سے نکل کے باغ میں آ گیا۔ شاردا اور دنیش نے بھی اس وقت کوئی تعرّض نہیں کیا۔ باغ کے سبزے کا چہرہ بھیگا ہوا تھا، ہم دونوں کی ایک ہی کیفیت تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

صبح مالیوں کے آنے سے پہلے میں اُٹھ گیا۔ دنیش کے محل کی کھڑکیوں میں ابھی تک رات کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ مجھے دروازہ بھی کھُلا ہوا ملا۔ دونوں بھائی بہن صوفوں پر نیم دراز تھے، گُم صُم۔ جب میں اُجلے کپڑے بدل کے باہر آیا تو دنیش نے نحیف آواز میں پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔" میں نے اُسی لہجے میں جواب دیا اور آگے بڑھنے لگا۔

"مت جاؤ۔" اُس نے التجائی انداز میں کہا۔

"ابھی آ جاؤں گا۔" میری آواز بھرّا گئی۔

"کہیں مت جاؤ۔"

میں وہیں بیٹھ گیا۔ صبح بیدار ہو چکی تھی، ملاقاتی کمرے میں رفتہ رفتہ لوگ اکٹھے ہوتے گئے۔ کسی نے مجھے آواز دے کے چونکایا۔ "موہن! تمھارا فون ہے۔"

میں نے حیرت سے اپنے مخاطب کو دیکھا۔ دنیش کی بڑی بہن، سندھیا کی ماں سرلا کے ہاتھ میں ریسیور تھا۔ "کس کا فون ہے؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا پھر اس سے قبل کہ سرلا کچھ جواب دیتی، میں نے ریسیور اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کانوں میں آواز گونجی تو مجھے جھرجھری آ گئی اور ریسیور پر میری اُنگلیوں کا شکنجہ بے اختیار سخت ہو گیا۔ آفیسران کمانڈ کرنل ہارڈنگ مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے بے چینی سے اطراف پر نظر کی، میں سو نہیں رہا تھا۔ سورج کی چند کرنیں شیشے کی دیوار عبور کرنے کے بعد کمرے میں آئی ہوئی تھیں اور یہاں اچھے خاصے لوگوں کا اجتماع تھا۔

"مسٹر موہن!" کرنل نے باوقار انداز میں میرا نام لیا۔

"جی۔" میں نے ہندوستانی میں کہا۔

"تم یہاں آج کسی وقت آ سکتے ہو؟"

"جی جناب!" میں نے حیرت زدہ لہجے میں مستعدی سے جواب دیا۔

"میں تمھارا انتظار کروں گا۔"

"بہتر ہے۔"

میں نے کوئی اور بات نہیں پوچھی، سب کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ کرنل بھی جانتا تھا کہ فون میں نے نہیں کسی اور نے اُٹھایا ہے اس لیے اُس نے مختصر گوئی پر اکتفا کی، اطراف میں ان لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے میں وقت کا تعین بھی نہیں کر سکا۔ "کس کا فون تھا؟" سرلا اپنا تجسّس چھپائے بغیر نہ رہ سکی۔ "کوئی گورا معلوم ہوتا تھا؟"

گورے کے ذکر پر سب چونکے۔ مجھے جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی، کسی گورے سے موہن داس کا تعلق؟ بھون کے لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ بات ہو گی۔ "چھاؤنی سے فون تھا۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"چھاؤنی سے؟" سرلا نے میری تلخی نظر انداز کر کے مہذب لہجے میں اس طرح پوچھا جیسے کھانے کے بارے میں سوال کر رہی ہو۔ میں ابھی تک اسی پیچ و خم میں گرفتار تھا کہ کرنل ہارڈنگ کو اچانک یہ فون کرنے کی زحمت کیوں پڑ گئی؟ میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "نارمن صاحب تھے۔"

"نارمن پھر تمھیں پریشان کر رہا ہو گا۔" دنیش نے درمیان میں دخل دے کے میری مشکل حل کی۔ "موہن! وہ تمھیں اپنے ساتھ لندن لے جائے بغیر نہیں ملنے کا۔"

سرلا چپ ہو گئی لیکن میری ناگواری سبھی نے محسوس کی ہو گی۔ وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھا اور خواب گاہ سے دنیش کی گاڑی کی چابی اُٹھا کے آہستہ قدموں سے گیراج میں آ گیا۔ ڈرائیور بنسی موجود تھا، میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ بنسی نے کوئی حجّت نہیں کی، دروازہ بند کیا اور اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے حکم دینے سے پہلے میں چند لمحے سوچتا رہا۔ دنیش نے عین وقت پر روک لیا تھا ورنہ میں نے کرنل ہارڈنگ کی طرف جانے کے ارادے ہی سے لباس تبدیل کیا تھا۔ چھاؤنی کی طرف جانے کا یہ ایک مناسب موقع تھا۔ ہیما اگر بھون کے پانی کی ٹنکی میں اپنی زہر کی شیشی پھینک دیتی تو کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بنسی نے میری خاموشی دیکھ کے بے چینی سے کئی پہلو بدلے۔ "اتر جاؤ۔" میں نے اُسے حکم دیا اور خود اُس کی نشست پر جا کے بیٹھ گیا۔ بنسی موٹر کی باڈی سے لگا کھڑا تھا، مجھے خیال ہی نہیں رہا، میں نے موٹر چلائی تو وہ گرتے گرتے بچا، قسمت میں ابھی اور گردشیں لکھی تھیں، بچ گیا۔ آج چلا جاتا تو کل نہ جانا پڑتا۔ زندگی ہمیشہ اُدھار ہوتی ہے۔ لوگ آج نقد کل اُدھار کے مقولے پر عمل کرتے تو دنیا میں زمین ہی زمین ہوتی، پھر آدمی زمین کے لیے نہ لڑتا۔ بنسی ایک قابلِ اعتماد آدمی تھا اور اس وقت لاکھی پور کے سرکردہ بدمعاش

سلاخوں کے پیچھے تھے اس لیے بظاہر کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

صرف ایک ہیما کی موت تھی جس پہ اب تک یقین نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہیما ابھی کسی طرف سے نمودار ہو گی، آنکھوں میں وہی چمک ہو گی جو میرے سامنے آنے پر اور تیز ہو جائے گی، جبیں پر شکنیں پڑ جائیں گی، سُرخ چہرہ بھبوکا ہو جائے گا، پلکوں کا ایک رقص ہو گا اور وہ تیز قدموں سے آگے گزر جائے گی، اب ہیما راکھ بن گئی تھی۔ اُس کے بدن کی راکھ بہت چمکیلی ہو گی، سونے جیسی۔ صرف ایک یہ کہ ہیما کی بات ذہن میں ابھی تک رسا نہیں ہو رہی تھی، باقی سارا پانی نشیب میں گر رہا تھا، اس کا خیال دُور دُور بھی نہیں تھا کہ پارو کی اُڑائی ہوئی ہوا سے چنگاریاں اتنی تیز ہو جائیں گی۔ پارو کا مقصد تو محض آئینہ دکھانا تھا۔ بہرحال اب پارو کو کچھ کام نہیں تھا۔ اگر بھون کی نازک اندام لڑکیاں سمجھنے کی کوشش کریں تو سمجھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

ایکسی لیٹر پر میرے پیر کا دباؤ بڑھا ہوا تھا۔ گاڑی صدر کے علاقے میں داخل ہوئی تو رفتار کم ہو گئی، پرکاش بھون کی گاڑی تھی اس لیے سب کی نگاہیں اُٹھیں اور کسمسا کے رہ گئیں۔ چوک سے ایک راستہ راج محل جاتا تھا، دوسرا چھاؤنی۔ ایک راستہ راج محل سے بھی براہِ راست چھاؤنی کی طرف مڑتا تھا۔ کرنل ہارڈنگ کے پاس پہنچنے کے پہنچ جانے کو جی مضطرب تھا مگر دل کو یہ جلدبازی اچھی نہیں لگی کہ اِدھر اُس کا فون آیا، اُدھر میں حاضر ہوا۔ بہتر تھا کہ کچھ دیر اور وقت گزار لیا جاتا اور اس عرصے میں اُن تمام امکانات پر غور کر لیا جاتا جن کے لیے کرنل نے طلبی کا حکم دیا تھا۔ اُس سے اتنی مختصر بات ہوئی تھی کہ کچھ قیاس کرنا مشکل تھا۔

ہیما کے واقعے کے بعد صبح ہی صبح کرنل کی یہ طلبی کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتی تھی میرا ذہن اُس کے پاس جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا اس لیے گاڑی کی رفتار خود بخود کم ہو گئی۔ کنور جگ دیپ اور کرنل ہارڈنگ کے درمیان ہونے والی متوقع افہام و تفہیم میں جگ دیپ کی جانب کماری کنول کی ایک نگاہِ کرشمہ ساز نے دراڑ ضرور ڈال دی ہو گی۔ ممکن ہے کرنل ہارڈنگ سے گفتگو کرتے ہوئے جگ دیپ میں کوئی لرزش آگئی ہو، وہ سختی، تندی اور ترشی نہ ہو جو بڑی حویلی میں کماری کنول کی آمد سے پہلے ہو گی۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ کرنل نے یہ سوچ کے مجھے دنیش چندر کے نمائندے کے طور پہ تسلیم کیا ہو کہ راج کمار دنیش چندر اپنی بہن کی اچانک موت کے باعث ذہنی فشار میں مبتلا ہو گا اور متوازن گفتگو کی صلاحیت سے محروم ہو گا۔ ممکن ہے کرنل ہارڈنگ کو ہائی کمان کی جانب سے کوئی حکم نامہ ملا ہو، کوئی فرمان جس کی رُو سے وہ ریاست کے متعلقہ لوگوں سے کوئی فیصلہ کُن بات کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو یا اُن پر ہائی کمان کی ناراضی کا اظہار اُس کا مقصود ہو یا

خراج لینا مطلوب ہو یا پھر یہ کہ کرنل کو پُرانی باتیں یاد آگئی ہوں، بنیادی طور پر آدمی بہت انگریز ہے تو کیا ہوا۔ شاید وہ مجھے کسی مشورے کے اعزاز سے نوازنا چاہتا ہو میرے سر سے کن کھجورا چمٹ گیا تھا۔

چھاؤنی کے راستے میں کچھ دُور جا کے میں نے راستہ بدل دیا۔ چند منٹ بعد میری گاڑی راج محل کے بڑے دروازے پر کھڑی تھی۔ دربان نے میرا چہرہ دیکھا تو روایتی انداز میں سرخم کیا، میں نے سوچا کہ کون کیوں پھر طلب کرتا ہے بھائی؟ اندر گیٹ سے ملحق عمارت کا پہرے دار بھی جھک گیا۔ میں نے گاڑی روک دی، اُترنے کی زحمت نہیں کرنی پڑی، اندر سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا، مسکرایا، گردن جھکائی اور ایک طرف اشارہ کیا۔ پھر راج کماری کے سیکرٹری نے اُسی آراستہ پیراستہ کمرے تک میری رہبری کر دی جہاں پہلے میری نظریں خیرہ کی گئی تھیں۔

دیر نہیں گزری تھی کہ راج کماری کسی دروازے سے بے تابانہ نمودار ہوئی اور اُس نے پُرتپاک انداز میں میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "ہم کل اور آج دونوں دن تمھارے فون کا انتظار کرتے رہے۔" اُس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "مگر ہمیں معلوم تھا کہ تم کتنے مصروف ہو گے۔ سچ ہمیں ہیما کی موت کا بہت دُکھ ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

"ان دو دنوں کی تلافی میں نے آج آ کے کر دی۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کے کہا۔ "اب بتائیے، مزاج کیسا ہے؟ ہیما کا ذکر مت کیجیے گا۔"

"ہاں دل بہت اُداس ہو جاتا ہے مگر موہن! یہ ایک مسٹری ہے! تم کچھ بتاؤ گے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہیما تو بہت زندہ دل، بڑی خوش فکر لڑکی تھی۔"

"عجیب عجیب باتیں سننے میں آئی ہیں مگر آپ اپنی بتائیے، آپ کیسی ہیں؟ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے شگفتگی سے کہا۔

"تمھارے بارے میں سوچ رہے تھے۔" وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے بولی۔

"میرے بارے میں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! تم نے اتنی حیرت کیوں ظاہر کی؟" وہ میرے پہلو میں بیٹھتی ہوئی بولی۔ "ہم سوچ ہی رہے تھے کہ تم سے آخر کیسے رابطہ قائم کریں۔"

"دیکھیے آپ کے سوچنے کی دیر تھی، میں حاضر ہو گیا۔ بتائیے کیا حکم ہے؟ پستول میری جیب میں ہے۔ کہاں جانا ہے؟ کس کا سر لانا ہے؟" میں نے اُس کی مخروطی انگلیاں چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہم پر گولی چلا دو۔" وہ ناز سے بولی۔ "یا پھر ہمارے لیے زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا لا دو، جہاں بس ہم رہتے ہوں، شور نہ ہوتا ہو، جہاں سبزہ ہو، پھول ہو اور ہم ہوں۔"

"ہمیں اجازت ملے گی وہاں آنے کی؟"

"اوہ اجازت!" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "صرف تمھی کو وہاں آنے کی اجازت ہو گی۔" پھر وہ مچل کے کہنے لگی۔ "موہن! اب ہم سے مت کہنا کہ ہم پھر بڑی حویلی جائیں۔ کنور جگ دیپ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔"

"اب میں آپ سے نہیں کہوں گا لیکن کنول دیوی! آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ کنور جگ دیپ ایک مختلف مزاج کا شخص ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں کہ وہ ایک ....." میری زبان دانتوں تلے کٹ گئی۔

"کہو کہو۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "ہم مشتاق ہیں۔"

"وہ ایک مکمل راج کمار ہے۔" میں نے کسمسا کے کہا۔

اُس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے دھندلا گیا۔ "تم سچ کہتے ہو مگر ہم ایک مکمل راج کماری نہیں ہیں اور مہاراجا بھی مکمل مہاراجا نہیں ہیں۔"

"راج کمار دنیش چندر بھی ایک نامکمل راج کمار ہیں۔"

"اور تم ایک مکمل آدمی ہو۔" وہ اشتیاق سے بولی۔ "اب روز رات کو کھانے پر تمھارا ذکر رہتا ہے۔ رات مہاراجا کہہ رہے تھے کہ وہ دنیش چندر سے تمھیں مانگ لیں گے اور سنو۔" وہ جوش میں بولی۔ "ہم تمھیں ایک خاص وجہ سے فون کرنا چاہتے تھے۔ کئی دن سے ہم مہاراجا کو مجبور کر رہے تھے کہ دنیش چندر سے دوبارہ کماری شاردا کے سلسلے میں بات کریں، مہاراجا کماری شاردا کو پسند کرتے ہیں، تم نے اس سلسلے میں دنیش چندر کی جن مجبوریوں کا ذکر کیا تھا، ہم اس سے متفق ہیں، بے شک ان حالات میں یہ اقدام راج کمار دنیش کے لیے مسئلے پیدا کر سکتا ہے مگر مہاراجا کی تنہائیاں دیکھ کے ہمارا دل ہوتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ دنیش چندر جرأت کر کے یہ فیصلہ کر ہی لیں۔ دنیش چندر کی خاموشی مہاراجا کو بہت شاق گزری ہے۔"

میں نے گردن جھکا لی تاکہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟" وہ تردد سے بولی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں براہِ راست راج کمار دنیش سے آپ کو گفت گو کرنی چاہیے۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ آپ انھیں انکار کا اختیار ضرور دیں گی۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں، فرض کیجیے دنیش چندر ان حالات میں اسے ایک نامناسب اقدام سمجھتے ہوں تو انھیں مہاراجا سے کس طرح انکار کرنا چاہیے؟"

"ہم نہیں جانتے مگر دنیش چندر ایک رسمی اقرار ضرور کر سکتے ہیں چاہے وہ اس اقرار کو آخری شکل دینے میں مناسب وقت کا انتظار کر لیں، ہم پردہ پوشی کا وعدہ کرتے ہیں مگر اس طرح مہاراجا اور کماری شاردا میں یہ دُوری ختم ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے دنیش چندر کو اس صورت میں انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن بہرحال شاردا اُن کی بہن ہے اور فیصلہ اُنھی کو کرنا ہے۔"

"فرض کیجیے وہ شاردا کے لیے یہ رشتہ ناموزوں ہی سمجھتے ہوں؟"

"تو ہمیں افسوس ہو گا۔" وہ اداسی سے بولی۔

"اور مہاراجا کو؟"

"مہاراجا کو بھی بہت دُکھ ہوگا۔ جہاں تک ہم نے مشاہدہ کیا ہے ریاست راجے پور میں صرف نشارد ا ایک لڑکی ہے جسے مہاراجا نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ مہاراجا کی زندگی سے تم پوری طرح واقف ہو، انھوں نے اب تک شادی نہیں کی اور نہ اُن میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ہندوستانی راجاؤں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہم نے اسی لیے انھیں ایک نامکمل مہاراجا کہا ہے۔" ہم دنیش چندر کو مجبور تو نہیں کرسکتے لیکن تمھاری سفارش ضرور چاہیں گے۔"

"میری سفارش!" میں نے کھوکھلی ہنسی سے کہا "میں کسی مناسب وقت آپ کی یہ خواہش اُن تک ضرور پہنچاؤں گا۔ کماری ہیما کے سوگ کے دوران میں تو اُن سے کوئی بات نہیں ہوسکتی لیکن اس کے بعد اس کے بعد . . ." میری آواز حلق میں گھٹنے لگی تھی اس لیے میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

راج کماری کنول نے یہ موضوع ترک کردیا اور تمکنت سے بولی "یاد ہے تم پر کتنا اُدھار ہے؟ آج تم رات ہونے سے پہلے نہیں جاؤ گے۔"

"میں اور اُدھار چڑھانے آیا تھا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہم نے یہ سلسلہ ہی بند کردیا ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

راج کماری مجھے راج محل کی مصنوعی جھیل کی سیر کرانے لے گئی۔ میں نے کہا "یہاں تو ہر جگہ آپ کا نظارہ ہے۔ ہر جگہ آپ کھلی ہوئی ہیں۔" جھیل میں کنول کے بڑے بڑے چاندی کے طبق جیسے پھول مسکرا رہے تھے۔

"تمھیں یہ منظر پسند آیا؟" وہ تجسس بھری مسرت سے بولی۔

"بے پناہ ہے۔" میں نے حسرت سے جواب دیا۔ "لیکن کوئی دل کش منظر دیکھ کے ایک اداسی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے نہیں رہے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ دل گیر لہجے میں بولی "موسم بدل جاتے ہیں۔"

"پر یہ بھی ہے کہ ان مناظر کی قدر و قیمت بھی اسی سبب سے بیش ہے کہ یہ کم یاب ہیں۔" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

وہ مہاراجا سے میری ملاقات کرانے کے لیے بضد تھی کہہ رہی تھی کہ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ تم اُن سے ملے بغیر راج محل سے چلے گئے تو وہ ہم سے خفا ہوسکتے ہیں۔

مجھے معذرت میں ہزار عذر پیش کرنے پڑے۔ راج محل میں داخل ہوتے وقت مہاراجا سے ملاقات کرنے کی جو خواہش میرے دل میں روشن تھی، اب وہ معدوم ہوگئی تھی۔ راج کماری کنول مجھے واپس اپنے محل میں لے گئی۔ وہاں باندیوں نے انواع و اقسام کی چیزیں سجا رکھی تھیں۔ اُس لمبی میز پہ ہم دونوں تنہا بیٹھے تھے۔ راج کماری اپنے ہاتھوں سے پھلوں کی قاشیں تراش تراش کر مجھے دے رہی تھی۔ کھانے کی طرف طبیعت راغب نہیں تھی لیکن کماری کنول کے خیال سے میں نے چند قاشیں حلق میں اُتار لیں۔ پھر بہت دیر بعد مجھے جانے کی اجازت ملی۔ رخصت ہوتے وقت کماری کنول نم آواز اور رسیلے لہجے میں بولی "موہن! اب موسم کب بدلے گا؟"

میں نے اُس کا بازو تھام لیا اور اُس کی انگلیوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا "جلد ہی بشرطیکہ اب کے خزاں اس قدر شدید نہ ہو۔"

اُس نے یاسیت سے پلکوں کے پردے اُٹھائے۔ میں اُس کی غزالیں آنکھیں دیکھ کے سہم گیا۔ "ہم انتظار کرتے رہیں گے۔ ہم خزاں کو شکست دیں گے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی اور مجھے عمارت کے دروازے تک پہنچانے آئی۔ راستہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔

سڑک پر کافی دھوپ بکھری پڑی تھی۔ میں نہ جانے کس طرف آنکلا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سڑک اُوپر اُٹھتی جارہی ہو اور گاڑی کے نیچے زمین کھسک رہی ہو۔ گاڑی کی رفتار بہت سست تھی لیکن میرے اعصاب پر زلزلہ تو چل اور سست نہیں تھی۔ اسٹیرنگ قابو میں نہیں آرہا تھا۔ کئی جگہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا اور پھر دُور جا کے گمان ہوا کہ گاڑی کسی نامانوس راستے پر چلی آئی ہے۔ میں نے اُتر کے اردگرد کا جائزہ لیا، سورج سے سمت کا اندازہ ہوا۔ یقیناً یہ ریاست سے باہر جانے والی مغربی سڑک تھی۔ کبھی اسی راستے سے گزر کے میں ریاست راجے پور میں داخل ہوا تھا اگر کچھ دُور گاڑی اور آگے چلی جاتی تو ریاست کی آخری چوکی پہ اسے روک لیا جاتا اور پھر ریاست سے فرار کے الزام میں مجھے پولیس کے سپرد کردیا جاتا۔

میں نے اسٹیرنگ پوری طاقت سے گھما دیا۔ پھر وہی شہر راجے پور کی عمارتوں کے آثار آہستہ آہستہ اُجاگر ہونے لگے۔ دائیں ہاتھ پہ چھاؤنی کی سڑک تھی مگر اب مجھے کرنل ہارڈنگ سے ملنے کی کوئی بے چینی نہیں تھی۔ میں نے گاڑی بھون کے راستے پہ ڈال دی اور چوک سے گزرتا ہوا بھون کی فصیل کے نزدیک پہنچ گیا۔ سنتریوں نے جلدی جلدی دروازہ کھولا لیکن وہ گاڑی داخل ہونے کا انتظار کرتے رہ گئے۔ میں نے پھر اسٹیرنگ کا پہیا گھما دیا۔ گاڑی چوک سے گزرتی ہوئی چھاؤنی جانے والے راستے پر چڑھنے لگی۔

بہتر ہے آج ہی سب کچھ سن لیا جائے کہ نہ معلوم پھر کانوں کو سننے کا یارا رہے نہ رہے۔ آنے والے وقت سے زیادہ بے اعتبار کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہر موجود لمحہ غنیمت ہے۔ بہتر ہے کہ سماعت کا تمام حساب آج ہی بے باق کردیا

خفیفی

مذہب کے پیشوا خفیف شیرازی شاہی خاندان کے فرد تھے۔ توبہ سے پہلے انھوں نے چار سو عورتوں سے نکاح کیے، توبہ کے بعد بھی بادشاہوں اور رئیسوں کی بیٹیاں برکت کے حصول کی خاطر اُن سے نکاح کرتی تھیں لیکن وہ اُن سب کو مقاربت کے بغیر کنوارپنے میں طلاق دے دیتے تھے۔ ایک وزیرزادی سے بھی اُن کا نکاح ہوا تھا۔ صرف وہ اُن کے ساتھ چالیس برس تک رہی۔ ایک روز خفیف شیرازی نے اُسے اپنا سینہ دکھایا۔ اُن کے سینے سے ناف تک پیٹ میں اندر کی طرف بارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے کہا "وزیرزادی! یہ سب صبر کی گرہیں ہیں۔ ہم نے اب خوب صورت چہروں اور عمدہ کھانوں سے صبر کرلیا ہے۔"

جائے کہ موجود لمحہ بھی ایک شک ہے، وقت کیا ہے۔ وقت تو آدمی کا ہوش ہے، آدمی کی سانس ہے، آدمی بجائے خود ایک شک ہے کہ سانس اور ہوش دونوں غیر محفوظ و غیر معتبر ہیں۔ یہ گھڑی تو اصل میں وقت کا آلۂ پیمائش ہے، اصل وقت تو خود آدمی ہے کیونکہ گھڑی کی کارکردگی اُس کے حواس سے مشروط ہے۔ بس جب تک حواس چل رہے ہیں، گھڑی کی معنویت برقرار ہے، حواس بند ہوئے تو گھڑی کی صدا صدا بصحرا ہے۔ کبھی آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ بس اُس کا وقت اب ختم ہو رہا ہے، آدمی بھی تماشا ہے ختم ہوتے ہوئے وقت میں مذبذب ہو جاتا ہے اور پوری دنیا سمیٹ لینے کی فکر کرتا ہے اور جب دُنیا نہیں ملتی تو گردن ڈال دیتا ہے۔ میرا مذبذب پن مجھے چھاؤنی لے جا رہا تھا حالانکہ مجھے زندگی کے کھیل سے پوری آگہی تھی، لمحوں کا یقین ایک فریب ہے، آدمی اس فریب میں زندگی گزار دیتا ہے اور وقتِ مرگ کیا ہے؟ جب گزرنے والے لمحے بے یقین ہو جائیں تو وقتِ مرگ ہے اور یہی آگہی کی منزل ہے۔ سب سے بڑی آگہی خود آدمی کی اپنی آگہی ہے میرے سامنے پتھر اور کول تار سے بنی ہوئی ایک سیاہ سڑک پڑی تھی، اِدھر اُدھر درخت تھے اور سبز پوش پہاڑیاں تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ جھوٹ لگ رہا تھا۔ یہ گاڑی، یہ لباس۔ سب جھوٹ۔

مجھے اپنے سر پر پانی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اندر آگ لگ رہی تھی اور دماغ ہذیان بک رہا تھا۔ میں نے زور سے اپنا سر دروازے سے ٹکرا دیا اور نظریں سڑک پر جما دیں کیونکہ سڑک زندگی کا اثبات تھی اور زندگی آخر وقت تک آدمی کو اپنے اثبات کا یقین دلاتی رہتی ہے، بیچ سے کھینچتی رہتی ہے۔ جب میں آگے بڑھا تو زندگی نے کچھ کھلونے دکھائے۔ گزرا ہوا سارا راستہ لاکھی پور کے قبائل سے آزاد تھا، کوئی قافلہ بھی راستے میں نہیں ٹکرایا مگر ایک مقام پر مویشی چراتے ہوئے مرد اور عورتوں کا جھنڈ نظر آیا۔ زندگی ایک حسد ہے جو دوسرے لوگوں کو زندہ دیکھ کے پروان چڑھتا ہے۔ زندگی آدمی کو ایک دوسرے کا دشمن، ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے تاکہ آدمی زندگی کی طلب کرتا رہے۔ گاڑی گزری مگر لاکھی پور کے قبائلیوں نے سر اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ اِس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لاکھی پور میں پولیس اور گوروں کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اتنے رُسوا ہو گئے تھے کہ اب انھیں نگاہ اُٹھاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ چھاؤنی سے نزدیک فوجی گاڑیوں کی ایک طویل قطار سڑک پر حرکت کر رہی تھی۔ گورے اپنے لوہے اور بارود کو دھوپ دکھا رہے تھے۔ ریاست راجے پور کے لیے اتنا لمبا چوڑا سازوسامان، اِن کی صرف تصویریں دکھا دی جائیں تو لوگ سر جھکا دیتے۔

جب میں چھاؤنی کے دروازے پہ پہنچا تو پوری طرح زندگی کے تسلط میں تھا۔ تمام رسم کے لیے گاڑی روک دی گئی، پھر کچھ وقفے بعد شرمندگی کے ساتھ دروازہ کھول دیا گیا۔ کرنل کی کوٹھی کا آہنی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہاں کسی نے گاڑی نہیں روکی، سنگین بردار سنتری بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میں نے کوٹھی کے پورچ میں جا کے گاڑی کھڑی کر دی۔ کرنل ہارڈنگ وہاں تنہا موجود تھا۔ میں نے سب سے پہلے اُس کا چہرہ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اُس کی پتلیاں پھیری ہوئی تھیں اور لبوں پر ایک خفیف مسکراہٹ تھی اور ان دونوں علامتوں سے قیاس کا کوئی خاکہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ میں تیزی سے اُتر کے باہر آیا۔ کرنل کا ہاتھ باوقار انداز میں مصافحے کے لیے اُٹھا ہوا تھا۔

"کرنل ہارڈنگ!" میں نے اضطراب آمیز گرم جوشی سے اُس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ "میرے ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہیں۔"

"آؤ اندر آؤ۔" کرنل نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ میں اُس کے ساتھ چند گز کا فاصلہ طے کر کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کرنل نے دروازہ بند کر کے مجھے ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں تمھیں کس نام سے مخاطب کروں؟"

"کیا آپ نے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے بلایا ہے؟" میں نے ندامت سے کہا۔ "میں آپ کی خدمت میں اپنی تمام معذرتوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔"

"کچھ پیو گے؟" اُس نے بُردباری سے پوچھا۔

"مجھے شراب کی عادت نہیں ہے لیکن اگر آپ ....." میں نے جھجک کر کہا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے پوچھا۔ "دینا کہاں ہے؟"

"دینا نہیں ہے۔" اُس نے تحمل سے جواب دیا اور میرے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور سگار کے بجائے سگریٹ نکال کے سلگایا۔ "سگریٹ؟"

"شکریہ۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ کرنل اپنی دونوں آنکھیں بند کیے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کے بولا۔ "میں نے تمھیں ایک خاص کام سے بلایا ہے۔"

"جی ۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"اگر تم اجازت دو تو میں تم سے چند سوال کرنا چاہوں گا؟"

"بہتر ہے۔" میں نے بے قراری سے جواب دیا۔ "مگر کرنل! کیا میں اپنے آپ کو سوالوں کے جواب دینے کے لیے مجبور سمجھوں؟"

"نہیں ۔" اُس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوا۔ "قطعاً نہیں۔"

"تو میں اپنی اُس حیثیت کا تعین ضرور چاہوں گا جو سوالات کے دوران میں آپ کے ذہن میں ہوگی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھریں۔ وہ پھر کسی سوچ میں گُم ہو گیا اور کسی قدر جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "تم اسے ایک بزرگ اور ایک چھوٹے کی حیثیت دے سکتے ہو۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سکون سے آنکھیں بند کیں۔ "میں اسے

اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ میں دنیا میں صرف خود اپنا بڑا اور اپنا چھوٹا ہوں۔" میں نے کرب سے کہا۔ "آپ مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکتے ہیں۔"

اُس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے۔ "تم ایک اچھے نوجوان ہو۔ تمھاری برداشت کی قوت غیر معمولی ہے۔ صحت، ذہانت، برداشت اور حوصلہ۔ میں تمھاری خوبیوں کا معترف ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں مجھ سے کچھ شکایتیں ہوں گی لیکن جو کچھ بھی ہوا، وہ ایک ذمّے دار افسر کے احساسِ فرض کے تحت ہوا۔" وہ جزبز ہو کے بولا۔ "اور میں تم سے اُس کے لیے معذرت خواہ نہیں ہوں۔"

"تب مجھے آفیسرانِ کمانڈ کے مسائل کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آفیسرانِ کمانڈ میری ان تمام خوبیوں کے اعتراف کے باوجود آیندہ بھی اپنے احساسِ فرض سے مجبور ہو سکتے ہیں۔"

"بے شک،" وہ تیزی سے بولا۔ "تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔"

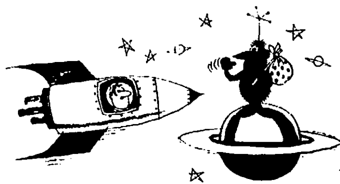
"غالباً ہم موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟" میں نے کمرے میں اُمڈتا ہوا تکدّر دُور کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔" اُس کے لہجے میں اداسی شامل تھی۔ "میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آیندہ زندگی میں تمھارے کیا عزائم ہیں؟ یعنی۔ تم نے اپنے لیے کچھ نہ کچھ تعیّن ضرور کیا ہوگا؟"

میں کشمکش میں پڑ گیا۔ کرنل نے ایک مشکل سوال کیا تھا۔ سوال کی نوعیت اور سوال کا پس منظر دونوں میرے لیے اُلجھن کا سبب بن گئے۔ میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل تجسّس سے میری طرف دیکھتا رہا۔

"کرنل!" چند لمحوں بعد میں نے زبان کھولی۔ "میں نے بہت دن ہوئے اس کے متعلق سوچنا ہی موقوف کر دیا ہے۔ یہ زندگی جو آپ کو نظر آتی ہے، میری نظر میں ایک اتّفاق ہے۔ نہ میں اسے غنیمت سمجھتا ہوں اور نہ اس کی کوئی شدید خواہش میرے دل میں ہے۔ اگر آپ آفیسرانِ کمانڈ کے عہدے پر مامور نہ ہوتے تو میں آپ کو اپنے ماضی کی کہانی سُناتا۔ اب صرف اتنا ہی عرض ہے کہ ماضی کے مذاق نے زندگی کے آنے والے دن بھی غیر سنجیدہ کر دیے ہیں۔ بس عزّت اور سُکھ کی خواہش ہے، اور کچھ نہیں اور ہاں۔۔۔ ہاں ایک خواہش اور ہے کہ اپنے دوست، اپنے آقا راج کمار دنیش چندر کو سرفراز دیکھوں۔ اُن کی خوشی میری لذت ہے، اُن کی عزّت میری سرخوشی ہے۔ میں اُن کی زندگی کی دعا مانگتا ہوں کہ اُن جیسے لوگوں کو زندہ رہنا چاہیے۔"

"لیکن۔ لیکن راج کمار دنیش چندر ایک ذی حیثیت آدمی ہیں، انھیں کس چیز کی کمی ہے، دولت، عزّت سب کچھ اُن کے پاس ہے۔ اگر تم ریاست کی غیر محفوظ اور بے امان صورتِ حال سے ڈرتے ہو تو یہ سب کے لیے یکساں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر راج کمار دنیش حسنِ تدبّر کا مظاہرہ کریں تو یہ بے امانی بھی دُور ہو سکتی ہے۔"



"کرنل! بخدا یہ حسنِ ظن ہے۔ ریاست کا سارا نقشہ آپ کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ ایسی کون سی تدبیر ہے جو میرے مالک راج کمار دنیش چندر نے نہ آزمائی ہو لیکن گولیاں رُکتیں ہی نہیں۔ گولیاں اُس وقت تک چلتی رہیں گی جب تک ریاست کے متعلق آپ کوئی حتمی حکم صادر نہیں فرما دیتے۔ حکم آپ نے روک رکھا ہے، معاف کیجیے کرنل! یہ گولیاں آپ کے لیے اتنی تشویش کا باعث نہیں ہوں گی کیونکہ آپ چھاؤنی میں اپنی فوج اور برتر ہتھیاروں کے ساتھ محفوظ بیٹھے ہیں اور ہندوستان میں انگریزوں کی حکمتِ عملی اس حقیقت کی مظہر ہے کہ یہ اندرونی اضطراب آپ کے اقتدار کے لیے خوش آیند علامت ہے مگر ان گولیوں سے ریاست کے عوام پر جو گزر رہی ہے، اُس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ فیصلے میں آپ کی تاخیر کا سبب اِس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی مرضی کے فیصلے کے لیے زیادہ سے زیادہ سازگار فضا کے انتظار میں ہیں۔"

کرنل کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں اُبھری۔ وہ دلچسپی سے میری باتیں سُن رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو وہ مسکرا کے بولا۔ "تم بہت زیادہ بدگمان ہو، تمھارے اندازے اتنے درست نہیں ہیں جتنی شدت سے تم انھیں بیان کر رہے ہو۔ میں تم سے ان میں ترمیم کی درخواست کروں گا، ہندوستان کی ریاستوں کے معاملے میں انگریز سرکار کا رویہ عام علاقوں سے مختلف ہے، ہم یہاں خود کو دوسری جگہوں سے زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں اور کسی ریاست کے اندرونی معاملوں سے بچنے کی ہر امکانی کوشش کرتے ہیں، ریاست راجے پور میں ہمارے کئی فوجی، تین اہم کرنیل مارے جا چکے ہیں، اس صورت میں ہائی کمان کی توجّہ اس ریاست کی طرف لازماً مبذول ہونی چاہیے۔ ہائی کمان ہی تمام طاقت کا سرچشمہ ہے۔ میں یہاں اُس کا ایک نمایندہ اور اُس کے مفادات کا نگراں ہوں۔ فیصلے میرے اختیار میں نہیں ہیں، یہ ہائی کمان کا منصب ہے اور ہائی کمان وہی فیصلہ کرے گی جو اُس کے بہترین مفاد میں ہوگا، جو ریاست میں آیندہ انگریز فوجیوں اور اہل کاروں کی زیادہ سے زیادہ ضمانت کا امین ہوگا، جس میں ریاست کے عوام کی خوش حالی اور سکون مضمر ہوگا، چاہے اس کے لیے ہائی کمان کو ریاست کے چند با اثر افراد سے تلخی مول لینا پڑے اور میں تمھیں ایک دوست کی حیثیت سے آگاہ کرتا ہوں کہ ہائی کمان کے سامنے راجے پور کا مسئلہ سرِ فہرست ہے۔ جلد ہی، بہت ہی جلد کوئی واضح صورتِ حال سامنے آ سکتی ہے۔"

"کرنل! آپ ڈپلومیٹک گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے اس لیے آپ سے پہلے پوچھ لیا تھا کہ آپ مجھ سے کس حیثیت میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

شاید آپ کو یاد نہیں رہا کرنل! آپ مجھے باتوں سے نہیں بہلا سکتے۔ میں نے کھل کر باتیں کی ہیں اور میں آپ سے بھی اسی لہجے کی توقع کرتا ہوں۔ ہائی کمان، ریاست راجے پور کا کوئی فیصلہ آپ کی شرکت اور تعاون کے بغیر نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے کسی کی سفارش نہیں کر رہا ہوں لیکن کرنل صاحب! میں اپنے دوست دنیش چندر کی طرف سے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اُس ہر فیصلے میں آپ کو اُن کی تائید حاصل رہے گی جو ریاست کے عوام کی بھلائی کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

کرنل نے اُٹھ کے دیوار میں نصب شیشے کی الماری کھولی اور شراب کا ایک پیگ بنا کے حلق میں انڈیل لیا۔ "موہن!" وہ کرسی پر بیٹھ کے مشفقانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "باتیں چلیں تو نہ جانے کہاں جا نکلیں، میں نے تمھیں ایک ضروری کام سے یہاں بلایا تھا۔ راج کمار دنیش چندر سے تمھاری ہمدردی بلاشبہ ایک مستحسن اور قابلِ ستائش امر ہے لیکن فرض کرو، اگر تم دنیش چندر کے پاس نہ ہوتے، راج کمار دنیش ایک ذہین اور بہادر شخص ہے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اُسے اپنے معاملات سلجھانے نہیں آتے ہیں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اپنے متعلق بھی سنجیدگی سے کچھ غور کرنا چاہیے تم اپنی ذہانت اور شجاعت سے زندگی میں اعلا سے اعلا مقام حاصل کر سکتے ہو۔ میں اس ریاست کے مستقبل کے بارے میں تم سے کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے حالات اور خراب ہو جائیں، یہاں کے مقامی لوگ ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ہائی کمان کے لوگ اپنے تین کرنیلوں کی محرومی سے سخت مشتعل ہیں تم نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں تمھارے ساتھ ڈپلومیٹک گفتگو سے گریز کروں سنو نوجوان موہن! میری بیٹی ریتا تم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ وہ مجھ سے سخت ناراض ہے کہ تمھیں چھاؤنی میں اتنی اذیت ناک سزائیں کیوں دی گئیں، میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے باپ کا حکم نہیں مانتی موہن! وہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ میں اُس سے دُنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ وہ ایک بہت اچھی، بہت ہی صاف اور نرم و نازک لڑکی ہے اُس کا دعوا ہے کہ تم بھی اُس سے شدید طور پر وابستہ ہو، وہ روز تمھارا ذکر کرتی ہے، ریاست کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر میں نے اُس سے تمھارے رابطے پر پابندی عاید کر دی تھی مگر میں اُس کے دل سے تمھارا خیال نہیں نکال سکا۔ میں اپنی لڑکی کے لیے بہت دُور جا سکتا ہوں جب وہ بہت کمزور اور چڑچڑی ہو گئی تو میں نے اُسے فون پر تم سے بات کرنے کی اجازت دے دی اور اب میں نے تمھیں اس لیے طلب کیا ہے یا یہاں آنے کی زحمت دی ہے کہ تم جس طرح بھی مناسب سمجھو، میں ریتا کو تمھارے سپرد کر دوں۔ ایک باپ اپنی اولاد کے لیے یہی ایثار کر سکتا ہے۔"

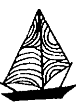
"کرنل! کرنل!" میرا سر چکرانے لگا اور میں اپنی نشست پر بیٹھ نہیں سکا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے رعشہ زدہ آواز میں کہا میری آنکھوں میں دُھند چھا گئی اور سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"میں تمھارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" کرنل نے سرد آواز میں کہا۔ "لیکن تم میری عزیز بیٹی کی پسند ہو اور اُس کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ میں نے یہ صداقت اچھی طرح پرکھ لینے کے بعد ہی تم سے گفتگو ضروری سمجھی ہے۔ وہ تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ تم میں اتنی ہی شامل ہو گئی ہے۔"

"لیکن کرنل! میں، میں ....."

کرنل نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ "تم جو بھی ہو، میں ریتا کے لیے اس آرزو کے ساتھ تمھیں قبول کرتا ہوں کہ تم دونوں ایک عمدہ زندگی گزارو گے۔ تم نے بھی ایک اچھی لڑکی منتخب کی ہے موہن! وہ چاہے جانے کے لیے ہے۔" وہ یاسیت سے بولا۔ "مگر، مگر۔" وہ منتشر سا ہو گیا۔ "مگر موہن! ایک مسئلہ میرے لیے اُلجھن کا سبب ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں اس بات کی تشہیر ہو کہ ایک ریاست کے آفیسر اِن کمانڈ اور انگریزوں کے ایک معزز فوجی افسر کی سفید فام لڑکی ایک ہندوستانی نوجوان سے منسوب ہو گئی ہے۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور یہ میرا ذاتی معاملہ ہے مگر میں نے اپنی پوری زندگی عزت و وقار حاصل کرنے میں گزاری ہے۔ میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ میری ریاضت اس طرح ضائع چلی جائے اور میں اپنے ساتھیوں اور ہندوستانیوں کی نظر میں تماشا بنوں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ تم ریاست میں ایک مشکوک، ایک مبہم اور پُراسرار آدمی کی حیثیت سے مشہور ہو اور ایک بڑے حلقے کی نفرت کا ہدف بنے ہوئے ہو۔ میں تمھیں لندن جانے کا مشورہ دوں گا۔ وہاں تم دونوں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو گے۔ میری ایک بڑی جاگیر تم دونوں کے تصرف میں رہے گی، میں تمھاری عدم موجودی میں تمھارے دوست دنیش چندر کا خیال رکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ریتا جیسی حسین اور ذہین لڑکی کے ساتھ تم اور تم جیسے وجیہہ اور جامع الصفات نوجوان کے ساتھ ریتا، تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک خوب صورت زندگی گزارو گے مگر ہر تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔"

میرا جسم شل ہو گیا۔



امبر بیل

سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

ایک نوجوان کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات
میر جمشید عالم کی سرگزشت،
اگر ایسے واقعات سے آپ دوچار ہوتے؟

باقی آیندہ شمارے میں

کوتلِ زنانہ کے بعد اردو کے مشہور ادیب اشرف صبوحی کے قلم سے اجڑے دیار کی کہانی

ایک مغل شہزادے کی نظرِ وحشت اثر کی تاریخی داستان

بچپن میں مجھ کو کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ جب تک کوئی کہانی نہ کہتا، مجھے نیند نہ آتی۔ ایک دن مجھے بخار ہوگیا۔ دوپہر سے جو چڑھا، رات ہوگئی۔ اماں جان میرے سرہانے بیٹھی سر دبا رہی تھیں۔ نانی مغلانی جن کا گھر ہماری دیوار سے لگا ہوا تھا، اتنے میں میری خبر سن کر آگئیں اور میرے تلوے سہلانے لگیں۔

نانی مغلانی کی عمر اس وقت اسی کے قریب ہوگی۔ بڑی ملنسار اور محبت کرنے والی۔ مجھ پر تو اُن کی جان جاتی تھی۔ آج تک مجھے اُن کی صورت، اُن کی محبت اور اُن کی باتیں یاد ہیں۔ صورت ایسی تھی جیسے جنّت کی حوروں کی سنتے ہیں اور باتوں کی لذت اللہ بخشے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہد کے گھونٹ کانوں سے ہو کر دل میں اُترے رہے ہیں۔

میں بخار میں کراہ رہا تھا اور وہ دونوں اس کوشش میں تھیں کہ کسی طرح مجھے نیند آجائے سر دبانے اور تلوے سہلانے سے جب میری آنکھ نہ لگی تو اماں جان نے کہا "میاں، سوتے کیوں نہیں؟ آنکھیں بند کرکے نیند کو بلاؤ تو۔ کہو تو نانی مغلانی تمھیں کوئی کہانی سنائیں؟"

میں جلدی سے بولا "ہاں نانی، سناؤ۔"

نانی مغلانی سنبھل کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں "بھئی، پرستان کا قصہ نہیں اسی دلّی کا واقعہ ہے۔ جب قلعہ آباد تھا اور بہادر شاہ تخت پر۔ اگلی باتیں تو کہاں رہی تھیں کہ شہزادوں، سلاطین زادوں کو تیر اندازی، تلواریں چلانی سکھائی جائیں، اُن کے کھیل تو یہ رہ گئے تھے کہ گھر میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، پچیسی ہو رہی ہے یا باہر نکلے تو مرغ بازی، پتنگ بازی ہونے لگی۔ بعض لاڈلے اور محل کے میت تو ایسے تھے کہ سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ برس کی عمر ہو جاتی تھی مگر انا منہ دھلاتی، کھلائی نوالے بنا بنا کر منہ میں دیتی۔ شہر میں کسی میلے ٹھیلے کو دیکھتے، کسی امیر وزیر سلاطین زادے کے ہاں شادی بیاہ کی شرکت کو جاتے تو کئی کئی بوڑھے مرد ساتھ ہیں، اللہ آمین ہوتی جاتی تھی۔"

انھی سلاطین زادوں میں ایک مرزا شبّو بھی تھے۔ نام تو میں نہیں بتاؤں گی، خدا اُن کی روح کو نہ شرمائے۔ بس مرزا شبّو ہی سمجھ لو۔ بڑے دیدارُو مگر ایسے بھولے کہ انیس برس کی عمر میں شرم کا یہ حال تھا کہ محل کی ساری لڑکیاں اُن سے مذاق کرتیں اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ اس شرم اور بھولے پن پر اللہ رکھے عاشق مزاج ایسے کہ آج کسی کی ہنسی پر فریفتہ ہو گئے تو کل کسی کے رونے پر لوٹ پوٹ۔ اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑے ہیں۔ جب تک کوئی ویسی ہنسی نہ ہنستا یا ویسا رونا نہ روتا، نہ دانہ کھاتے، نہ پانی پیتے اور اُن کی یہ باتیں اُٹھانے والے اُٹھاتے اس لیے کہ بادشاہ کے قریبی رشتے دار اور ماں باپ کے لاڈلے تھے۔"

"خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ شہر میں ایک بڑی دھوم کی شادی ہوئی، قلعے کی ساری شہزادیاں اور شہر کے امیروں کی بیویاں، بہو بیٹیاں اُس میں شریک ہونے کو آئیں۔ دولہا مرزا شبّو کا لنگوٹیا یار تھا لہٰذا وہ دولہا کے ساتھ ہاتھی پر تھے، دلھن کی ڈیوڑھی پر برات آکر رُکی بیگمات کی سواریاں اُتر رہی ہیں۔ دولھا ہاتھی سے اُترے تو مرزا شبّو بھی نیچے آئے۔ اتنے میں ایک پالکی کے کہاروں کا پاؤں رپٹا، پالکی کندھوں سے اُتر گئی اور پالکی کا پردہ کھل کر سواری کے کارچوبی دوپٹے کا پلّا نیچے لٹک گیا اور ساتھ ہی ایک مہندی لگا گورا گورا پاؤں نظر آیا۔ مرزا شبّو نے ایک کہی زدو، خنجر کمر سے کھینچ لٹکتا ہوا پلّا کاٹ لیا کہ غیروں کی نظر نہ پڑے، اُنھیں پردے کا بڑا خیال تھا، پلّا کاٹنے کو تو کاٹ لیا مگر پلّے والی کے پاؤں پر عاشق ہو گئے اور یہ کیفیت ہوئی جیسے تیر لگا ہوا کبوتر تڑپنے لگے۔ ساتھ والے بہ مشکل گھر لائے۔ گھر آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ گئے محلات کی لونڈیاں باندیاں نوکریں چاکریں پھاپھا کٹنیاں ہوتی ہیں، مرزا کو جو اس حال میں آتے اور آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ جاتے دیکھا تو لگیں اِدھر اُدھر دوڑنے۔ زنانے میں جا کر کچھ اس طرح کہا کہ بیگمات سہم گئیں۔ کوئی کہتی کسی جوانا مرگ کی نظر لگ گئی ہزار بار کہا ہے کہ اس طرح بن سنور کر نہ جایا کرو، اوپر والیاں چیلوں کی طرح منڈلایا کرتی ہیں کوئی بُرے وقت کو کوستی پیٹتی، کسی نے سجدے میں پڑ کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں، کسی نے صدقے کی چیزیں منگائیں۔ زنانے سے مردانے تک عورتوں مردوں کا تانتا لگ گیا۔ جھاڑ پھونکیاں ہو رہی ہیں ملّا سیانے بلائے جا رہے ہیں، پوچھا جا رہا ہے صاحب عالم منہ سے تو بولیں؟ بتاؤ تو کیا ہوا؟ تم تو تلوار باندھ کر گئے تھے پھر بُری نظر کا وار کس طرح ہو گیا لیکن صاحب عالم جو پڑے ہیں تو منہ سے بولنا، سر سے کھیلنا کیا، کروٹ تک نہیں لیتے۔

"قلعے کی سرکاروں میں ایسے ویسے چپڑ قناتیوں کا گزر تو تھا نہیں کیسی ہی چھوٹی ڈیوڑھی سہی جب کسی کو نوکر رکھتے تو اُس کی سات پیڑھیوں کی تحقیقات کر لیتے پھر شہزادوں اور سلاطین زادوں کے ساتھ رہنے والوں اور مصاحبوں کے لیے تو ایسی چھان بین ہوتی جیسے بیٹا بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے اصیلوں نجیبوں کے لڑکے تلاش کیے جاتے جو صورت شکل کے بھی اچھے ہوتے کوئی فی بھی اُن کے اندر نہ ہوتی اور وقت پڑنے پر اپنے آقا کے پسینے کی جگہ خون بہانا اپنی اصالت اور شرافت سمجھتے۔"

"اچھا تو یہ صاحب عالم جن کا قصہ ہے اُن کی صحبت میں بھی کئی نوجوان تھے۔ یوں تو ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے تعلق سے آقا کی اس حالت کا افسوس تھا کہ اُن کے ہنسی مذاق اور چہل قدم خورندم پر اوس پڑ گئی تھی لیکن حقیقی صدمہ ایک بانکے مرزا کو تھا، بیسیوں پاؤں کی بلّی کی طرح تڑپتے پھرتے پہروں صاحب عالم کے سرہانے بیٹھے رویا کرتے۔

چوتھا دن تھا کہ دوپہر کے وقت صاحب عالم نے ہائے اللہ کر کے دوشالہ منہ سے ہٹایا اور آنکھ کھول کر بانکے مرزا کی طرف دیکھا، اُس وقت اتفاق سے یہی دونوں تھے۔

صاحب عالم: کون؟ بانکے مرزا؟

بانکے مرزا: جی ہاں غلام ہے۔

صاحب عالم: ارے بھئی جاؤ اپنے گھر میرے ساتھ کیوں مر رہے ہو؟

بانکے مرزا: صاحب عالم! یہاں سے تو میری لاش جائے گی اور آپ دیکھ لیں گے۔

صاحب عالم: کیوں بھئی؟

بانکے مرزا: صاحب عالم ایسی زندگی پر تُف ہے کہ جس کی ہم خدمت کریں وہ ہمیں اپنا دکھ درد کہنے کے قابل بھی نہ سمجھے۔

صاحب عالم: اور جو بات بتلانے کی نہ ہو؟

بانکے مرزا: اسی لیے تو عرض کرتا ہوں آپ نے مجھے ذلیل سمجھا بہت اچھا نہ بتائیں یہ کہہ کر بانکے مرزا نے خنجر کمر سے کھینچ اپنی چھاتی پر رکھا اور چاہتے ہی تھے کہ اپنا دل چھید ڈالیں، صاحب عالم نے جھپٹ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑی ضد بحث کے بعد صاحب عالم نے مرزا بانکے کے ہاتھ سے خنجر لیا اور اپنے پاس بٹھا کر ساری داستان سنائی کہ اس طرح میں فلاں کی شادی میں گیا تھا، وہاں ایک پالکی اُتر رہی تھی۔ یوں پالکی کے کہار رپٹے، یوں پالکی کا پردہ کھل گیا اور اس طرح پالکی میں بیٹھنے والی کے دوپٹے کا پلّا لٹک پڑا، یہ خیال کر کے میں نے وہ پلّا کاٹ لیا کہ پردہ فاش نہ ہو، اُس میں سواری کے پاؤں کا تلوا نظر آیا جسے دیکھتے ہی میری بُری حالت ہو گئی۔ نہ بھوک ہے نہ پیاس۔ زندگی اجیرن معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ اور دو چار دن میرے پہلو میں نہ آ گئی تو ارادہ ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں یا اپنا گلا کاٹ لوں۔

بانکے مرزا: بس!

صاحب عالم: (ٹھنڈی سانس لے کر) بس اور تمھیں معلوم ہے کہ میں اپنی دُھن کا کیسا پکّا ہوں۔

بانکے مرزا: اچھا تو آپ اب کھڑے ہو جائیے۔ کھائیے پیجیے ہنسیے بولیے، ذرا فکر نہ کیجیے، اُس پالکی والی کا پتہ لگانا اور لاکے آپ کے پہلو میں لا بٹھانا بانکے مرزا کا کام ہے۔

صاحب عالم: (خوش ہو کر) تم اُس کا پتہ لگا لو گے؟

بانکے مرزا: پتہ نہیں لگاؤں گا تو منہ نہیں دکھاؤں گا۔ دوپٹے کا وہ پلّو جو آپ نے کاٹا ہے، مجھے عنایت کر دیجیے۔

صاحب عالم: (پلّو اپنے سرہانے سے نکال کر دیتے ہیں) کب تک؟

بانکے مرزا: کم سے کم پندرہ دن اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔ میری شرافت پر بھروسا کیجیے، اب میں رخصت ہوتا ہوں۔

"بانکے مرزا نے رفاقت کے جوش اور شرافت کے تقاضے سے وعدہ تو کر لیا مگر جب قلعے سے باہر نکلے تو سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیا حماقت کی شادی تھی، ہزاروں عورتیں آئی ہوں گی پھر فقط دوپٹے کے ایک پلّو سے کس طرح پتہ لگ سکتا ہے کہ کون تھا لیکن اب تو وعدہ کر آئے تھے، 'قولِ مرداں جاں دارد'

بڑا فکر ہوا، چاروں طرف خیال دوڑایا۔ شادی والے دن اتفاق کی بات یہ آگرے گئے ہوئے تھے، سواریاں بھی آتے جاتے نہیں دیکھی تھیں۔"

"سوچتے سوچتے شہر کی کٹنیاں یاد آگئیں جو سب سے زیادہ چالاک تھیں انھیں مجھ ہی قصہ سنایا اور کھوج لگانے کے لیے مقرر کیا۔ کٹنیوں نے بھی انعام کے لالچ میں ایک ایک کوچہ چھان مارا مگر کوئی کھوج نہ لگا، بھلا شریف زادیں میں کون اپنا گھونگھٹ کھولتی اور لاجوں مرتی، آخر وعدے کے دن پورے ہونے کو آئے اور کوئی صورت نہ نکلی۔ بانکے مرزا نے دل میں ٹھان لی کہ اب اس سے پہلے کہ صاحب عالم کو منہ دکھاؤں مرجانا بہتر ہے۔ دل میں یہ ٹھان کر سنکھیا لائے اور اس کی پڑیا اپنے سرہانے رکھ لی کہ رات کو کھاکر سو جاؤں گا۔"

"تھے ایسے مرد کہ اپنی بیوی سے بھی کچھ نہیں کہا۔ مہینے بھر میں کسی نے نہیں جانا کہ بانکے مرزا کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اب یہ تماشا سنو، جس دن بانکے مرزا نے سنکھیا لاکر رکھی ہے اُسی روز اتفاق سے اُن کی بیوی نے دھوپ دینے کو اپنے کپڑے نکالے۔ اچانک ایک دوپٹے پر مرزا کی نظر پڑی، غور سے دیکھا تو اُس کا پلا کٹا ہوا دکھائی دیا، اچھل پڑے۔ جلدی سے صاحب عالم کا دیا ہوا پلو کا ٹکڑا نکالا، دوپٹے سے جاکر ملایا تو ٹھیک تھا۔

بیوی : آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

مرزا : ذرا کوٹھری کے اندر چلو تو بتاؤں۔

بیوی میاں کے تیور دیکھ کے ڈر گئی۔ مرزا نے ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لی اور دوسرے ہاتھ سے بیوی کا بازو پکڑا اور اندر لے گئے۔

بانکے مرزا : یہ کس کا دوپٹا ہے؟

بیوی : (سہمی ہوئی آواز سے) میرا۔ آپ ہی نے بنا کر دیا تھا، یاد کر لیجیے۔

بانکے مرزا : یاد ہے مگر اس کا پلو کٹا کس طرح؟ سچ سچ بتادو ورنہ خیر نہیں۔

پارسا بیوی پہلے تو بہت گھبرائی لیکن چونکہ خطاکار نہ تھی اس لیے اُس نے حرف بہ حرف سارا واقعہ سُنا دیا اور مرزا کے قدموں پر سر جھکا کر بولی: "لونڈی کا اتنا قصور ضرور ہے کہ آپ سے کہا نہیں، اب آپ کو اختیار ہے۔"

اتنا سُن کر بانکے مرزا پر ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی اور کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ بڑی دیر تک مرزا کچھ سوچتے رہے پھر ایک دفعہ ہی جیسے سوتے سے آدمی جاگتا ہے، پیچھے ہٹ کر بولے: "بیگم! میں زبان دے آیا ہوں۔"

بیوی : (سر اٹھا کر حیران ہوتے ہوئے) کیا زبان دے آئے؟ اور کسے؟

مرزا : یہ نہ پوچھو اور جو میں کہوں کرو۔

بیوی : مجھے آپ کے حکم سے کب انکار ہے۔

مرزا : تو یہی جوڑا جس کے دوپٹے کا پلا کٹا ہوا ہے پہن لو۔ بناؤ سنگھار بھی اُس دن جیسا کر لو، میں ابھی پینس لاتا ہوں، اُس میں بیٹھ کر جہاں میں لے جاؤں چلو۔

بیوی میاں کا منہ دیکھنے لگی۔ کچھ بولنے کی جرأت نہ تھی، آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ یہ دیکھ کر مرزا نے بڑی ہمت سے کہا "دیکھو بیگم! آج تک تم میری بیوی تھیں اور میں تمھارا میاں لیکن آج میں یہ رشتہ توڑتا ہوں۔"

بیوی اتنا سُنتے ہی سفید پڑ گئی اور بدن تھر تھرانے لگا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر گلوگیر آواز میں کہنے لگی: "اچھا اتنا تو بتا دو کہ تم مجھ سے خفا تو نہیں؟"

مرزا بولے: "بیگم! اس وقت ایسی باتیں نہ کرو، میرے ارادے میں ذرا سا فرق آیا تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ میرا لاشہ تمھیں تڑپتا ہوا نظر آئے گا۔"

یہ کہتے ہوئے مرزا باہر چلے گئے۔ پالکی لاکر دروازے پر لگا دی، بیوی ہانپتی کانپتی پالکی میں سوار ہوئی، آگے آگے مرزا تھے اور پیچھے پیچھے پالکی، قلعے میں داخل ہوئے اور صاحب عالم کے دیوان خانے پر جا پہنچے۔

دروازے میں پالکی رکھوائی، آپ اندر گئے، صاحب عالم مسہری پر لیٹے ہوئے تھے، مرزا کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے اور بولے: "کہو مرزا ہمارا کام بنا؟ تمھارے وعدے میں صرف آج اور کل کا دن باقی ہے۔"

مرزا : آپ نے مرزا کو سمجھا کیا ہے صاحب عالم! ابھی ہمارے خون میں اصالت کے جوہر موجود ہیں، آپ کی مراد لے کر آیا ہوں۔

صاحب عالم : (بیتاب ہو کر) کہاں؟ کہاں؟

مرزا : ڈیوڑھی میں پینس رکھی ہے۔

صاحب عالم تھے تو نرے صاحب عالم اور عاشق مزاج بھی لیکن ابھی تک اپنے بڑوں کی عزت کا پاس تھا، رعایا کی بہو بیٹیوں پر بری نظر ڈالنے کی عادت نہ تھی، کچھ سہم سے گئے اور متوحش آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

مرزا : آپ گھبرا کیوں گئے؟

صاحب عالم : بڑے حضرت کا ڈر ہے۔

مرزا : اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔

صاحب عالم : تو پھر اندر لے آؤ۔

مرزا : لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ میں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ کام کیا ہے۔ چار گھنٹے کے وعدے پر لایا ہوں، شوہر والی ہیں، کوئی رانڈ بیوہ یا بازاری عورت نہیں۔

صاحب عالم : اچھا انھیں اندر بھیج دو لیکن تم کہیں چلے نہ جانا۔

مرزا "بہت خوب" کہہ کر ڈیوڑھی میں پالکی کے پاس آئے اور بیوی کو آواز دی۔ بیوی پریشان، میاں کی اس حرکت سے سہمی ہوئی، اپنے خیالات میں محو ایک طرف خاموش بیٹھی تھی۔ میاں کی آواز جو سُنی تو چونک پڑی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "فرمائیے۔"

مرزا نے کہا: "یہ میرے ولی نعمت کا مردانہ مکان ہے۔ اندر صاحب عالم تشریف رکھتے ہیں، اتر کر اُن کی خدمت میں جاؤ، اُن کا دل بہلاؤ، میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے مرزا کی آواز بھر آگئی مگر وہ بات کے دھنی تھے۔ بولے "وہیں منہ پھیرے لیتا ہوں، اتر دو اور اندر جاؤ۔ سامنے والے کمرے میں صاحب عالم تشریف فرما ہیں۔"

بیوی کانپتی، ڈرتی پالکی سے اتری اور لڑکھڑاتی ہوئی اندر گئی، منہ دوپٹے سے چھپا ہوا تھا اور آنکھوں سے لڑیاں جاری تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر صاحب عالم کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

صاحب عالم نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور نظر نیچی کر لی، جوانی تھی تنہا آدمی تھے، اُس پر عشق لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہاتھ بڑھائیں، آنے والی کی سسکیوں کے ساتھ رونے کی آواز برابر کانوں میں چلی آ رہی تھی۔

صاحب عالم: (نیچے آنکھیں کیے کیے) نیک بخت تم تو رو رہی ہو۔ میں تم سے کچھ کہتا تو نہیں، صرف اتنا بتا دو کہ تمھارے میاں کون ہیں؟

عورت: (بڑی مشکل سے) بانکے ..... مرزا .....

صاحب عالم: (حیرت سے) تم بانکے مرزا کی بیوی ہو؟ تمھارا ہی دوپٹا زمین پر لٹک گیا تھا؟

عورت: (روتے ہوئے) جی ہاں یہ دیکھیے۔

صاحب عالم (گھبرا کر) "غضب غضب، لاحول ولا قوۃ" اور وہ ننگے پاؤں، ننگے سر ڈیوڑھی کی طرف چلے، عورت سہم کر اوندھے منہ سجدے میں گر پڑی۔

بانکے مرزا ڈیوڑھی میں آنکھیں بند کیے مونڈھے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ صاحب عالم نے آتے ہی کہا: "اماں مرزا! تم یہ کس کو لے آئے؟ اُن پر تو کوئی جن عاشق معلوم ہوتا ہے، جوں ہی میں نے انھیں ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا، تاب دان میں سے ایک نہایت بدہیئت ہاتھ نکلا اور آواز آئی خبردار! یہ ہماری منکوحہ ہے، ہاتھ لگایا تو ابھی گلا گھونٹ دوں گا۔ اس لیے انھیں تو یہاں سے لے ہی جاؤ۔"

مرزا نے کہا: "صاحب عالم! یہ تو آپ نے میری ساری محنت ہی اکارت کر دی۔ حضرت وہم نہ کیجیے۔ جائیے اب کے اگر ہاتھ دکھائی دے تو مجھے بلا لیجیے گا۔ میرے سامنے اگر ہاتھ نکلا تو جن کو بھی ٹھنڈا ہی سمجھ لیجیے۔"

مرزا کی رفاقت اور محبت کا نقش صاحب عالم کے دل میں اور بھی گہرا بیٹھتا جاتا تھا۔ آخر تیموری خون میں جوش آ گیا۔ غیرت آئی، سوچا کہ مرزا نے میرے نمک کا پاس کر کے اپنی بیوی کو مجھ تک پہنچا دیا، اب مجھے بھی اپنی شرافت دکھانی چاہیے۔ مرزا کو اپنے آگے لے کر کہا: "اچھا مرزا دیکھوں تم کتنے بہادر ہو جاؤ اور انھیں ہاتھ لگاؤ، اس جن سے مقابلہ کرو، اتنے میں ذرا محل ہو آؤں۔"

یہ کہتے ہوئے صاحب عالم تو زنانی ڈیوڑھی کی طرف چلے اور مرزا ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کمرے کے اندر پہنچے۔ بیوی کو دیکھا کہ سر بسجدہ ہے، آواز دی کچھ جواب نہ ملا۔ آنکھیں تاب دان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ چھپر کھٹ کے اندر سے ایک سیاہ بھجنگ کالا ہاتھ نکلا اور آواز آئی "خبردار جو اس عورت کو کسی نے ہاتھ لگایا، اسے فوراً اپنے گھر پہنچا دو۔"

مرزا پہلے تو جھجکے، پھر سنبھل کر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور اللہ کا نام لے کر نکلے ہوئے ہاتھ پر تلوار ماری اور آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر تو ہاتھ چھپر کھٹ کے اوپر گرا اور ادھر تاب دان کی پشت پر کسی کے گرنے کا دھماکا ہوا۔ نوکر چاکر آواز سن کر دوڑے، دیکھا تو صاحب عالم خون میں لت پت بے ہوش پڑے ہیں۔ شور مچ گیا کہ صاحب عالم کے دشمنوں کا کسی نے خون کر دیا۔ مرزا کے کانوں میں جو یہ آوازیں پہنچیں تو وہ کٹا ہوا ہاتھ دیکھتے دیکھتے باہر پہنچے اور "ہائے صاحب عالم، میرے آقا!" کہہ کر صاحب عالم کے پاس گر پڑے اور پھر سنبھل کر اُٹھے۔ بیوی کو تو سوار کر کے گھر روانہ کیا اور صاحب عالم کو اٹھوا کر کمرے میں لائے، جراحوں کو چپ چپاتے بلوایا، مرہم پٹی کروائی، ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔

خدا خدا کر کے کوئی مہینے بھر بعد زخم مندمل ہونا شروع ہوا اور صاحب عالم اپنے سہارے اُٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے لگے، اب ایک دن رات کے بارہ بجے موقع پاکر مرزا نے ذرا کڑے تیوروں سے صاحب عالم سے کہا۔ "قبلہ! یہ آپ کو کیا سوجھی تھی؟ میرا ہی نامۂ اعمال سیاہ کرنا تھا؟"

صاحب عالم نے جواب دیا: "سنو مرزا! جب تم سر ہوئے تو میں نے اپنا حالِ زار تم کو سنا دیا اور تم اُس کا کھوج لگا کر میرے پاس لے بھی آئے لیکن جب اُس نے بڑی مشکل سے بتایا کہ میں بانکے مرزا کی بیوی ہوں تو تمھارا نام سنتے ہی مجھے اتنی غیرت آئی کہ اگر خودکشی گناہ نہ ہوتی تو اُسی وقت اپنا خاتمہ کر لیتا۔ ہے ہے مرزا! ایک معمولی سا آدمی تو نمک کی اتنی پاس داری کرے اور میں بادشاہوں کی اولاد کہلا کر اپنی رعایا کے حق میں بھیڑیا نکلوں؟ اُس وقت مجھے یہی سوجھا کہ جس ہاتھ سے اُس پاک دامن کا پلو چھوا تھا، وہ ہاتھ اسی شخص کی تلوار کاٹے جس کا میں گنہگار ہوں چنانچہ یہ ڈھونگ بنایا اور ترکیب کارگر نکلی۔"

مرزا نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "بہرحال آپ نے اچھا نہیں کیا، میری آنکھیں آپ کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتیں، خیر اب آپ آرام فرمائیے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

صبح نوکر چاکر اُٹھ کر صاحب عالم کے کمرے کی طرف آنے لگے تو مرزا کے بچھونے پر خون کے چھینٹے دیکھے۔ چادر جو ہٹائی تو چھاتی میں خنجر گھسا ہوا تھا اور مرزا مردہ۔

یہاں تک کہانی کہنے کے بعد مغلانی نانی چپ ہو گئیں۔

والدہ: اور اُس بے چاری بیوی پر کیا گزری؟

مغلانی: خدا نے جیسی ڈالی صبر شکر کیا۔ اُس زمانے کی عورتیں ایسی تو تھیں نہیں کہ ہائے واویلا مچا کر محلہ سر پر اُٹھا لیتیں۔ دو دن کے بانکے مرزا اتنا چھوڑ گئے تھے کہ بیوی کی ساری زندگی کو بہت تھا۔ کونے میں بیٹھ کر آبرو کے ساتھ گزار دی۔

والدہ: کاش میں انھیں دیکھتی۔

مغلانی نانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولیں۔ "لو لو دیکھ لو۔ وہ جنم جلی بانکے مرزا کی بیوہ یہی ہے۔"

والدہ حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگیں۔ میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور گھر میں ایک سناٹا چھا گیا۔



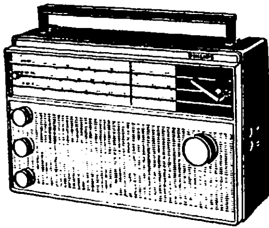
ریڈیو کا انتخاب بھی کوئی مسئلہ ہے؟

فلپس

خریدیئے اور کئی دیگر فوائد حاصل کیجئے!

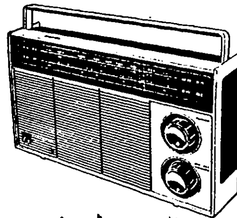


فلپس ۴ بینڈ ٹرانزسٹر ریڈیو

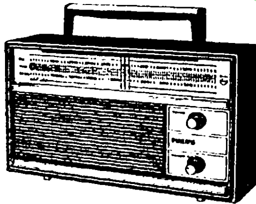


فلپس ۳ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو

فلپس کوالٹی
فلپس گارنٹی
فلپس سروس



فلپس ۲ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو



فلپس ایک بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو

ہمیشہ فلپس  کی مصنوعات طلب کیجئے

ہزارہ کے برف پوش، سبزہ زار پہاڑیوں میں پیش آنے والا ایک دلچسپ واقعہ



اُردو کے جوان سال افسانہ نگار
انور خواجہ کی ایک کہانی آپ
گزشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اب
اُن کی ایک اور خوب صورت تحریر پڑھیے

ڈونگا گلی اور چھانگلا گلی کے درمیان ایک نالے کا پُل ٹوٹ گیا تھا۔ گزشتہ دو روز سے سخت طوفانی بارش ہو رہی تھی اور پہاڑی نالے اس طرح غیظ و غضب میں تھے جیسے پُل کے ساتھ سڑک بھی بہالے جائیں گے۔ شکر یہ ہے کہ صرف پُل ٹوٹا تھا ورنہ اکثر پہاڑ کا پہاڑ گر پڑتا تھا اور اپنے ساتھ کئی سو گز سڑک بھی لے جاتا تھا۔ ایسی صورت میں سڑک ہفتوں مہینوں بند رہتی تھی۔ پہاڑوں کے حصّے اور بھاری چٹانیں گرنے کا سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ فطرت کا نظام بدل رہا ہے، شاید بارشیں زیادہ ہونے لگی ہیں لیکن بارشیں تو پہلے بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ اکثر یہ تبدیلی لانے میں فطرت کے علاوہ انسانوں کا بھی خاصا دخل ہوتا تھا۔

پاکستان میں سوات اور ہزارہ کے سوا کہیں بڑی تعداد میں قدرتی جنگل نہیں ہیں۔ ملک کی ترقّی اور تعمیرات بڑھنے کے ساتھ ساتھ عمارتی لکڑی کی مانگ بھی زیادہ ہوئی۔ ٹھیکے داروں نے محکمۂ جنگلات کے افسران کو نذر و نیاز دے کر نہایت بے دردی سے جنگلات کاٹنے شروع کر دیے۔ اس طرح گلیات کی پہاڑیاں گنجان جنگلوں سے خالی ہو گئیں۔ درخت جہاں زمین کا حُسن بڑھانے میں زیور کا کام دیتے ہیں، وہاں زمین کو بارشوں اور طوفانوں کی دست بُرد سے بھی بچائے رکھتے ہیں۔ اُن کی مضبوط اور دور گہرائی تک پھیلی ہوئی جڑیں مٹّی اور پتھّروں کو جکڑے رکھتی ہیں۔ اب درخت کٹ جانے سے زمین ننگی ہو گئی تھی۔ تیز بارشوں اور تیز و تند پہاڑی نالوں کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ مٹّی اور پتھّر بہا کر لے جائیں اس لیے ڈونگا گلی اور چھانگلا گلی کے درمیان پہاڑ اور چٹانیں گرنے کے واقعات زیادہ ہونے لگے تھے۔ اس سڑک کی دیکھ بھال کے لیے رفاہِ عام کے محکمے نے ڈونگا گلی میں اُوَرسیئر احمد خاں، دو منشی اور کئی مزدور مستقلاً تعینات کیے ہوئے تھے۔

احمد خاں کو پُل ٹوٹنے کی خبر ملی تو وہ دوسرے ہی دن اپنا عملہ لے کر وہاں جا پہنچا۔ اُس نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ پُل کی مرمّت پر کم سے کم دس بارہ دن لگیں گے۔ اس لیے انھوں نے سڑک سے ہٹ کر ایک بلندی پر ڈیرے ڈال دیے۔ وہاں محکمہ جنگلات کے فارسٹروں کے لیے دو جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ اُن جھونپڑوں کے سامنے پہاڑ کی جانب ایک اُونچا نیچا میدان تھا۔ میدان میں دیودار کا ایک پُرانا تناور پیڑ اُگا ہوا تھا اور چاروں طرف صنوبر اور دیودار کے درخت پہرے داروں کی طرح ایستادہ تھے۔

پُل کی مرمّت تیزی سے ہو رہی تھی لیکن یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا تھا کہ بارش پھر نہ شروع ہو جائے۔ اگرچہ دسمبر کا مہینہ ابھی شروع ہی ہوا تھا اور برف باری دسمبر کے آخر میں ہوتی ہے لیکن پہاڑی علاقوں میں موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ایک دو دن کی موسلا دھار بارش کے بعد برف گرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ احمد خاں نے اس خطرے کے پیشِ نظر مزدوروں کے لیے ایک ہفتے کی خوراک کا بندوبست کر لیا تھا۔

ایک صبح وہ سو کر اُٹھے تو ماحول پر موت کا سکوت طاری تھا۔ ہر طرف مکمّل خاموشی تھی اور فضا پر سفید بادلوں کی چادر تنی ہوئی تھی۔ دُور چھانگلا گلی کی چوٹی کے پاس آسمان ایسا لگ رہا تھا جیسے کفنائے ہوئے مُردے اُٹھائے کھڑا ہو اور جب یہ مُردے نیچے آئیں گے تو ماتم کی صورت میں بارش برسنی شروع ہو جائے گی۔ ہر چیز ساکت و صامت تھی جیسے موت کی دہشت چھائی ہوئی ہو۔ پرندے گھونسلوں میں چھپ گئے تھے اور جانور بلوں میں غائب ہو گئے تھے۔ نہ معلوم پرندوں اور جانوروں کو آنے والے خطرے کا علم انسانوں سے پہلے کیسے ہو جاتا ہے۔ دیودار کے سوئی دار پتّے بے حس و حرکت تھے کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں آ رہا تھا۔

موسم کا یہ حال دیکھ کر تمام مزدوروں کی طبیعتیں بھاری ہو گئیں۔ اُن کے لب کسی اندرونی خوف نے سی دیے تھے۔ یہ بادل انھیں اپنے سروں پر جلاد کی تلوار کے مانند لٹکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں بادلوں کی اس دغا باز خاموشی کا علم تھا۔ پھر تیز ہوا چلی، بادلوں کی شیشے کی دیوار ٹوٹ اور وہ پارہ پارہ ہو گئے۔ کالی کالی گھنگھور گھٹائیں چاروں طرف سے آئیں اور آسمان پر پھیل گئیں، محیط ہو گئیں۔ مزدوروں کو ایسا لگا جیسے اُن کی چھاتیوں پر کسی نے برف کی سلیں تہہ بہ تہہ رکھ دی ہوں۔ بارش کے باریک باریک قطرے گرنے لگے۔ ہوائیں خنکی برف کی خبر لائی اور آدھی رات کے بعد برف گرنے لگی۔ روئی کے گالوں کے مانند گھومتے ناچتے بل کھاتے برف کے گالے گرنے لگے۔

برف کی سفیدی سے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے ٹھنڈی یخ بستہ چاندنی پھیلی ہوئی ہو۔ صبح جب سورج کا سنہرا رتھ پہاڑ کی چوٹی پر آ کے رکا تو اُس کی شعاعوں سے نیلے، پیلے، سرخ، نارنجی اور جامنی رنگ نکلے پھر اُس کی روشنی سفید ہو گئی۔ برف نے زمین و آسمان سفید کر دیے۔ کھائیاں اور ترائیاں حدِ نگاہ تک برف سے بھر گئیں۔ نشیب و فراز میں کوئی فرق نہ رہا۔ دیودار کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر برف ایسی لگ رہی تھی جیسے درختوں نے سفید سفید تاج پہن رکھے ہوں۔ سورج نے اُن تاجوں کے کناروں پر اپنی کرنوں کی سنہری روپہلی جھالریں ٹانک دی تھیں۔ اُن شعاعوں میں حدّت نہیں، ایک نرمی اور محبّت تھی۔ آدمی اُن کی جانب دیکھ سکتا تھا لیکن برف کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جن لوگوں کے پاس کالی عینکیں تھیں، وہ انھوں نے پہن لیں۔ باقی مزدوروں نے آنکھوں پر پٹّیاں باندھ لیں۔ برف کی چمک آنکھیں اندھی کیے دے رہی تھی۔

رات کے خاموش اَسرار اور برف کے طوفان نے مزدوروں کے دلوں میں جو دہشت بٹھا دی تھی، وہ سورج کی کرنوں نے پگھلا دی۔ سورج نے زمین کو بدل کر رہنے کے قابل بنا دیا۔ اُس نے مزدوروں کے دل میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا، وہ پھر فطرت کے عناصر سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہو گئے۔

شدید برف باری کے باعث مَری اور ایبٹ آباد، دونوں طرف سے راستے بند ہو گئے تھے۔ احمد خاں نے جائزہ لیا تو اُن کے پاس صرف چند دن کی خوراک موجود تھی۔ اُس نے مزدوروں سے مشورے کے بعد خوراک احتیاط سے استعمال کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ اُس نے غذا زیادہ دیر تک چلانے کے لیے جنگلی خرگوشوں اور دوسرے جانوروں کے شکار کی تجویز پیش کی۔ یہ بھی گمان تھا کہ شاید اُن کا واسطہ جنگلی بکری سے پڑ جائے۔ جنگلی بکری خوراک کی تلاش میں عموماً دُور دُور تک نکل آتی ہے۔ اُس کا رنگ اکثر بھورا ہوتا ہے، اُس کی جسامت ہرن کی جسامت کے برابر ہوتی ہے لیکن وہ ہرن کی طرح بے وقوف اور سادہ نہیں ہوتی۔ اُسے صرف اچھا نشانے باز مار سکتا ہے ورنہ وہ آناً فاناً نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔ اُن کے پاس بارہ بور کی تین بندوقیں تھیں اور سو کارتوس تھے۔ کچھ کارتوس ایسے بھی تھے جن میں چھرّوں کے بجائے سکّے کی گولیاں تھیں تاکہ اگر خونخوار جنگلی درندوں سے سابقہ پڑ جائے تو انھیں استعمال کیا جا سکے۔

"آپ سب لوگ ایک بات یاد رکھیے،" احمد خاں نے شکار کے لیے روانہ ہونے سے قبل اُن سے کہا۔ "آپ لوگوں میں سے اکثر اس علاقے کے راستوں اور جنگلوں سے واقف ہیں لیکن میں ایک نصیحت کرتا ہوں کہ کوئی آدمی اکیلا اِدھر اُدھر نہ جائے۔ ہمارے پاس تین بندوقیں ہیں، ہمیں تین ٹولیاں بنا لینی چاہئیں تاکہ ہر ٹولی کے پاس ایک بندوق موجود

رہے۔ ہو سکتا ہے، راستے میں جنگلی درندوں سے آمنا سامنا ہو جائے۔ اس علاقے میں یہ بھی موجود ہیں۔ شیر بھی اور بھیڑیے تو خواہ مخواہ خوراک کی تلاش میں نکلے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دھوپ کئی دنوں کی بارش کے بعد نکلی ہے اور برف باری نے انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی خوراک حاصل کرنا مشکل بنا دیا ہے۔"

انھوں نے تین ٹولیاں بنا لیں اور مختلف پگڈنڈیوں سے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ برف نیچی جگہوں پر دو فٹ گہری تھی۔ چٹانوں اور پتھریلے راستوں پر کم گہری تھی۔ احمد خاں کی ٹولی پہاڑ عبور کر کے ایک ترائی میں پہنچی تو انھوں نے برف میں کسی چھوٹے سے جانور کے قدموں کے نشان دیکھے۔ نگاہ بلند کی تو خرگوشوں کا ایک جتھا برف پر بھاگ رہا تھا۔ برف ابھی تازہ اور اندر سے نرم تھی اس لیے خرگوشوں کے پاؤں اس میں کھب جاتے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے پاؤں نکال نکال کر آگے بڑھ رہے تھے۔ دو مزدوروں نے انھیں ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن جس طرح خرگوشوں کے پاؤں برف میں دھنس رہے تھے اسی طرح مزدوروں کے پاؤں بھی دھنسنے لگے۔ خرگوش ہلکے تھے اس لیے وہ صرف ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں نکال لیتے تھے لیکن مزدوروں کو پاؤں نکالنے میں کچھ وقت لگ جاتا تھا چنانچہ اُن کا درمیانی فاصلہ کم نہیں ہوا۔ سب مزدور یہ تماشا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ احمد خاں نے بلند آواز سے کہا: "زماں اور صادق پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں بندوق چلا رہا ہوں۔"

زماں اور صادق پیچھے ہٹ گئے۔ احمد خاں نے بندوق چھاتی سے لگا کر نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ احمد خاں کے پاس دونالی بندوق تھی۔ ایک نالی میں چھروں والا کارتوس تھا اور دوسری نالی میں سکے والی گولی۔ ایک دھماکا ہوا۔ چار پانچ خرگوش ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد اچانک کہیں سے بھیڑیوں کا ایک غول نمودار ہوا اور آناً فاناً خرگوشوں کی تکا بوٹی کر کے کھا گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ بھیڑیے تھے۔ خرگوش کھانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے شانے بھڑائے ہوئے کھڑے ہو گئے اور اپنی منحوس خوں خوار آنکھوں سے مزدوروں کو گھورنے لگے۔ انھوں نے غرّا غرّا کے تھوتھنے کھولے اور سفید تیز زہریلے دانت اُن کی طرف نکالے۔ بھورے اور سفید بالوں والا ایک قد آور بھیڑیا سب سے آگے کھڑا تھا۔ وہ تمام بھیڑیوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ خوراک کی کمی کی وجہ سے بھیڑیوں کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اُن کی سوکھی ہوئی چھاتیوں کے قریب پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُن کے جسموں پر چربی اور گوشت نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھوکا مرنے کے مقابلے میں انسانوں پر حملہ کر کے جان دے دینا شاید زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔

احمد خاں نے کارتوس کا کھوکا بندوق سے نکال کر اُس کی جگہ گولی والا کارتوس ڈال لیا۔ بھیڑیوں کے سردار نے دانت نکالتے ہوئے ایک گرج ماری اور اپنا قدم آگے بڑھایا۔ اُسی وقت ایک دھماکا ہوا اور بھیڑیوں کا سردار برف میں کھیت ہو گیا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور دوسرا بھیڑیا گرا۔ اس اُفتاد پر بھیڑیوں کا پورا غول مڑا اور دہشت سے بھاگنے لگا۔ احمد خاں نے تیزی سے کارتوس ڈالے۔ ایک دھماکا اور ہوا اور دوسرے ہی لمحے پانچ چھ خرگوش ترائی کے کنارے ایک پرانے سوکھے درخت کے نیچے برف میں تڑپ رہے تھے۔ بھیڑیے مسلسل دھماکوں کی آواز سن کر کبھی کے کھائی میں اتر چکے تھے۔ بھیڑیوں کے خوف یا دھماکے کے اثر سے خرگوشوں کا باقی جتھا ترائی کے کنارے رک گیا تھا۔ احمد خاں نے انھیں دیکھ لیا اور بھیڑیوں کے بھاگتے ہی اُن پر بندوق چلا دی۔ مزدوروں نے خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ کر خرگوش ذبح کیے اور تھیلوں میں رکھ لیے۔ احمد خاں نے مرے ہوئے بھیڑیوں کو پاؤں سے چھوتے ہوئے کہا: "ان بھیڑیوں کی کھالیں بھی اتار لینی چاہئیں۔ ان کی کھالوں کے دستانے بن سکتے ہیں، ٹوپیاں بھی بن سکتی ہیں لیکن افسوس، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ واپسی میں بھی یہاں موجود رہے اور ان کے ساتھی انھیں چیر پھاڑ کر کھا نہ گئے تو ہم انھیں کھینچ کر ڈیرے لے جائیں گے اور ان کی کھالیں اُتار لیں گے۔"

پھر وہ پہاڑ کے دوسری طرف اُترنے لگے تو انھوں نے نیچے جنگلوں میں ایک بڑا سا پرندہ اُڑتے ہوئے دیکھا: "سب لوگ رک جائیں۔" احمد خاں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر غور سے پرندہ دیکھتے ہوئے کہا: "یہ شاید سنہرا مرغ ہے اور برف باری کے باعث کشمیر کے پہاڑوں سے اتر کر خوراک کی تلاش میں یہاں آ گیا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اُتر کر جنگل میں پہنچا۔ اُس کے پاؤں کے نیچے برف کچر کچر بول رہی تھی۔ وہ پرندہ تلاش کرنے لگا لیکن خاصی دیر کی تلاش کے باوجود وہ اُسے دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ دیودار کے کسی اُونچے درخت کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ احمد خاں نے تنگ آ کے ایک پتھر درختوں میں مارا تو ایک کے بجائے دو پرندے اُڑے اور اوپر کی طرف جانے لگے۔ احمد خاں نے شست باندھ کر بندوق چلائی۔ دونوں پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے ایک ساتھ گرے۔ مزدوروں نے دوڑ کر انھیں ذبح کر دیا۔

احمد خاں نے خوشی سے اچھل اچھل کر پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ ایک جگہ اُس کا پاؤں چٹان سے پھسلا اور وہ لڑھکنے لگا۔ اُس نے فوراً بندوق کے سہارے اپنے آپ کو نیچے کھائی میں گرنے سے بچا لیا لیکن برف اُس کے منہ، نتھنوں، آنکھوں اور کانوں میں گھس گئی۔

سنہرے مرغ خاصے وزنی تھے۔ اُن میں تقریباً تین تین سیر گوشت ہو گا۔ اُن کے نیلے سنہرے اور سرخ پر نیز کلغی والا سر نہایت خوب صورت

تھا۔ احمد خاں نے اُن کے نرم نرم پروں پر ہاتھ پھیرے۔ اُس نے زندگی میں پہلی دفعہ سنہرا مرغ شکار کیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ ان کی کھالیں احتیاط سے اُتروائے گا اور ایبٹ آباد لے جا کر کسی کاری گر کو دے گا۔ کاری گر کھالوں میں بھُوسا وغیرہ بھر کے مسالہ لگا کر انھیں پھر سے ٹانگوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ اُسے اپنے کمرے میں کارنس پر سجاوٹ کے لیے رکھے گا۔ احمد خاں نے سوچا، اگر کیمرہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں ان کی تصویریں بھی اُتار لیتا۔

اس کے بعد انھوں نے تین خرگوش اور مارے۔ جب وہ رات کو واپس آئے تو تھکن کی وجہ سے سب چُور چُور ہو رہے تھے۔ وہ پہاڑوں پر بیس پچیس میل پیدل چلے تھے۔ برف میں چلنے سے آدمی زیادہ تھک جاتا ہے۔ کچھ وقفے بعد دوسری ٹولیاں بھی واپس آگئیں۔ انھوں نے بھی خرگوش مارے تھے لیکن سنہرے مرغ صرف احمد خاں نے مارے تھے۔ سب لوگوں نے سنہرے مرغوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھا۔ کئی مزدوروں نے یہ خوب صورت پرندہ اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

احمد خاں کی ناک اور منہ میں برف بھر جانے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی تھی لیکن وہ مزدوروں کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ سب نہایت خوش تھے۔ اُن کی زندگی میں ایسے تفریح کے دن کہاں آتے تھے۔ کمرے کے درمیان چیڑھ کی لکڑیوں کا الاؤ جل رہا تھا۔ کسی جلتی ہوئی لکڑی سے گندے بیروزے کے قطرے نکل کر دوسری لکڑی پر گرتے اور وہ تڑتڑ کی آواز نکال کر جلتے تو بڑا مزا آتا۔ گندے بیروزے جلنے سے فضا میں ایک میٹھی میٹھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سارے مزدور دائرے کی شکل میں گھیرا ڈالے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ الاؤ کے دونوں طرف لکڑی کے دو موٹے موٹے ڈنڈے ایک کھلی ہوئی قینچی کی شکل میں باندھ کر کھڑے کر دیے گئے اور اُن کے دونوں طرف بھاری بھاری پتھر رکھ دیے گئے تاکہ وہ گرنے نہ پائیں۔ کاؤ کے ایک پتلے اور لمبے ڈنڈے میں چھ سات خرگوش پرو کر، نمک مرچ لگا کر لکڑی کے ڈنڈوں پر الاؤ کے آر پار اس طرح رکھ دیے گئے کہ وہ شعلوں کی زد پر نہ آئیں بلکہ انھیں دھیمی دھیمی آنچ مسلسل پہنچتی رہے۔ ایک مزدور کھانے پکانے کا ماہر تھا۔ وہ کاؤ کا ڈنڈا وقفے وقفے سے گھمانے لگا۔ خرگوشوں کا گوشت آہستہ آہستہ سرخ ہو کر پکنے لگا اور اُس کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ ناچتے لپکتے شعلوں کی روشنی میں مزدوروں کے چہرے عجیب مسرت سے دمک رہے تھے۔

جب گوشت پک گیا تو سب کو برابر برابر حصے تقسیم کر دیے گئے۔ آگ کے شعلے کم ہو گئے تھے لیکن دہکتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اُن کی پیاری پیاری سکون بخش تپش سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے کمبل اوڑھ کر آگ کے گرد لیٹ گئے۔ خرگوش کا گوشت اتنا لذیذ نہیں ہوتا مگر آج انھیں اس گوشت میں بے حد لذت ملی تھی۔ اُن پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ تھکن رینگ رینگ کر اُن کی گرم ٹانگوں اور گرم جسموں سے نکلنے لگی۔ باہر آسمان صاف ہو گیا تھا۔ گہرا نیلا آسمان پہاڑیوں سے پہاڑیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سردیوں کی رات کا آسمان کتنا شفاف ہوتا ہے۔ دھول اور مٹی کا ایک ذرہ بھی آسمان میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف ایک پاکیزہ اور ستھرا ماحول چھایا ہوا ہوتا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے نیلے آسمان سے پالے کے قافلے اتر کر برف میں جذب ہو گئے۔ نرم ریشمیں برف اب سخت ہو گئی تھی۔ احمد خاں نے کہا کہ "اب یہ کئی دنوں تک پگھلنے کا نام نہیں لے گی۔"

صبح احمد خاں کی آنکھ کھلی تو ٹھنڈ سے اُس کی ناک اور گلا بند ہو گیا تھا۔ اُس نے گڑ کی چائے میں نمک ڈال کر دو بڑے بڑے پیالے پیے تب ذرا بات کرنے کے قابل ہو سکا۔ مزدور اور منشی کل کے شاندار شکار کی وجہ سے آج پھر پورے جوش و خروش سے شکار پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ احمد خاں نے اُن کے ساتھ جانے سے معذوری ظاہر کی۔ منشیوں نے کہا کہ وہ بھی اُس کے پاس ٹھیر جاتے ہیں لیکن احمد خاں نے اصرار کر کے انھیں مزدوروں کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ مزدوروں کا جوش و خروش دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ انھیں اس طرح کی تفریح کا موقع برسوں میں کبھی ملتا ہے۔

اُن کے جانے کے بعد وہ کمبل لپیٹ کر دھوپ میں نکل آیا اور میدان میں گرے ہوئے دیودار کے چوڑے تنے پر بیٹھ گیا۔ دھوپ اُسے بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ اُس کی حدت اور تپش میں ایک عزیز دوست کی قربت

ہارون رشید کے سامنے ایک مجرم پیش کیا گیا۔ ہارون رشید نے اُس کا جرم بیان کر کے پوچھا: "کیا تو وہی ہے جس نے یہ جرم کیا؟"

مجرم نے جواب دیا: "جی ہاں امیر المومنین! میں وہی ہوں جس نے حضور کے عفو و کرم پر بھروسا کر کے اپنی جان پر ظلم کیا۔" اس جواب پر ہارون رشید نے اُسے معاف کر دیا۔



حجاج بن یوسف کے سامنے اُس کا ایک معتوب پیش کیا گیا۔ اُس وقت حجاج کھانا کھا رہا تھا اور اُس کے ہاتھ میں لقمہ تھا۔ معتوب کو دیکھتے ہی اُس نے ہاتھ روک لیا اور غصے سے بولا: "خدا کی قسم میں جب تک تجھے قتل نہیں کر دوں گا، یہ لقمہ نہیں کھاؤں گا۔"

معتوب نے لجاجت سے کہا: "اے امیر! اس سے بہتر صورت اختیار کر لیجیے۔ یہ لقمہ مجھے کھلا دیجیے اور میرے قتل کا ارادہ ترک کر دیجیے۔ اس طرح آپ کی قسم بھی پوری ہو جائے گی اور غلام بھی ہلاکت سے بچ جائے گا۔"

حجاج کے تیور بدل گئے۔ اُس نے معتوب سے کہا: "میرے قریب آ۔" وہ قریب گیا۔ حجاج نے لقمہ اُسے کھلا کے آزاد کر دیا۔



کا احساس تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اندر گیا۔ اُس نے چائے بنائی، اُس میں نمک ڈالا، ایک بڑا پیالہ بھر کر پیا، پھر کمبل لپیٹ کر دوبارہ اُسی تنے پر آبیٹھا۔ اُس نے آنکھوں پر عینک لگائی تاکہ برف کی تباہ کن چمک سے اپنی آنکھیں بچا سکے۔ اُس کے سامنے ایک فلک بوس پہاڑ کھڑا تھا اور نیچے ایک تنگ سی وادی تھی۔ سورج کی کرنیں جہاں ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں، وہاں اُن کا رنگ سنہرا تھا اور اُن کی روشنی میں پہاڑی نالوں کا پانی ایسا لگ رہا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا ہو اور جہاں کرنیں عمودی پڑ رہی تھیں، وہاں اُن کا رنگ سفید تھا اور نالوں کا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ دل فریب نظارہ دیکھ کر احمد خاں دم بخود ہو گیا پھر اُس سے ایک جگہ نہیں بیٹھا گیا۔ وہ چھڑی گھماتا ہوا سامنے والی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھ رہی تھی۔ وہ پگڈنڈی سے ہوتا ہوا دوسری ترائی میں چلا گیا۔ جھونپڑے پہاڑ کے کونے کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں بھی دیودار کے درخت کا ایک پرانا کٹا ہوا تنا پڑا تھا۔ وہ تنے پر بیٹھ گیا۔ حدِ نگاہ تک ہر چیز برف میں لپٹی ہوئی تھی لیکن دیودار کے سبز اور سدا بہار درختوں کے پتلے پتلے سوئی دار پتوں پر برف زیادہ دیر نہ ٹھیر سکی۔ دور سامنے ننگے پہاڑوں پر برف پڑی ہوئی تھی لیکن زیادہ گہری نہیں تھی۔ سفید پہاڑ کے وہ حصے کالے دھبوں کی طرح نظر آرہے تھے جن پر برف نہیں ٹھیری تھی۔ پہاڑوں کے پیچھے ہری پور اور حویلیاں کی گرم اور سرسبز وادیاں تھیں۔ احمد خاں سوچنے لگا کہ جہاں وہ بیٹھا ہے، یہ علاقہ بندروں کا خاص مسکن ہے لیکن کسی درخت پر یا کسی جھاڑی میں اُسے ایک بندر بھی دکھائی نہیں دیا۔ بندر فطری عناصر کے شاید بہت قریب ہوتے ہیں۔ سردی کا موسم آتے ہی وہ گرم وادیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ چھانگلا گلی کی چوٹی کے پاس بادلوں کے سفید براق بجرے تیر رہے ہیں۔ چونکہ اُن کی تمام رطوبت نکل گئی تھی اس لیے وہ ہلکے ہو کر اب آسمان کی پہنائیوں میں اُڑتے پھر رہے تھے۔ احمد خاں نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا۔ بے خودی کے عالم میں اُس حسین نظارے سے محظوظ ہوتا رہا پھر پگڈنڈی سے واپس اپنے جھونپڑوں کی طرف چل پڑا۔ پالے سے سخت لوہا بنی ہوئی برف پر چڑھنے کے مقابلے میں وہاں سے اترنا ایک مشکل کام تھا۔ قدم قدم پر پھسل جانے کا خطرہ تھا۔ احمد خاں پھونک پھونک کے قدم اٹھاتا ہوا چھڑی کے سہارے اترا۔ اپنے جھونپڑوں کے پاس پہنچتے پہنچتے وہ تھکن سے چور ہو گیا تھا اس لیے ستانے کی غرض سے دھوپ میں پڑے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیٹھ جھونپڑوں کی طرف تھی اور چہرہ پہاڑ کی طرف۔ جب اس کا جسم دھوپ کی حدت سے گرم ہوا تو اُس نے اندر سے کوئی کتاب لا کر پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن ابھی اُس نے یہ ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک اُسے اپنے شانے پر تھپ تھپی محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا منشی مراد ہوگا۔ منشی مراد اس سے خاصا بے تکلف تھا لیکن یہ لوگ اتنی جلدی کیسے واپس آگئے؟ احمد خاں نے حیرت سے کہا "مراد! اتنی جلدی کیسے واپس آگئے؟"

جواب کے بجائے احمد خاں کے نتھنوں میں ایک عجیب گرم گرم لیس دار متعفن سانس کا بھبکا آیا۔ اُس نے غصّے سے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اُسی لمحے اُسے اپنی پیٹھ اور کمر پر ایک لیس دار چپ چپا اور پلپلا بالوں والا ہاتھ محسوس ہوا۔ اُس ہاتھ کے خوف ناک لمس سے احمد خاں کی رگوں میں خون جم گیا اور چہرہ یک لخت سفید پڑ گیا۔ اُس میں مڑ کر اتنا دیکھنے کی ہمت بھی نہ رہی کہ کس خونخوار درندے کا ہاتھ ہے۔ اُس نے دل مضبوط کیا لیکن معًا اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ مشینی انداز میں اُچھل کے دو گز دور جا کھڑا ہوا۔ پھر اُس نے پلٹ کے دیکھا تو اُسے ایک ریچھ نظر آیا۔ کالا بھجنگ گوشت کی ایک بھدی چٹان۔ یہ ریچھ احمد خاں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

احمد خاں نے اُس جھونپڑے کی طرف دیکھا جس میں وہ رات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوتا تھا۔ جھونپڑے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ احمد خاں اُسے اسی طرح ادھ کھلا چھوڑ گیا تھا لیکن یہ ریچھ اُس کے اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ احمد خاں کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ صرف ایک چھڑی تھی، وہ بھی دہشت کے مارے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اُس نے چور نظروں سے ریچھ کا جائزہ لیا۔ ریچھ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بہت غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تمسخر اور شرارت کی جھلک تھی۔ احمد خاں کالا کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ شاید ریچھ یہ سمجھا ہو کہ وہ بھی اُس کا ہم جنس ہے۔ ریچھ کے انداز سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو "گھبراؤ نہیں آدم زاد! میں ایک اعلا نسل کا ریچھ ہوں۔ تمھارے ساتھ اعلا درجے کا سلوک کروں گا۔"

احمد خاں نے سوچا کہ اس خطرناک ریچھ سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ دوڑ کر خوراک والی کوٹھری میں گھس جائے۔ خوراک والی کوٹھری سونے کے جھونپڑے کی نسبت نزدیک تھی لیکن اُس کا دروازہ دبا کر زنجیر کھولنی پڑتی۔ زنجیر کھولنے میں کچھ وقت صرف ہوتا اور اتنی دیر میں ریچھ اُسے پکڑ لیتا۔

شاید ریچھ نے اُس کا ارادہ بھانپ لیا۔ احمد خاں ابھی صحیح طرح کچھ طے بھی نہ کر سکا تھا کہ ریچھ نے ایک جست لگائی اور چشم زدن میں اُسے بُری طرح دبوچ لیا اور اپنے سینے سے بھینچ کر بازوؤں کا حلقہ بتدریج تنگ کرنے لگا۔ اُس کے آہنی بازوؤں میں بے پناہ طاقت تھی۔ احمد خاں کو محسوس ہوا کہ اُس کی ہڈیاں چٹخ جائیں گی اور پسلیاں چرمرا جائیں گی۔ وہ بے بسی سے کراہا پھر اُس کا دم گھٹنے لگا اور وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔ ریچھ نے دفعتًہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اُس کی کمر پر ایک زوردار دھپ مارا۔ احمد خاں برف پر اوندھے منہ گرا۔ ٹھنڈی برف اُس کے منہ نتھنوں اور آنکھوں میں گھس گئی، معًا اُس پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ ریچھ اُسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے اور اُسے آہستہ آہستہ اذیت دے کے مارنا چاہتا ہے۔

اُس نے ریچھوں کی اذیّت دہی کی بہت سی کہانیاں سنی تھیں اور آج ذاتی طور پر یہ تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ ایک لمبی اور سخت تکلیف دہ موت تھی۔ احمد خاں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چند لمحوں بعد ریچھ نے اپنے سنانوں سے زیادہ تیز ناخن اُس کے شانوں کے گوشت میں گھیسڑ دیے اور اُس کی جلد مختلف جگہوں سے چیر ڈالی۔ احمد خاں کا جسم خون رِسنے لگا۔ خون دیکھ کر ریچھ خوشی سے چیخیں مارنے لگا اور اپنے شکار کو کول تار کے ڈرم کی طرح برف پر لڑھکانے لگا۔ پھر اُس نے اُسے دوبارہ گرفت میں لے کر اپنی چٹانوں جیسی سخت سنگین چھاتی سے بھینچا۔ احمد خاں نے محسوس کیا کہ بس اب اُس کی زندگی ختم ہو گئی۔ اُس کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ ریچھ نے پھر گرفت ڈھیلی کر کے لمبی لمبی سانسیں لیں اور دوبارہ گرفت سخت کرنے اور ڈھیلی کرنے لگا۔ یہ تماشا نہ جانے کتنی دیر تک ہوتا رہا۔ احمد خاں کے لیے تو وقت کی گردش ہی رک گئی تھی۔ پھر اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے کی جلد ناخنوں سے چیری جا رہی ہے۔ اُسے بہت مختصر وقت میں اس قدر تکلیف پہنچی اور اس قدر درد ہوا کہ جب اُس کے چہرے کی جلد چیری گئی تو درد کا احساس ہی جاتا رہا۔ نیم بے ہوشی میں اُسے ریچھ کے چیخنے اور خوشی کے نعرے مارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد یہ آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ احمد خاں مکمّل طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ریچھ کے جسم کی بساند سونگھنے کی کوشش کی لیکن بساند بھی نہیں۔ وہ حیران ہوا کہ ریچھ کہاں چلا گیا؟ اُس نے لرزتے لرزتے انتہائی مشکل سے کھڑے ہو کے گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ ریچھ سامنے دس گز کے فاصلے سے برف پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مکّار آنکھوں سے احمد خاں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر خوراک کی کوٹھری کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ احمد خاں نے سوچا کہ اگر اُس نے ذرا بھی جنبش کی تو وہ دیو ہیکل ریچھ بھد بھد کرتا ہوا پھر حملہ کر دے گا۔ احمد خاں ایک کھمبے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا تو اُس کے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ مزدوروں اور منشیوں میں کوئی شخص بھی آتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ احمد خاں دل میں اُن پر لعنت بھیجنے لگا۔ نہ معلوم کم بخت کہاں مر گئے۔ احمد خاں نے ایسی شدید تنہائی اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اب اُس کے گھٹنے اور پاؤں درد کی شدّت سے احتجاج کرنے لگے۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ دوڑ لگائے تو خوراک کی کوٹھری میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر سکتا ہے لیکن وہ بدذات ریچھ عین راستے میں بیٹھا تھا۔ احمد خاں نے ابھی ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ اُس نے لپک کے پھر اُسے پکڑ لیا اور بازوؤں کے حصار میں لے کے بھینچنا شروع کر دیا۔ احمد خاں کی سانس گھٹنے لگی اور جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے کرب سے سوچا کہ اس دفعہ ضرور اُس کا دم نکل جائے گا۔ وہ بے سُدھ ہو گیا۔ ریچھ نے اُسے مُردہ سمجھ کے برف پر پھینک دیا۔ پھر نہ معلوم کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ جب احمد خاں کو دوبارہ ہوش آیا تو دھوپ میدان سے جا رہی تھی۔ ریچھ اُس کی طرف سے غافل ہو کے خوراک کی کوٹھری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ احمد خاں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اپنی پوری قوّت مجتمع کی اور زندہ رہنے کے شدید اندرونی جذبے سے ایک دم اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دیوانہ وار خوراک کی کوٹھری کی طرف بھاگنے لگا۔ کوٹھری کے نزدیک پہنچ کے اُس نے دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے اور زنجیر لگی ہوئی ہے۔ جب تک پورا زور لگا کے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا نہ جاتا، زنجیر نہیں کھل سکتی تھی۔ احمد خاں نے زور لگانا شروع کیا مگر اسی اثنا میں ریچھ اُس کے قریب پہنچ گیا۔ احمد خاں نے حواس باختہ ہو کے دروازہ چھوڑ دیا اور ایک پاگل کتّے کی طرح کوٹھری کے گرد تیزی سے چکّر کاٹنے لگا۔ ریچھ غرّاتا، دہاڑتا، بھد بھد کرتا، اُس کا تعاقب کرنے لگا۔

اچانک احمد خاں نے اپنے ایک منشی اور چند مزدوروں کو دُور سے آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے خوشی اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ ایک نہایت اونچی چیخ ماری۔ چیخ کی بازگشت پہاڑوں میں سُنائی دی۔ پھر وہ دوڑتے دوڑتے نڈھال ہو کے گر پڑا۔ اُسی وقت اُس کے کانوں میں دھماکے کی آواز پہنچی پھر کچھ ملا جلا شور بلند ہوا: ”اندر لے چلو، جلدی کرو۔“ چند لمحوں بعد دوسرا دھماکا سنائی دیا۔ پھر احمد خاں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ منشیوں نے چیڑھ کی لکڑی جلا کر گندہ بیروزا نکالا اور احمد خاں کے زخموں پر پٹّیاں باندھنے لگے۔

احمد خاں کو کئی گھنٹوں بعد رات کے وقت ہوش آیا۔ منشی مُراد اُس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ احمد خاں نے پوچھا: ”مراد! دوسرا دھماکا کیسا تھا؟“ مراد نے جواب دیا: ”پہلی گولی سے آپ کے پیچھے لگے ہوئے ریچھ کا کام تمام ہُوا تھا اور جب ہم آپ کو زخمی حالت میں اٹھا کے اندر لائے تو خوراک کی کوٹھری سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ میں بندوق سنبھال کے کوٹھری کی طرف بڑھا تو سامنے سے مجھ پر ایک ریچھنی نے حملہ کرنے کی کوشش کی، دوسری گولی نے اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ پھر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ریچھنی نے آٹے کی آدھی بوری میں چاول، گھی اور دالیں ڈال کر اُس کا منہ سبج کی پتلی شاخ سے سی دیا تھا اور بوری کھینچ کر کھڑکی کے پاس لے گئی تھی۔“

احمد خاں تکلیف کے باوجود مسکرا دیا اور کراہ کے نحیف آواز میں بولا۔ ”خوب! باہر ریچھ پہرا دے رہا تھا اور اندر ریچھنی ہمارا غذائی سامان چرا کر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید ہماری طرح اُن بیچاروں کو بھی غذا کی قلّت کا مسئلہ درپیش تھا۔“



ایک آدمی کی عبرتناک سرگزشت
آپ بیتی، جگ بیتی، بابر زماں خاں

بابر زماں خاں تبت کے ایک چھوٹے سے زمیں دار کا نازو نعم میں پلا ہوا لڑکا تھا۔ ایک صبح وہ چہل قدمی کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اُن دنوں بدھ گیا میں گوتم بدھ کی ولادت کا سالانہ جشن منایا جا رہا تھا اس لیے جب ہوڑا ایکسپریس پلیٹ فارم پر رکی تو تقریباً ہر ڈبے سے بدھ بھکشوؤں کے غول برآمد ہوئے۔ قلی اور خادم ان کی پذیرائی کے لیے لپکے لیکن بابر دور سے تماشا دیکھتا رہا۔ وہ ایک عجیب مزاج کا تھا۔ سنجیدہ، تنہائی پسند، کتابوں کا دل دادہ۔ بابر اسٹیشن کی رنگارنگ چہل پہل کا نظارہ نہیں بلکہ مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے ایک بوڑھے بدھ راہب کو دیکھا۔ راہب کے ساتھ ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی بھی تھی۔ لڑکی اتنی خوب صورت اور ایسی بھولی بھالی گڑیا جیسی تھی کہ بابر اُس کے چہرے سے نگاہ نہ ہٹا سکا، جیسے اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہو۔ اُس لڑکی میں نہ جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ بابر بے اختیار اُس کے پاس پہنچا اور سامان اٹھانے لگا۔ بوڑھے نے اُسے بے حد دعائیں دیں۔ بابر ایک تانگے میں انھیں بدھ گیا تک پہنچانے گیا۔ راستے میں جب بھی اُس کی آنکھیں لڑکی کی جھکی جھکی شرمیلی پلکوں سے ٹکرائیں اُس کے دل میں بجلی کوند گئی۔ لڑکی کا نام کورا اور بوڑھے کا نام اُجین تھا۔ دونوں تبت کے جانگ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُجین ایک شفیق اور محبت کرنے والا شخص تھا۔ اُس کے حسنِ سلوک نے بابر کو اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی اور جب بابر گھر لوٹا تو خلافِ معمول کتابوں میں اُس کا دل نہ لگا اور رات ہوئی تو نیند سے بھی سمجھوتا نہ ہو سکا۔ کورا کی معصوم صورت مسلسل اُس کے نہاں خانے میں موجود رہی۔ دوسرے روز وہ پھر بے قراری سے بدھ گیا پہنچا اور تیسرے روز بھی یہی ہوا۔ بوڑھا اُجین اُس کی آمد پر خوش ہی ہوتا تھا اور شکر گزار بھی۔ اُس نے بابر کو سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا دی۔ کورا کی آنکھوں کی سفارش پر بابر کو یہ تحفہ قبول کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ بابر اور کورا ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے یہاں تک کہ بابر شہر میں رہا یا گھر میں، کورا اب ہر وقت اُس کے سینے میں چھپی رہتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کاش یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لے۔ آخر ایک رات اُس کی یہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ آدھی رات کے وقت اچانک کورا اُس کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے دیکھ کے بابر کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر دل بجھ گیا کیونکہ کورا بہت بدحواس تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے کیچڑ اور دھول میں لت پت تھے۔ وہ اپنے پہلو میں ایک پوٹلی سمیٹے ہوئے تھی۔ اُس نے وحشت سے بتایا کہ بابا اُجین قتل کر دیے گئے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کے یہاں تک پہنچ سکی ہے۔ بابر نے فی الفور اُسے اپنی ماں اور بہنوں کی حفاظت میں دے کے گھر کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا۔ کورا کی پوٹلی میں مقتول اُجین کی قیمتی دستاویزیں محفوظ تھیں۔ وہ بابر نے اپنے والد کی تحویل میں دے دیں۔ بابر کے گھر والوں نے کورا کو چوری کے مال کی طرح چھپا کے رکھا اور مشورے کرنے لگے کہ اُسے بدھ گیا واپس بھیج دیا جائے یا پولیس کو اطلاع دے دی جائے؟ گھر والوں کی یہ مشورت بابر کو ایک سازش محسوس ہوئی چنانچہ تیسری رات اُس نے چپکے سے اُجین کی مالا سینے میں چھپائی، کورا کو اپنی بہن فہمیدہ کے کپڑے پہنا کے برقع اوڑھایا اور اُس کا ہاتھ تھام کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک کم عمر لڑکی کو لیے ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے کا اس طرح گھر سے نکلنا معمولی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ دونوں بچتے بچاتے اسٹیشن پہنچ کے ریل میں سوار ہو گئے۔ بابر کو خود معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے لیکن راستے میں ایک ہم سفر مولوی محمد شفیق نے اُس سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اُس نے کہا کہ ہم کلکتے میں اپنے ماموں کے پاس جا رہے ہیں۔ مولوی شفیق بھی کلکتے جا رہے تھے۔ کلکتے پہنچ کے انھوں نے بابر اور کورا کی کم عمری کے باعث انھیں اپنے سامنے اُن کے ماموں کے حوالے کرنا مناسب سمجھا لیکن ماموں تھے کہاں جو آتے؟ خاصے انتظار کے بعد مولوی صاحب اُن دونوں کو اپنی قیام گاہ لے گئے۔ بابر اور کورا کو سر چھپانے کی جگہ تو مل گئی تھی مگر اُس کا جھوٹ کہاں تک چھپتا؟ لہٰذا جلد ہی ایک روز مولوی صاحب کی غیر حاضری میں بابر اور کورا وہاں سے فرار ہو کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ کورا بابر کی موجودگی کے باوجود نہایت سہمی ہوئی رہتی تھی کیونکہ جانگ قبیلے کے جاسوس اُس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

کورا جانگ قبیلے کے آں جہانی سردار کی اکلوتی بیٹی اور اُس کے منصب کی حقیقی وارث تھی لیکن رواج کی رو سے یہ منصب اُسے اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ شادی نہ کر لے۔ چنانچہ اُس کا چچا قبیلے کا سردار بن بیٹھا تھا اور کورا کو ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ گویا کورا کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ اسی لیے اُس کا اتالیق اُجین موقع پا کے اُسے تبت سے نکال لایا تھا۔ بابر نے کورا کو مکمل تحفظ کی امید دلائی اور ہر طرح اُس کی دل دہی کرتا رہا۔ ہوٹل میں ایک مرد کریم گل اور ایک عورت نسترن بھی مقیم تھے۔ کریم گل نسترن کو اپنی بچی بتاتا تھا۔ اُن دونوں نے بابر اور کورا کے ساتھ نہایت شفقت اور اپنائیت کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا اور ایک روز اصرار کر کے انھیں سینما لے گئے۔ سینما میں کریم گل اور نسترن کا ایک شناسا جوڑا مل گیا۔ اُس جوڑے نے نسترن سے کورا کے متعلق اشارۃً کچھ ایسی باتیں کیں کہ بابر کھٹک گیا۔ لہٰذا ہوٹل واپس پہنچتے ہی اُس نے کوچ کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح ایک بار پھر وہ دونوں فٹ پاتھ پر آ گئے۔ اب کہاں جاتے؟ ایک ہی جگہ تھی۔ وہ ناچار دوبارہ مولوی صاحب کی پناہ میں پہنچ گئے۔ مولوی صاحب نے سیر چشمی سے انھیں پھر اپنی چھت دے دی اور ایک شام انھیں دریا کی سیر کرانے لے گئے۔ وہاں بدقسمتی سے اُن پر اچانک دو غنڈوں نے حملہ کر دیا۔ بابر کورا کی حفاظت کے لیے ایک چاقو چھپائے رکھتا تھا۔ اس غیر متوقع اُفتاد پر اُسے اپنا چاقو نکال کے غنڈوں کے خون سے رنگنا پڑا۔ غنڈے وہیں ڈھیر ہو گئے اور مولوی صاحب کو کورا کا ہاتھ تھام کے بھاگنے کا موقع مل گیا مگر بابر دفعتاً تین کانسٹیبلوں میں پھنس گیا۔ اسی وقت دور سے اُسے کورا کی چیخ سنائی دی۔ اُس نے وحشت میں ایک کانسٹیبل کے بھی چاقو گھونپ دیا۔ باقی دو کانسٹیبلوں نے پھرتی سے اُسے بے بس کر دیا اور وہ دیکھتے دیکھتے تین انسانوں کے قاتل کی حیثیت سے حوالات پہنچا دیا گیا۔ یہاں اُس نے اپنا نام امیر خاں ظاہر کیا اور پولیس افسروں نے سہولت کے لیے تو انھیں گول مول جواب دیے۔ پھر جلد ہی اُس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کے اُسے سات سال کی طویل مدت کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل پہنچ کے اُسے اپنا گھر بہت یاد آیا اور یہ سوچ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ کورا اور مولوی صاحب نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہوں گے؟ جیل کی نامانوس فضا میں بابر گھٹ کے رہ جاتا اگر بنجل نامی ایک شخص نے اُس کی معصومیت اور ناتجربہ کاری سے متاثر ہو کے اُسے خود سے قریب کر لیا اور لاڈلے کے خطاب سے نوازا۔ بنجل کلکتے میں ایک بہت بڑے اڈے کا سربراہ تھا اس لیے قیدی اور پولیس والے اُسے اُستاد کہتے تھے۔ اُس کی قربت نے بابر کو بھی جیل میں یہاں تک ممتاز کر دیا کہ جب بنجل اپنی سزا کاٹ کے چلا گیا تب بھی قیدی اور پولیس والے بابر سے عزت اور اپنائیت کا سلوک کرتے رہے۔ بابر نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک طرف جہاں دیدہ قیدیوں سے اُن کے تمام حربے اور داؤ پیچ سیکھے دوسری طرف جیل ہی سے امتحانات دیتے ہوئے ایم اے کر لیا۔ انھی ہنگاموں میں آخر بابر کی سزا کے دن پورے ہو گئے اور اُسے اُس کی مالا واپس کر کے جیل کی سات سالہ رفیق دیواروں سے باہر دھکیل دیا گیا۔

بابر اب کلکتے میں بے گھر نہیں تھا۔ بنجل کے اڈے میں اُس کے لیے بہت گنجائش تھی مگر وہ وہاں نہیں گیا بلکہ ہر موڑ میں مولوی صاحب کو اور ہر کھڑکی میں کورا کو تلاش کرتا ہوا بڑی امید سے مولوی صاحب کے مسکن پہنچا مگر وہاں پہنچ کے اُس کے دل کو سخت دھچکا لگا۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کوئی سات آٹھ برس ہوئے اچانک کہیں چلے گئے اور نہ معلوم کیا حالات تھے کہ جاتے وقت انھیں اپنا سامان تک لینے کی مہلت نہیں ملی۔ بابر کے سینے میں کرچیاں چبھنے لگیں۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ مولوی صاحب اور کورا کو تلاش کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا چنانچہ اُس نے اُن کی تلاش میں مراد آباد اور حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شہروں کی خاک چھان ڈالی مگر آدمیوں کے گنجان جنگلوں میں اُسے اپنے پھول کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ آبلہ پائی کے باوجود چلتا رہا، بھٹکتا رہا اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بار پھر اپنے وطن گیا پہنچ گیا۔ وہاں اس روح فرسا خبر نے اُس کا خیر مقدم کیا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور اُس کے باپ گھر بیچ کے متعلقین سمیت کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ بابر دل شکستہ ہو کے بدھ گیا پہنچا۔ یہاں اُس نے اُجین کی مالا دانستہ نمایاں رکھی۔ جلد ہی اُس کی توقع کے مطابق ایک بدھ بھکشو چھڑا لے کے اُس کے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ اُلٹا بابر سے کورا کا سراغ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بابر کو سخت مایوسی ہوئی۔ بھکشو سے اُسے معلوم ہوا کہ اُجین کورا کے علاوہ جانگ قبیلے کے کچھ متبرک کاغذات بھی وہاں سے نکال لایا تھا اور کاغذات کی غیر موجودگی کے باعث قبیلہ نحوستوں کا شکار ہو گیا ہے۔ بابر کو یاد آیا کہ بھکشو جن کاغذات کا ذکر کر رہا ہے وہ اُس کے والد کی تحویل میں ہیں لیکن اُس نے اُس سلسلے میں

اُمنگوں حوصلوں آنسوؤں اور آہوں کی داستان

جن کے سینے دھواں دیتے ہیں، اُن کے لیے



صاف لاعلمی ظاہر کر دی۔ بھکشو نے مایوس ہو کے مالا پر ہاتھ ڈال دیا۔ اُس کا یہ اقدام بابر سے برداشت نہیں ہوا اور وہ اچانک سات برس کا سزا یافتہ ظہیر خاں بن گیا۔ اُس نے بھکشو کا چھرا چھین کے اُسی کی چھاتی میں اُتارا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ پولیس کے خوف سے اُسے اُچھل کے چلتی ہوئی ریل میں لٹکنا پڑا۔ اس طرح وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں پہنچ گیا۔ وہ ڈبا غالباً اُسی کا منتظر تھا۔ اُس میں ایک ادھیڑ عورت اور ایک نوجوان لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عورت پر نظر پڑتے ہی بابر کی مٹھیاں بھینچ گئیں کیونکہ وہ کریم گُل کی بیوی نسترن تھی۔ ممکن تھا کہ بابر اپنی مٹھیاں کھول کے انھیں نسترن کی گردن کے لیے پھندا بنا دیتا مگر اُس کے ساتھ والی لڑکی کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کے بابر کو کورا یاد آ گئی اس لیے اُسے نسترن کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ نسترن اُسے قطعی نہیں پہچانی تھی۔ بابر نے اطمینان کی سانس لے کے اُسے اپنا نام فقیرا بتایا اور چند تیر بہدف جملے استعمال کر کے اُس کی ہمدردی حاصل کر لی۔ نسترن اُسے ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے اپنے ساتھ کلکتے لے گئی۔ بابر اُس کے ہاں ملازمت کرنے لگا مگر اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا اور نسترن کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی سے بتدریج قریب ہوتا رہا۔ لڑکی کا نام زریں تھا۔ وہ فیض آباد کے ایک متمول خاندان کی یتیم اور مظلوم لڑکی تھی۔ اُس کی جائداد پر اُس کے خالو نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ وہاں مطمئن نہیں تھی اس لیے نسترن اُسے سبز باغ دکھا کے اپنے ساتھ لے آنے میں کامیاب ہو گئی اور یہاں لا کے اُسے فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گھر میں مختلف گاہکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایک روز چاند میاں نامی ایک شخص وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کے بابر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سینما میں نسترن سے کورا کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اُس نے زریں کی بولی لگائی اور قیمت دے کے مال لے جانے کے لیے رات کا وقت مقرر کر کے چلا گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ آتا بابر نے نہایت ہوشیاری سے نسترن کو تنہائی میں بے قابو کر کے اُس سے چاند میاں کا پتہ اگلوایا اور اُسے کرسی کے ساتھ جکڑ کے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا پھر زریں کو لے کے کھلی فضا میں آ گیا۔ پورے کلکتے میں بٹھل کے اڈّے کے سوا کوئی جگہ نہیں تھی جہاں بابر زریں کو پناہ دلوا تا لہٰذا اُسے خاصی جھجک کے باوجود وہیں جانا پڑا۔ بٹھل اُسے دیکھ کے آب دیدہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے لاڈلے کو کلیجے میں جگہ دی اور زریں کو بہت عزت سے اپنی چہار دیواری میں سمیٹ لیا۔ بابر کے پہنچنے پر وہاں جشن منعقد ہوا۔ میلا لگا مگر بابر کا دل نہ لگا۔ وہ دوسرے ہی روز کسی سے کچھ کہے بغیر چاند میاں کے سر پر جا پہنچا کیونکہ اُسی سے کورا کا اتا پتہ ملنے کی کچھ اُمید تھی۔ چاند میاں کو بابر کے گھونسوں تھپیڑوں اور لاتوں نے لمحوں میں بے حال کر دیا۔ اُس نے گڑگڑاتے ہوئے ایک شخص بینی کا نام بتایا اور کہا کہ جن لوگوں نے کورا، بابر اور مولوی شفیق پر دریا کے کنارے حملہ کیا تھا ممکن ہے اُن کے متعلق بینی کچھ بتا سکے۔ بابر نے چاند میاں کی گُدی پکڑ کے اُسے اُسی وقت بینی کے پاس چلنے کا حکم دیا۔ چاند میاں اُسے بینی کے پاس لے جانے کے بہانے شہر کے ایک بہت بڑے بدمعاش موجدار کے اڈّے پر لے گیا۔ بابر کو جب یہ اندازہ ہوا کہ اُسے دھوکے سے لایا گیا ہے تو اُس نے مشتعل ہو کے وہیں چاند میاں کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ موجدار نے غضب ناک ہو کے اُس پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ وہ جثے اور قوت میں بابر سے بڑا تھا لیکن اُس کے پاس کورا کی یاد نہیں تھی، بابر جیسا جذبہ نہیں تھا اس لیے اُسے بھی بابر کے ہاتھوں ذلت کی موت سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ دو قتل بھی رائگاں گئے۔ کورا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے زریں کو اُس کے گھر پہنچا دے پھر نئے سرے سے کورا کی تلاش کا آغاز کرے۔ زریں اب اُس کے سامنے شرمانے لگی تھی۔ بابر نے بڑی مشکلوں سے اُسے فیض آباد جانے پر رضامند کیا۔ بٹھل نے زریں کو بابر کے علاوہ اپنے تین خاص آدمیوں کے ساتھ ایک بیٹی کی طرح رخصت کیا۔ یہ قافلہ لکھنؤ ہوتا ہوا فیض آباد پہنچا تو وہاں کے اُستاد جامو نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے آزمودہ کار ساتھیوں نیز ایک وکیل کی مدد سے زریں کی آبائی حویلی چند گھنٹوں کے اندر اندر اُس کے غاصب خالو سے خالی کرا لی۔ اس خوشی میں جامو اور اُس کے ساتھیوں کے اصرار پر بابر کو بازارِ حسن کی سیر کرنی پڑی۔ وہ لوگ اُسے ایک نائکہ چمپا بائی کے بالاخانے لے گئے۔ وہاں بازار کی سب سے اچھی مطربہ نیلم جان اپنی آواز کا جادو جگاتی تھی۔ بابر نے نیلم جان کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دوسری طرف نیلم جان کی نظر بابر پر پڑی تو وہ بے قرار ہو کے اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے اُس نے کھڑکی سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ بابر دیوانہ وار نیچے اُترا۔ چند لمحوں بعد سڑک پر اُس کی بہن فہمیدہ نے اُس کی آغوش میں آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ ہجوم کے ریلے اور پولیس کی لاٹھیوں نے بابر کو بے ہوش کر دیا پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ زریں کی حویلی میں تھا اور فہمیدہ کی میت تدفین کے لیے تیار تھی۔ فہمیدہ کو زمین نے پناہ دے دی لیکن بابر اپنا کالا منہ کہاں چھپاتا؟ وہ فہمی فہمی پکارتا ہوا دیواروں سے ٹکریں مارنے لگا۔ بابر کی یہ حالت دیکھ کے بٹھل کو تار دیا گیا۔ وہ فوراً کلکتے سے فیض آباد پہنچا۔ اُس نے بابر کو حوصلہ دلا کے اُسے پھر بیدار و باہوش کر دیا۔ ہوش میں آ کے بابر کو معلوم ہوا کہ چمپا بائی موقع ہی پر فرار ہو گئی تھی اور اُسے ڈھونڈنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ فیض آباد کا ایک رئیس نواب سراج علی شاید چمپا کا پتہ بتا سکے کیونکہ اُس کے چمپا سے روابط تھے اور وہ نیلم جان میں بے پناہ دلچسپی لیتا تھا۔ بابر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اُدھر زریں اپنی حویلی اور اپنی حویلی میں بابر کو دیکھ کے پھولے نہیں سماتی تھی اور ہر طرح اُس کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی یہاں تک کہ ایک روز اُس نے اپنی تمام جائداد بابر کے نام کر دی لیکن اُس کا یہ غیر معمولی ایثار بھی بابر کے پیروں میں زنجیر نہ ڈال سکا۔ ایک رات بابر بٹھل، زریں اور جائداد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں سے نکلا اور نواب سراج علی کے پاس پہنچ گیا۔ بابر اُس پر رحم کرنے نہیں آیا تھا لیکن اُس کی مخلصانہ اور پُرسوز باتوں سے اُسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نیلم جان میں ایک شریف آدمی کی طرح دلچسپی لیتا تھا اور اپنے گھر میں اُسے اُس کے شایانِ شان رتبہ دینا چاہتا تھا پھر بھی وہ بابر کو فہمیدہ کے متعلق کچھ اور نہیں بتا سکا۔ ہاں چمپا کے بارے میں اُس نے اتنا بتایا کہ اُس کی ایک بہن موتیا بائی آگرے میں رہتی ہے۔ بابر آندھی اور طوفان کی طرح سفر کرتا ہوا آگرے کی چھم چھم گلی پہنچا۔ موتیا بائی کے بالاخانے میں اُسے چمپا نظر آ گئی۔ چمپا سے فہمیدہ کا پتہ حاصل کر کے وہ اپنے بچھڑے ہوئے خاندان اور اُجڑے ہوئے گھر کا پتہ چلا سکتا تھا۔ اُس کی تیز دھار آنکھیں چمپا بائی کے چہرے میں گڑ گئیں۔ چمپا گھبرا کے دوسرے کمرے میں رینگ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی بابر بھی وہیں پہنچ گیا۔ چمپا سہم کے ایک کونے میں دبک گئی اور اُس کی بہن موتیا دو مسٹنڈوں کو لے کے وہاں آ دھمکی۔ بابر صرف بابر نہیں ظہیر خاں بھی تھا اس لیے اُن مسٹنڈوں کو بے سدھ کر کے چمپا کو ساتھ لے جانے کے لیے اُسے اپنا فن بہت زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑا۔ چمپا کے بیان کے مطابق اُس نے فہمیدہ کو پانچ ہزار روپے کے عوض میسور میں خریدا تھا لیکن بابر جب اُسے لے کے اسٹیشن پہنچا تو اُس نے لرزیدہ آواز میں بمبئی کے ٹکٹ لینے کی درخواست کی۔ بابر نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے۔ ڈبے میں اُن کے علاوہ صرف ایک مدراسی مسافر اور تھا۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا اور وہ مدراس کا ایک بڑا پولیس افسر تھا۔ راستے میں راج کرشنا نے بابر کو کریدنا چاہا مگر بابر نے بہت خوب صورتی سے اُسے ٹال دیا۔ سفر جاری رہا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری پھر چھوٹنے ہی والی تھی کہ ایک مسافر بھاگتا ہوا ڈبے میں آ گیا۔ پھر بمبئی آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا کہ نووارد مسافر نے بابر اور چمپا کو غافل سمجھ کے راج کرشنا پر پستول تان لیا اور اُسے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوتے پر مجبور کر دیا۔ راج کرشنا کا فیصلہ لمحوں میں ہو جاتا لیکن بابر نے نہایت ڈرامائی انداز میں اچانک نووارد سے تمنچہ چھین کے اُسے بمبئی تک کے لیے بے ہوش کر دیا اور راج کرشنا کی جان بچا لی۔ راج کرشنا نے اُس کے ہاتھ چوم لیے اور بتایا کہ وہ ایک خطرناک گروہ کی بیخ کنی کے لیے بمبئی جا رہا ہے۔ یہ شخص اُسی گروہ کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بمبئی پہنچ کے اُس نے بابر اور چمپا کو قیام گاہ اور سواری کی پیش کش کی لیکن بابر نے معذرت کر لی اور چمپا کے ساتھ دادر کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔ یہاں اُسے چمپا کی نشان دہی پر اُن غنڈوں کو تلاش کرنا تھی جنھوں نے فہمیدہ کو اغوا کیا تھا۔ بابر نے چمپا کے ساتھ جگہ جگہ ٹکریں ماریں مگر وہ لوگ آزاد نہیں تھے۔ آخر بابر کو جیل پہنچ کے اپنے والد کا پتہ حاصل کرنا پڑا مگر جب وہ اُس پتے پر پہنچا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک بزرگ مولوی اکرم سے اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے باپ مدت ہوئی خاموشی کے ساتھ کہیں اور منتقل ہو گئے۔ مولوی اکرم نے بابر کو بتایا کہ اُس کے والد ہر وقت چند کاغذات سامنے دھرے بیٹھے رہتے تھے اور اُن کی مدد سے کوئی خزانہ حاصل کر لینے کے جنون میں مبتلا تھے۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ وہی کاغذات ہوں گے جو کورا نے انھیں دیے تھے۔ یہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو بابر اندر سے ٹوٹ گیا اور باہر بکھر گیا۔ اُس نے چمپا کو زبردستی آگرے روانہ کیا اور عجیب بے ہنگم سی سے بمبئی کی سڑکوں کا بوجھ بن گیا۔ اسی عالم میں ایک روز وہ جوہو کے ساحل پر پڑا تھا کہ کسی نے پکار کے اُسے چونکا دیا۔ وہ راج کرشنا تھا۔ بابر نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

"جاؤ بھائی! اپنا کام کرو۔"

راج کرشنا اکڑوں بیٹھ کے بہ غور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ظہیر خاں! یہ میں ہوں راج کرشنا۔ میں تمھارا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں اپنے محسن کا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں۔" اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا اور میرے دونوں بازو زور سے پکڑ لیے۔

"یہ کون ظہیر خاں؟ کیوں تنگ کرتے ہو بھائی! جاؤ ظہیر خاں کو کہیں اور جا کے ڈھونڈو۔" میں نے نقاہت سے کہا "میرا نام ظہیر خاں نہیں ہے۔"

"او وہ نہیں، نہیں ظہیر خاں!" راج کرشنا بے تاب ہو گیا۔ "تم وہی ہو۔ یقیناً تم وہی ہو مگر تم نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے میرے دوست! میں تمھیں تمام دادر میں تلاش کرتا رہا۔ میرے مخبروں نے پتہ چلا لیا تھا کہ تم کس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہو لیکن تم ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔ میں تمھاری طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اُٹھو اُٹھو۔" اُس نے مجھے اُٹھانے کی کوشش کی۔

"میں وہ نہیں ہوں" میں نے کراہ کے کہا۔ "تمھیں دھوکا ہوا ہے صاحب! مجھے کہیں مت لے جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں"۔

"اوہ نہیں" وہ کرب سے بولا۔ "تمھارے ساتھ ضرور کسی نے کوئی بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ تم تو بہت بہادر ہو میرے دوست! بہادر بھی بھلا اس طرح زندگی سے گھبراتے ہیں؟ اٹھو، اٹھو، گھر چلو"۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا" میں نے تلخی سے کہا۔

"اور میں تمھیں ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، سمجھے"۔

"نہیں" میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے اور چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے کہیں نہیں جانا"۔

"تم بہت ناراض معلوم ہوتے ہو" وہ میری کمر تھپکنے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "آؤ ڈارلنگ! تم چاہے ناراض ہی رہنا اور کوئی بات مت کرنا مگر یہاں سے تو اٹھو۔ دیکھو، کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں، یہ سب کیا کہیں گے۔ راج کرشنا کا دوست اس حال میں ہو اور وہ اُسے چھوڑ جائے؟"

"میں تمھارا دوست نہیں ہوں" میں نے بھڑک کے کہا۔ "میں ظہیر خان نہیں ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں ہے، میرا کوئی دوست نہیں ہے"۔

"آؤ، اٹھو ورنہ" وہ نرمی سے بولا۔ "دیکھو، میں تمھیں زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں۔" اُس نے میری کمر کے گرد حلقہ تنگ کر لیا۔ اُس کے ساتھی حیرت اور تجسس سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔

"آئیے، اُٹھیے، کرشنا صاحب کی بات مان لیجیے" اُن میں سے کوئی بولا۔ کرشنا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

"گاڑی قریب لاؤ" کرشنا نے حکم دیا۔ ایک شخص فوراً سڑک کی جانب بھاگنے لگا۔ کرشنا اعلا درجے کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ میرے جسم پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے اور وہ بھی سیاہ ہو چکے تھے۔ کرشنا کسی جھجک کے بغیر اپنے بازو میرے گرد، میری کمر میں حائل کیے ہوئے تھا اور نرمی سے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ جتنا میرا انکار بڑھ رہا تھا، اتنا ہی اُس کا اصرار۔ وہ میرے برابر ریتیلی زمین پر بیٹھ گیا تھا اور کہہ رہا تھا "ٹھیک ہے، تم نہیں جاتے تو ہم بھی یہیں بیٹھیں گے"۔

"مجھے چھوڑ دو" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میری خطا معاف کر دو"۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ راج کرشنا نہیں مانا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، وہ اُس کے منتظر تھے۔ سب نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور میرے دونوں بازو پکڑ کے مجھے زمین سے اُٹھا دیا۔ میں نے اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے، بہت چیخ پکار کی مگر ناچار مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ راج کرشنا نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ میری کوئی بات نہیں سنے گا۔ اِدھر میں نے مزاحمت ترک کی، اُدھر راج کرشنا کے سوا سبھی نے میرا جسم اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ راج کرشنا تیز قدموں سے مجھے گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ کار کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔ جوہو پر بہت سے تماش بین ہماری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے پچھلی نشست پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور راستے بھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں زور سے دبائے رہا۔

گاڑی ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں داخل ہوئی۔ راج کرشنا نے تمام ملازموں کو اکٹھا کر لیا اور کسی کو چائے، کسی کو کھانا بنانے، کسی کو کپڑے لانے اور کسی کو گرم پانی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے باقی تمام ساتھی راستے ہی میں رخصت ہو گئے تھے۔ وہ شاید دوسری گاڑیوں میں ہوں گے۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ راج کرشنا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ یہاں اگر تم نے کسی قسم کا تکلف کیا تو اب میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا اور سنو، میں ایک پولیس افسر ضرور ہوں مگر اسے جیل مت سمجھنا، یہاں تم ہر طرح آزاد ہو۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم کو آواز دے لینا" وہ میری گردن سہلانے لگا۔

میرے ہونٹوں کو چپ لگ گئی تھی۔ نہ جانے راج کرشنا کیا کیا کہتا رہا پھر ایک ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ گرم پانی تیار ہے۔ راج کرشنا نے مجھے غسل خانے میں دھکا دے دیا۔ وہاں لباس پہلے ہی تیار رکھا تھا۔ میں نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑے اتارے تو میرے جسم پر صرف مالا رہ گئی۔ مالا دیکھ کے بے اختیار میری آنکھیں بہنے لگیں۔ میں غسل خانے کے فرش پر دیر تک بیٹھا مالا آنکھوں سے لگائے روتا رہا۔ پھر جب بہت دیر ہو گئی تو راج کرشنا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ہوں کہ کے اسے اپنے زندہ ہونے کی تسلی دلائی اور کئی ہفتوں کی سیاہی جسم سے کھرچنے لگا اور خوب نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن کے باہر نکلا۔ راج کرشنا بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔ "اب بتاؤ، تم کون ہو؟ دیکھا ہم نے کیسا پہچانا" اُس کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔ میں نے ندامت سے نگاہیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ ڈرائنگ روم سے پیوستہ کمرے کی میز پر کھانوں کی سرپوش ڈشیں اور پھل رکھے ہوئے تھے مگر میں کیا کرتا، بھوک ہی اُڑی ہوئی تھی۔ صبح چنے کھا کے میں جوہو کی ریت پر پڑ گیا تھا۔ کل رات بھی کھایا تھا یا نہیں، یاد نہیں تھا۔ راج کرشنا نے سرپوش ہٹائے تو گرم کھانوں کی خوشبوئیں نتھنے چیرنے لگیں۔ "کھاؤ" اُس نے میری پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور شوربا ڈال کے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "خوب کھاؤ"۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ راج کرشنا کتنا ہٹ دھرم آدمی ہے اس لیے میں نے کوئی حجت نہیں کی، چپ چاپ کھانا زہر مار کرتا رہا۔ یہ لذیذ غذائیں بہت دنوں بعد پیٹ میں گئی تھیں۔ اس لیے ایک لمحے کو تو مجھے چکر سا آ گیا، معدہ جلنے لگا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بھوکا تھا، میرے ساتھ راج کرشنا بھی کھاتا رہا اور بار بار کھانا میری پلیٹ میں ڈالتا رہا۔

چائے کے بعد راج کرشنا مجھے ڈرائنگ روم میں واپس لے آیا۔ کھانے

کے دوران میں اُس نے میرے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی تھی، صرف اپنے بارے میں بتاتا رہا تھا کہ میں نے ریل میں اُسے جس آدمی کے پنجے سے نجات دلائی تھی، وہ اُس کے لیے بمبئی میں کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ اُس شخص نے دباؤ میں آ کے اپنے تمام گروہ کا راز فاش کر دیا اور اس طرح بمبئی پولیس ایک ایسے گروہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی جو ایک عرصے سے اُس کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ راج کرشنا کو اُسی گروہ کے لیے بمبئی بلایا گیا تھا۔ وہ گروہ بیرونی مال کی ناجائز تجارت میں ملوّث تھا۔ "اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ زندگی صرف تمہارے سبب سے ہے۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "بعد میں اس کیس میں کامیابی کی بنیاد پر مجھے یہیں روک لیا گیا۔ اس شہر میں اس قدر جرائم ہوتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بمبئی کے پولیس والے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں، دماغ تو کام ہی میں نہیں لاتے۔ آج بھی جو ہوا، میں ایک کیس کے سلسلے میں گیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اوہ، میں نے تمہیں کس قدر تلاش کیا، نہ جانے تم کہاں چھپ گئے تھے اور ملے بھی تو کس حلیے میں ملے۔ وہ عورت کہاں ہے جو تمہارے ساتھ سفر میں تھی؟"

"وہ چلی گئی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میری اُکتاہٹ اُس نے نظر انداز کر دی۔ "اور اُس شخص کا کیا بنا جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے؟" اُس نے کرید کی۔

"وہ بھی نہیں..... نہیں ملا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"خیر، سفر کے دوران میں میں نے قیاساً اتنا تو جان لیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو اس عمر میں ایک نوجوان کو ہونا چاہیے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے شبہ ہے کہ جوانی نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ۔ اس طرح تمہارا جی بھی ہلکا ہو جائے گا اور اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میری طرف سے ہر خدمت حاضر ہے۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو، میں پولیس کا ایک خاصا اور بڑا افسر ہوں۔ بمبئی میں میری حیثیت ایک ایڈوائزر کی ہے لیکن میں ان لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا، اپنی اسکیموں پر خود عمل کرتا ہوں۔ جو ہو، یہ جو لوگ میرے ساتھ تھے، سب کے سب بمبئی پولیس کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ تمہارے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی ہو تو مجھے بتاؤ۔ وہ شخص کہیں بھی ہو، میں اُسے ہندوستان بھر میں تلاش کراؤں گا۔"

وہ خود ہی سب کچھ کہتا گیا پھر اُسے خیال آیا تو وہ جھینپ کے بولا۔ "میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ ہاں تو تمہارے ساتھ کیا پیش آیا میرے دوست! کچھ بتاؤ؟" اُس نے اشتیاق سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں، بس وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اُس کے چہرے پر اُلجھن عیاں ہوئی۔ "بہر حال تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کبھی کبھی آدمی اس منزل پہ پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور کسی سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا۔ اب یہ بتاؤ، تمہیں آرام کرنے کی خواہش ہے یا میں تمہیں بمبئی گھماؤں؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اب تو تم گرفتار ہو گئے۔ تم میری مرضی سے جاؤ گے اور سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے کسی معاملے میں حارج نہیں ہوں گا لیکن تم ٹھیر رہے ہو۔ میں ایک بالکل تنہا آدمی ہوں، میری ماں مدراس میں رہتی ہیں۔ اگر یہاں بمبئی میں دیر ہو گئی تو میں انھیں بلا لوں گا، وہ تمہیں دیکھ کے بہت خوش ہوں گی کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے اُن کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں اس وقت یہاں اکیلا ہوں، تمہیں کوئی ڈسٹربنس نہیں ہو گا۔ میں تمہیں بالکل نہیں چھیڑوں گا۔ پھر تمہیں یہاں رہنے میں کیا عذر ہے۔ میری مانو، جانے کا ارادہ ملتوی کرو، یہیں رہو۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

میں نے سپر ڈال دی۔ میری آمادگی دیکھ کے راج کرشنا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے سامنے شیونگ کا سامان رکھ دیا۔ وہ مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میری اور اُس کی برسوں سے شناسائی ہو۔ مجھے اُس کے اس رویے سے شرم آنے لگی۔

میں نے شیو بنا لیا تو اُس نے آئینہ میرے چہرے کے مقابل رکھ دیا۔

"اب ذرا اپنا چہرہ خوب غور سے دیکھ لو۔ پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤ کہ کیا اتنے دل کش چہرے والے نوجوان کو زندگی سے اس قدر مایوس ہو جانا چاہیے؟ صبح میرے ساتھی تمہیں دیکھیں گے تو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ کہیں گے کہ میں نے رات بھر میں کوئی جادو کر دیا ہے، وہ مجھے کوئی دیوتا سمجھیں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ "وہ حلیہ ٹھیک لگ رہا تھا یا یہ؟"

"کرشنا بابو!" میں نے اپنی آواز سنبھالنے کی کوشش کی۔ "یہ تو باہر کا حلیہ ہے، اندر کا حلیہ نہیں سنبھلتا۔" میری آواز حلق میں جھرجھرا کے رہ گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اندر نہ تو شیو ہوتا ہے، نہ غسل، نہ لباس تبدیل کیا جاتا ہے، نہ اس پہ صابن لگتا ہے، نہ پاؤڈر۔

"وہ بھی ضرور سنبھلے گا۔" کرشنا پُراُمید لہجے میں بولا۔ "وہ بھی سنبھلے گا لیکن دونوں حلیے ایک ساتھ خراب ہو جائیں تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہے۔ بلکہ بُری بات ہے۔"

رات کو سونے کے لیے راج کرشنا نے اپنا شب خوابی کا لباس دیا۔ اُس کمرے میں ریڈیو بھی تھا اور گراموفون ریکارڈ بھی، کتابیں بھی تھیں اور رسائل بھی تھے۔ میں نے کوئی چیز نہیں چھوئی۔ پھر راج کرشنا اپنے کمرے میں چلا گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چمپا کے جانے کے بعد اب جا کے کہیں نرم بستر نصیب ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے سوچنا ہی بند کر دیا تھا،

راج کرشنا نے مقوی غذائیں کھلا کے اور نرم بستر دے کے مجھے پھر سوچنے کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ چیزیں مجھے راس نہیں آتیں، صبح اُٹھ کے راج کرشنا پھر میرے جسم میں تنکے چبھوئے گا۔ کوئی آدمی کسی آدمی کو اُس طرح قبول نہیں کرتا جیسا وہ نظر آتا ہے۔ اُس کی نسل، اُس کا شجرہ، اُس کا نام، عہدہ اور پتہ جاننے کی خواہ مخواہ فکر لگی رہتی ہے۔ گویا آدمی کچھ نہیں ہوتا، اُس کا نام اور پتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے چھپانا چاہے کہ اُس کے لیے یہ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے تو لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟

مگر صبح اُٹھ کے راج کرشنا نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کے بازار لے گیا۔ بازار سے اُس نے میرے ناپ کے جتنے تیار کپڑے مل سکے، خرید لیے۔ باقی تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر اُس نے میرے لیے دو جوڑی جوتے، چپل اور دوسرا سامان خریدا۔ "آپ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔" اُس نے میرے لیے تیل کی بوتل اور شیونگ کا سامان خریدا تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک بالکل نئے آدمی کے لیے ہے جس کی صرف شکل و صورت اور قد وغیرہ تم سے ملتا جلتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا، "تم نے سُنا ہو گا کہ ہندوؤں میں آدمی مر کے دوسرا جنم لے لیتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج سے تم نے بھی دوسرا جنم لیا ہے اور پچھلی کوئی بات تمہیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"کرشنا بابو! آپ..." مگر اُس نے مجھے کچھ نہیں کہنے دیا۔ گھر پہنچ کے اُس نے مجھے اپنے سامنے نیا لباس پہنوایا اور دُور کھڑا کر کے دیر تک مختلف زاویوں سے مجھے ناپتا تولتا رہا۔

"بالکل بمبئی کا بابو۔ اب تم دیکھنا اندر کا ملیہ خود بخود تمہیں بدلا بدلا نظر آئے گا۔ وہ لوگ بس اب آتے ہی ہوں گے۔ آج یہاں ایک بہت خاص میٹنگ ہونا ہے۔ میں تمہیں اُن سے اپنے دوست کے بیٹے یا بھائی کی حیثیت سے ملواؤں گا۔ ویسے تم قطعاً آزاد ہو۔ اگر کہیں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمہارا انتظار کروں گا۔ مکان کا نمبر، فون کا نمبر اور پتہ نوٹ کر لو۔ یہ باندرہ ہے۔ اگر راستہ نہ ملے تو کسی بھی قریبی پولیس اسٹیشن سے راستہ پوچھ لینا۔"

میں کہاں جاتا؟ تمام راستے ایک جیسے تھے، تمام شہر ایک جیسے تھے۔ راج کرشنا سمجھ رہا تھا کہ اب میری طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی ہے لیکن طبیعت تو پھر خراب ہونی شروع ہو گئی تھی۔ کل شام تک مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی اور اب پھر جی اُڑنے لگا۔ وہی آہٹوں پر چونک پڑنا، وہی اپنے آپ کو طمانچے لگانے کی خواہش۔ جسم پر کپڑے بھاری لگتے تھے اور انگلیوں میں انہیں کھرچنے کے لیے کھولن ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں راج کرشنا کے ساتھی آ گئے۔ پولیس کی وردیوں میں ملبوس، چھوٹے بڑے قد کے افسران۔ ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جنھوں نے کل رات مجھے جوہو سے اٹھایا تھا۔ اُن کی آنکھوں کو مجھے پہچاننے میں دیر لگی۔ پھر وہ حیرت سے کبھی راج کرشنا کو، کبھی مجھے دیکھنے لگے۔ راج کرشنا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اُس نے مجھے اُن سے اپنے ایک مرحوم دوست کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ملوایا۔ سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ

سے مصافحہ کیا۔ کسی نے انگریزی میں اور کسی نے اردو میں میری خیریت پوچھی میں سفر میں راج کرشنا سے انگریزی میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کر چکا تھا پھر جب وہ لوگ ایک دوسرے کمرے میں بند ہو کے بیٹھ گئے اور راج کرشنا مجھ سے صرف ایک گھنٹے کی معذرت کر کے اندر چلا گیا تو میں کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کے بنگلے سے باہر آ گیا۔ نئے جوتوں نے پیر کاٹنے شروع کر دیے۔ میں گلیوں گلیوں، سڑکوں سڑکوں گزرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

چھوٹے چھوٹے بچے نیلی نیکریں اور سفید قمیصیں پہنے بستے بغلوں میں دبائے ہوئے اسکول جا رہے تھے میرے اندر نہ جانے کیا خاص بات تھی کہ کئی راہ گیروں نے مڑ مڑ کے اور گھور گھور کے مجھے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ شاید میں انھیں کوئی نیا یا عجیب آدمی معلوم ہو رہا تھا یا یہ میری آنکھوں کی غلط بینی تھی مگر آگے جا کے کالج کی لڑکیوں کے ایک گروپ میں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے میری طرف متوجہ کیا پھر کھل کھلا کے ہنس پڑیں مجھے اُن پر سخت غصہ آیا۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا، وہ سہم گئیں۔ لوگ ہر جگہ یہی چاہتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہوں میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور گردن جھکائے ہوئے راج کرشنا کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔

درمیان میں میرے جی میں آئی کہ یہیں سے بھاگ نکلوں کیونکہ میں اس لائق ہی نہیں ہوں کہ انسانوں کے درمیان رہوں میری وجہ سے راج کرشنا کو فضول تکلیف ہو گی۔ ان پڑھے لکھے لوگوں میں میری باتیں بدتمیزی سمجھی جائیں گی اور آدمی اپنی سکت سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ میری تو بات کرنے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا۔ اچھا ہے کہ راج کرشنا کے آنے اور گھر سے دھکے دے کے نکالنے سے پہلے میں خود ہی اُس کا گھر اپنی خاک اور دھول کی بوری سے پاک کر دوں۔ ابھی موقع ہے راج کرشنا کا گھر دور ہے اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ راج کرشنا مجھے تلاش کر کر کے خود ہی تھک جائے گا اور پھر میں اسی شہر میں کیوں رہوں میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی ہے میں بمبئی ہی چھوڑ دوں گا۔ میں نے راستہ بدل دیا لیکن کچھ دور پہنچ کے مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ میرے جسم پر راج کرشنا کے خریدے ہوئے کپڑے تھے۔ وہ صبح کس ذوق و شوق سے میرا لباس خریدنے کے لیے بازار گیا تھا۔ میں چلا جاؤں گا تو وہ بہت پریشان ہو گا اور اگر اُس نے کہیں مجھے پھر ڈھونڈ نکالا تو میں اُس کے سامنے آنکھ بھی نہیں اُٹھا سکوں گا۔ میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہوا واپسی کے راستے پر چل پڑا اور آخر وہی ہوا، راج کرشنا میری تلاش میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ مجھے راستے میں ملا۔ "مجھے ڈر ہوا کہ تم کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول گئے ہو۔" اُس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آؤ لنچ پر تمھارا انتظار ہو رہا ہے میٹنگ لمبی ہو گئی تھی اس لیے میں نے اُن سب کو روک لیا ہے۔ تم گھبراؤ گے تو نہیں؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم ہجوم کے درمیان حبس تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "سڑکوں پر بھی ہجوم ہی ہے۔"

"آدمی کو ہجوم میں رہنے کا عادی بننا چاہیے۔ انسان، انسان سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

گھر قریب ہی تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ مجھے چھری اور کانٹے سے کھانے کی تمیز نہیں تھی پہلے میں نے اُن لوگوں کو دیکھا اور صرف روٹیاں کھانے پر اکتفا کی۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں تھی البتہ راج کرشنا کی عزت کا خیال ضرور تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں، اتنے بڑے افسر کا مہمان اس بدسلیقگی سے کھانا کھا رہا ہے مگر راج کرشنا کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی، فکر ہوتی تو وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے مجھے پہچانتا ہی نہیں اور اُس ہیئت کذائی میں مجھے اپنے گھر لاتا ہی نہیں چنانچہ میں نے آزادی سے کھانا شروع کر دیا۔ شاید راج کرشنا نے میری عدم موجودگی میں اُن سب کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی پرانی بات پوچھنے کی غلطی نہ کریں اس لیے اُن سب کا برتاؤ بہت لحاظ و مروت کا تھا پھر بھی مجھے اپنی جانب اُٹھتی ہوئی اُن کی دلچسپ اور سراغ رس نظریں زہر لگ رہی تھیں۔ راج کرشنا غالباً یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ مجھے ان آنکھوں سے بھی نہ دیکھیں۔

سہ پہر کو راج کرشنا اپنے کسی کام کے سلسلے میں گھر سے چلا گیا تو بنگلے کے ملازم میرے اطراف اس طرح منڈلانے لگے جیسے میں ہی اُن کا مالک ہوں۔ وہ میری زبان سے کوئی حکم سننے کے منتظر تھے۔ نوعمر بھکھو مجھ پر بطور خاص مہربان تھا اور راج کرشنا کی تعریف میں منہ سکھا رہا تھا کہ ایسا صاحب اُسے پہلے کبھی نہیں ملا، وہ پہلے ملازموں کو کھلاتا ہے پھر خود کھاتا ہے بھگوان کرے وہ مستقل طور پر بمبئی ہی میں رہے۔ بھکھو ذرا کھلا تو مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگا۔ "صاب! ایک بات بتاؤ۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس نے اِدھر اُدھر تاک کے پوچھا۔ "یہ اپنے صاب نے شادی کیوں نہیں بنائی؟"

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ وہ ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنے لہجے کی سختی کا فوراً احساس ہوا میں نے نرمی سے کہا۔ "یہ بات صاحب ہی سے پوچھنا۔"

اُس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی اور وہ پوچھنے لگا۔ "اور صاب آپ نے ....؟ آپ کی شادی ہو گئی؟ بیگم صاب کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

بیگم صاحب! شادی! مجھے ہنسی آ گئی، وہ یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔

میری ہنسی پر وہ بڑا حیران ہوا۔ "جا اپنا کام کر۔" میری تلخ آواز سے وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بند کمرے میں کورا نہ جانے کس طرف سے آ گئی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں نے اپنا چہرہ بستر میں چھپا لیا پھر بہت دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پتہ نہیں

تاج فلمز پروڈکشن کی اوّلین رنگین پیش کش

آئندہ ماہ نمائش کے لئے پیش کر دئے جائے گے!

محمد علی ، شبنم ، ندیم

پہلی بار ایک ساتھ

ہدایت کار

ظفر شباب

دامن کی آگ

رنگین

★

محمد علی شبنم ندیم صاعقہ

نجمہ محبوب زینت

خالد سلیم موٹا اور

علاؤالدین

فلمساز

بشیر بٹ

ظفر اقبال

پیش کار

ذوالفقار علی

فوٹوگرافر

امتیاز قریشی

تدوین

جاوید طاہر

موسیقی

ایم اے شاد

مصنف

ریاض الرحمن ساغر

MIRZA STUDIOS





عالمی حقوق اور حقوق نمائش برائے مز نشیرز

این آئی فلمز

۸- رائل پارک کتاریہ بلڈنگ لاہور

فون: ۳۱۲۶۷۲

حقوق برائے کراچی سندھ بلوچستان

الشان پکچرز، ماروی بلڈنگ، ایم اے جناح روڈ **کراچی**

فون نمبر: ۲۲۱۷۸۲

EFEM-76

کس وقت دبلے قدموں سے راج کرشنا اندر آیا۔ وہ میری کمر پہ آہستہ آہستہ ٹھونگیں مار رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کے سر اُٹھایا تو اُس نے اپنا رومال آگے کر دیا۔ میں اسی لیے یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ کلکتے میں میں نے تجمل کو تنگ کیا تھا، فیض آباد میں زرّین جامو اور للّن خاں کو اور یہاں کرشنا میرا نشانہ بن رہا تھا۔ آخر کرشنا کے اُٹھانے سے پہلے میں خود ہی اُس کے ساتھ باہر آ گیا۔ کرشنا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن اُس کے اَن کہے سوال میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے، میرے دماغ میں چبھ رہے تھے۔ کرشنا نے جب یہ کہا کہ وہ مجھے سیر کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو میں نے انکار نہیں کیا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے بمبئی کی سڑکوں پر گھماتا رہا۔ اُن میں سے بہت سی سڑکیں بہت سے فٹ پاتھ میرے جانے پہچانے تھے۔ کرشنا ایک طویل سفر کر کے دادر کے علاقے میں آ گیا۔ اُسی ریستوراں کے قریب جس کی پچھلی گلی میں ابّا جان رہتے تھے اور جہاں اب صرف اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند پڑا تھا۔ میں نے سوچا، راج کرشنا سے چند لمحوں کی اجازت لے کے مولوی اکرم کے پاس جاؤں اور اُن سے کوٹھری کی چابی لے کے ابّا جان کا سامان ٹٹولوں، شاید کسی کی تصویر مل جائے۔ تصویر نہ بھی ملی تو وہ چیزیں تو ہوں گی جنھیں گھر کے لوگوں نے بار بار استعمال کیا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی کام کی چیز مل جائے۔ پرانی کاپیاں کتابیں تو ہوں گی جن پر وہ سب لکھتے ہوں گے مگر انھوں نے اس افراتفری میں بھلا کیا پڑھا لکھا ہوگا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ابّا جان پر بھی کورا کا اثر پڑا۔ نہ وہ اپنے سامان میں یہ کاغذات لاتی، نہ ابّا جان یوں در بدر مارے مارے پھرتے۔

کرشنا مجھے ایک بہت اچھے ریستوراں میں لے گیا۔ وہاں دھیمی دھیمی روشنی میں ہلکی انگریزی موسیقی تیر رہی تھی۔ سب مال دار لوگ، سوٹڈ بوٹڈ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مردوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ایک طرف غیر ملکی موجود تھے۔ ریستوراں میں خاصی بھیڑ تھی، ہمارے داخل ہوتے ہی ایک باادب بیرے نے ہمیں ایک میز پہ بٹھا دیا۔ یہاں بہت سکون تھا۔ کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ راج کرشنا نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔ "جی لگ رہا ہو تو بیٹھیں ورنہ کہیں اور چلیں؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، یہ جگہ بہت پُرسکون ہے۔"

"کیا کھاؤ گے؟" اُس نے مسکرا کے پوچھا۔

"کچھ کھانا کیا ضروری ہے؟" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔ یہ ماحول میرے لیے بالکل نیا تھا، مجھے یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں تھے۔ ممکن ہے یہاں آنے کے بعد کھانا ضروری ہوتا ہو۔

"نہیں، ہم یہاں کچھ پی بھی سکتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہو تو کچھ منگوائیں؟" وہ غیر رسمی انداز میں بولا۔ میں اُس کے خیال سے خاموش ہی رہا۔ کرشنا نے انگلی کے اشارے سے منتظر بیرے کو قریب بُلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری میز بھری ہوئی تھی لیکن میری نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ ہر جگہ یہی ہوتا تھا، ہر جگہ مجھے یہ گمان ہوتا جیسے وہاں مجھے مولوی صاحب یا کورا یا ابّا جان یا گھر کا کوئی اور آدمی نظر آ جائے گا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" کرشنا نے اپنے لبوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ہکلا کے جواب دیا۔ "لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ اس شہر کا بہت مشہور ریسٹورینٹ ہے۔ یہاں تمام بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ اصل میں اس کی حیثیت ایک کلب جیسی ہے۔ دولت حُسن میں اور اضافہ کر دیتی ہے، یوں کہنا چاہیے کہ دولت حُسن کا سنگھار ہے، میک اپ کا سامان ہے۔ دولت کے بغیر حُسن آدھا رہ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا، ہر عورت کے بدن پہ قیمتی ساڑی ہے اور زیور بھی کچھ کم قیمت کا نہیں ہے۔"

زیور کے ذکر پہ مجھے فوراً اپنی مالا کا خیال آیا اور میرا ہاتھ خود بخود گریبان پہ چلا گیا۔ مالا میری گردن میں موجود تھی، میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ راج کرشنا کی باریک بیں آنکھوں سے میرا یہ لمحاتی اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ میں کسی چور کی طرح اُس سے نظریں چرانے لگا۔ "ان لوگوں کی دنیا مختلف ہے۔" کرشنا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ دکھ دُور کرنے کے انھوں نے بہت سے علاج دریافت کر لیے ہیں۔ سب سے بڑا علاج خود دولت ہے چنانچہ یہ دن بھر دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور شام ہوتی ہے تو اُسی دولت سے دکھوں کی دوا خرید لیتے ہیں۔ یہ ریستوراں بھی ایک شفا خانہ ہے۔ یہ میزیں اسپتال کے بیڈ سمجھو، یہ بیرے ڈاکٹر اور یہ غذائیں، دوائیں ہیں۔ موسیقی غذا ہے۔ اچھا لباس پہننا، گانا، ناچنا، سیر سپاٹا، یہ سب دُکھ کی دوائیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو پہلے دولت کا دامن پکڑنا چاہیے لیکن یہاں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں صرف دولت کمانا آتا ہے، اُسے خرچ کرنا نہیں آتا۔ جس طرح بیمار کو اچھے ڈاکٹر کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح دولت کو اچھے مشاغل کی ورنہ دولت بہت بڑا دکھ بن جاتی ہے، ناسور۔ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہو؟" اُس نے ٹک کے میری آنکھوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "آپ بہت اچھی باتیں کر رہے ہیں۔"

"اگر تم نے سننے کا یہی اشتیاق ظاہر کیا تو میں آیندہ اور اچھی باتیں کروں گا۔" وہ ہنس کے بولا۔ "اچھی باتیں ایک اسکول، ایک کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔"

"جی ہاں....." میں نے مستعدی سے کہا لیکن ابھی میں نے اپنا جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ گندمی رنگت کا ایک موٹا تازہ شخص اسی رنگ کی ایک دُبلی پتلی چشمے والی عورت اور اوسط بدن کی ایک نوجوان سرخ و سفید لڑکی کے ساتھ ہماری میز پر آیا۔ کرشنا نے اپنی نشست سے اُٹھ کے اُس سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ "رستم جی بمبئی کے ایک معزز شخص

"مسز رستم اور اِن کی بیٹی نورین رستم"۔ کرشنا نے مجھ سے اُن کا تعارف کرایا اور مجھے اُن سے متعارف کرایا۔

رستم جی نے ملائم لہجے میں کرشنا سے پہلے مجھ سے میری خیر خبر پوچھنے میں وقت صرف کیا۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے جھجک ہوئی۔ کرشنا نے درمیان میں دخل دے کے تمام باتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور میری طرف سے بتانے لگا کہ میں ایک زمیں دار کا بیٹا ہوں میرا مرحوم بڑا بھائی اُس کا ہم جماعت تھا۔ اُس نے میرے سلسلے میں اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے موضوع ہی بدل دیا اور وہ سب کسی کلب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ روز ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اور آج منگل کی وجہ سے کلب بند ہے اس لیے اس ریستوراں میں آ گئے ہیں راج کرشنا سچ کہتا تھا' وہ دُنیا کے کسی دُکھ میں گرفتار نہیں تھے۔ بات بات پر ہنسنے لگتے تھے جیسے ہنسی کے لیے تیار ہی بیٹھے ہوں۔ رستم جی کی بیوی مجھے چُپ دیکھ کے حیران ہوئیں اور مہذب لہجے میں پوچھنے لگیں۔ "آپ کچھ بول نہیں رہے ؟"

"جی"۔ میں نے ہچکچاہٹ سے کہا "میں کیا بولوں"۔

"بمبئی میں نئے نئے ہیں"۔ راج کرشنا نے پھرتی سے کہا "ویسے یہ مت سمجھیے کہ انھیں بولنا نہیں آتا جب باتوں پر آئیں گے تو سب کو ہرا دیں گے"۔

"آپ انھیں ہمارے ہاں لائیے"۔ نورین رستم نے کہا اُس کی آواز زریں کی آواز کی طرح بہت بھلی تھی۔ "میرا خیال ہے آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے"۔ اُس نے اپنے باپ کی طرف تائیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ رستم جی اور اُن کی بیوی نے بھی اصرار کیا مگر کرشنا نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے معذرت کر لی۔

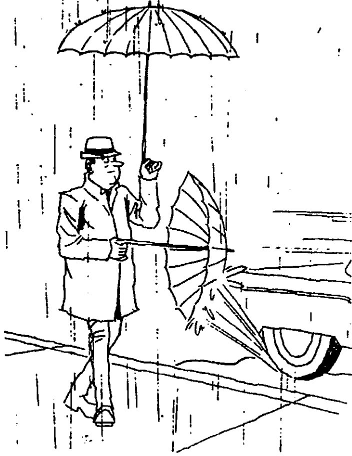
"آپ ٹال رہے ہیں کرشنا جی"۔ نورین نے شوخی سے کہا۔

"کرشنا جی بہت مصروف آدمی ہیں نورین! تمھیں دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اِن کی آمد سے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے کرشنا جی کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے ہم اِن کا وقت ضائع نہیں کریں گے' انھیں ملنے ملانے سے کہیں زیادہ ضروری کام ہیں"۔

"مگر کرشنا جی تو روز کلب آتے ہیں پاپا! کیوں نہ ہم کل کلب ہی میں اپنی طرف سے کرشنا جی کی دعوت کریں ؟" نورین مچل کے بولی۔

"کرشنا جی! یہ ابھی تک بچی ہے اسے کچھ نہیں معلوم"۔ رستم جی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اِس کی باتیں محسوس مت کیجیے اور سنو نورین!" وہ تنبیہی نگاہ سے نورین سے مخاطب ہوا "تمھیں روز اخبار پڑھنا چاہیے تاکہ تم جان سکو کرشنا جی اس شہر کے لیے کتنی بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں"۔

"اوہ نہیں"۔ راج کرشنا نے لجاجت سے کہا "میں اپنا فرض انجام



دے رہا ہوں اور رستم جی! مجھے صاف باتیں بہت پسند ہیں۔ نورین کی دعوت مجھے قبول ہے لیکن وقت کا میں ابھی تعین نہیں کر سکتا۔ نورین! میں ضرور تمھارے گھر آؤں گا"۔

"اور اکیلے نہیں' انھیں بھی ساتھ لائیے گا" نورین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کیوں جناب! آپ آئیں گے ؟ آئیں گے نا؟" وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں"۔ میں نے اُداسی سے کہا "ضرور آؤں گا"۔ اُس نے اپنی دونوں کہنیاں میز پہ ٹکا دیں اور مجھ سے اس قدر قریب ہو گئی کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی "میں نے کبھی کھیت نہیں دیکھے۔ میں آپ سے کھیتوں اور کھلیانوں کے قصے سنوں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بہت دنوں تک کسی گاؤں میں رہوں' شہر کا رُخ نہ کروں"۔ وہ خواب آفریں لہجے میں بولی "آپ زمیں دار ہیں نا؟"

"جی"۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُسے کیا جواب دوں۔

اُس کے بال سنہرے' دانت سفید چھوٹے چھوٹے اور نقش و نگار تیکھے تھے۔ باتوں میں شوخی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کا سُرخ گوشت بھی ذرا سا نظر آ جاتا تھا لیکن مجھے اُس کی بے تکان باتوں اور اس قدر قربت سے الجھن ہونے لگی۔ رستم جی سے گفتگو کے دوران میں راج کرشنا بار بار میری طرف دیکھ لیتا تھا پھر اچانک اُس نے گھڑی دیکھی۔ اُسی لمحے رستم جی میز سے اُٹھنے لگے۔ کرشنا نے انھیں مزید روکنا چاہا مگر رستم جی نہیں رُکے۔ وہ تینوں دُور کی ایک میز پہ جا کے بیٹھ گئے۔ نورین چلتے چلتے مجھے اور کرشنا کو ہمارا وعدہ یاد دلانا نہیں بھولی۔

ریستوراں سے باہر آ کے کرشنا نے کسی بچے کی طرح میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میں بھیڑ میں کہیں کھو جاؤں گا۔ بمبئی شہر روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا، موٹریں، وکٹوریا، ہر طرف شور، ہنگامہ، دوڑ۔ ہماری گاڑی پھر سڑکوں پر چکر کاٹنے لگی۔ مجھے یہ شہر نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ رات کے وقت کرشنا مجھے ساحل پر لے گیا۔ وہاں کی سیر سے ہم رات گئے گھر واپس پہنچے تو کرشنا کے چہرے سے تھکن صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس نے دو ایک فون کر کے بمبئی کے پولیس افسروں سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے کی جانے والی باتیں تو میں سن نہیں سکا لیکن کرشنا کی ناراضی سے اندازہ ہوا کہ آج اُس کے ماتحتوں نے اُسے کوئی تسلی بخش رُوداد نہیں سُنائی ہے۔ اُس کے ماتھے پر بتدریج شکنیں پڑتی گئیں اور وہ فون ہی پر چیخنے چلانے لگا۔ "ایڈیٹ، یو آر آل فول"۔ اُس کے لہجے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی اور وہ اپنے مخاطب کو بہت تیز انگریزی میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ فون پٹخ کے وہ تقریباً ہانپنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میری موجودی اُس کے غصّے کے بہاؤ میں رکاوٹ بن سکتی تھی اور مجھے یہ خوف بھی محسوس ہوا کہ اب یہ مجھ پر غصّے ہوگا۔ ممکن ہے یہ مجھے اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دے دے لیکن میں نے جیسے ہی اُٹھ کے کمرے سے جانا چاہا، اُس کی بدلی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میرے جھجکتے ہوئے قدم رُک گئے۔ "کہاں چلے؟" میں نے اندر کمرے کی جانب نگاہ کی۔ وہ تاسّف سے بولا "معاف کرنا، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ یہاں تم بھی بیٹھے ہو۔ بات یہ ہے ڈارلنگ کہ اس شہر میں سب گدھے رہتے ہیں۔ پولیس کا آدھا کام ان نااہلوں کی وجہ سے اُلٹا ہو جاتا ہے۔ پولیس میں ایک دم پرفیکٹ آدمی بھرتی کرنے چاہئیں۔ بہرحال چھوڑو۔ یہ بتاؤ کچھ حال وغیرہ ٹھیک ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" وہ غنودہ لہجے میں بولا۔ "میں تمھیں صاف صاف بتاؤں۔ ریل میں تم مجھے بہت پسند آئے تھے حالانکہ تمھارے بارے میں میری پہلی نظر کی رائے یکسر مختلف تھی۔ بعد میں وہ رائے بدلتی گئی اور اسٹیشن پر تم سے جدا ہونے کے بعد مجھے یہ ملال رہا کہ میں نے تمھیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت پریشان تھے۔ مجھے ایسی حالت میں تمھیں روکنا چاہیے تھا۔ تم شہر میں تمھاری کوئی عزیزہ نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمھارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ تمھارا لہجہ برہم تھا اور بمبئی میں قدم قدم پر ٹیڑھے ترچھے آدمی بستے ہیں۔ تم اگر کچھ بتانا نہیں چاہتے تو میں تم سے کچھ پوچھنے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن ایک درخواست ہے کہ تم یہاں سے کہے بغیر کہیں نہ جانا ورنہ اگر گئے تو سمجھ لو مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔ دوسری درخواست ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی اجنبیت نہیں برتو گے۔ سمجھے۔ میں اس بات کی تکرار اس لیے کر رہا ہوں کہ یہاں تمھیں کوئی گھٹن محسوس نہ ہو۔ اگر تم مجھ سے کسی فرمائش کا اظہار کرو گے اور مجھے اپنے دُکھ درد میں شریک کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ تم جب تک خود نہیں کہو گے، میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔"

"کرشنا جی! میری آنکھوں سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو آپ مجھ سے عاجز آ جائیں گے۔ آپ نے آج دیکھ ہی لیا کہ میں نے ریستوراں میں آپ کے ملاقاتیوں کے سامنے چپ رہ کے آپ کو کتنا شرمندہ کیا ہے۔ میرے کانوں اور منہ میں جان ہی نہیں ہے۔ میں نہ کچھ سننا چاہتا ہوں، نہ بولنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھیں سُننے اور بولنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ خاموشی کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہے لیکن دوست! تم نے اس دُنیا کا مشاہدہ اپنے حواس سے کیا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے ستائے ہوئے لوگ دیکھے ہیں جو ڈھے جاتے ہیں مگر پھر ہمت کرتے ہیں۔ میں تم پر ترس نہیں کھا رہا ہوں، یہ مت سمجھنا کہ میں تمھیں بھیک دے رہا ہوں۔ میری تو یہ زندگی ہی تمھارے سبب سے قائم رہی ہے سو میرے پاس جو کچھ بھی ہے، اُس پر تمھارا حق ہے۔ اس گھر کی ہر چیز تمھاری ہے۔"

"وہ محض ایک اتفاق تھا کرشنا جی! اس ذکر سے مجھے خفّت ہوتی ہے۔ میں نے خاص آپ کے لیے بھلا کیا کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں یہی کرتا۔"

"مگر اُس جگہ کوئی اور نہیں تھا، میں تھا۔ تم مجبور نہیں تھے۔ تم اُس دہشت خیز وقت میں آنکھیں میچے ہوئے لیٹے بھی رہ سکتے تھے لیکن تم نے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا، اُف وہ بہت تکلیف دہ منظر ہے لیکن اس واقعے سے پہلے ہی میری خواہش تھی کہ میں تمھاری کوئی مدد کروں۔ تمھارا یہاں آنا، یہاں رہنا اُس احسان کا معاوضہ نہیں ہے۔ اُس عظیم احسان کا معاوضہ تو میں ساری عمر ادا نہیں کر سکتا۔ یہ کچھ اور بات ہے۔ ہاں کہو کہ تم نے میری باتیں توجّہ سے سن لی ہیں اور تم مجھے مایوس نہیں کرو گے؟"

"کرشنا جی! میں آپ کو کیا بتاؤں۔" میں نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور اضطراب سے کہا۔ "منہ نہیں کھلتا، موت بھی نہیں آتی، مجھ سے اتنی ہمدردی مت کیجیے۔ میں بہت احسان فراموش، بہت بے غیرت آدمی ہوں۔ میں بہت بُرا ہوں، بہت ذلیل ہوں۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"اوہ! آئی ایم ساری۔" وہ بے چینی سے میرے قریب آ گیا۔ "مائی ڈیئر! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم ....." وہ شرمساری سے بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ بھی وہی کرنا جو اب تک کرتے آئے ہو مگر یہ کیا ہے؟ ایں!"

"یہ ہی تو ہے کرشنا جی!" میری گھٹی ہوئی آواز نکلی۔

"جانتے ہو تمھاری عمر کیا ہوگی؟ تم چوبیس سال سے کم کے نہیں ہو گے۔

چوبیس سال کے آدمی کی آنکھ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اُسے تو دُنیا کو رُلانا چاہیئے اُسے تو حالات سے پنجہ آزمائی کرنی چاہیے تمیز کیا ہونا چاہیئے کیا نہیں۔ اگر دُنیا کا رشتہ ہر آدمی سے یکساں ہو تو آدمی کے فرائض کا سوال بھی اُٹھے" وہ جھنجلا سا گیا۔"میں تم سے کیا کہوں۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ یہ جگہ جوہو کے ساحل اور فٹ پاتھوں سے بہتر ہے تم یہاں جس طرح چاہو رہو۔ مجھے اس مکان سے گھٹا کے رہو، مجھے محض فٹ پاتھ سے گزرنے والا کوئی شخص سمجھ لو۔" وہ اُٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کھانے کو پوچھا، میں نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں پہنچا کے چند لمحے ٹھیرا، پھر شب بخیر کہتا ہوا مجھ سے رخصت ہو گیا۔

راج کرشنا نے اپنی بات کا عملی ثبوت دیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تین روز گزر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ بہت مصروف رہا۔ گھر آتا تو مجھ سے مسکرا کے حال دریافت کرتا پھر کتابوں میں مصروف ہو جاتا یا فون کرتا یا آئے ہوئے افسروں سے رازدارانہ باتیں کرتا یا خفیہ میٹنگیں ہوتیں، میں اس کی عدم موجودی میں باندرے سے دُور نکل جاتا۔ راج کرشنا نے میرے کوٹ میں چند روپے ڈال دیے تھے۔ میں دن بھر یوں ہی گھومتا رہتا۔ مولوی اکرم کے گھر کے نیچے سے میں کئی بار گزرا اور سیڑھیوں تک گیا مگر وہاں سے لوٹ آیا۔ کیا فائدہ، چیزیں لوگوں کا بدل تو نہیں ہو سکتیں۔ چوتھے دن دوپہر کو میں جلد ہی گھر واپس آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ میں داخل ہوا تو ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ راج کرشنا اپنی نشست چھوڑ کے بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ "آج جلدی آ گئے ؟ کیا حال ہے ؟"

"آپ اپنا کام جاری رکھیے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا اور سب کو باری باری سلام کیا، صرف دو ایک روز میں اُن میں سے بہت سے افسروں سے میری صاحب سلامت ہو گئی تھی۔

"ہاں، ہم ایک بہت سنگین مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ اگر تم نے کھانا نہ کھایا ہو تو کھا لو، ہمیں کچھ دیر لگے گی۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"آپ کا انتظار کر لوں گا۔" میں نے نیچی نظروں سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ڈرائنگ روم کی آوازیں اندر آ رہی تھیں۔ وہ اچانک تیز ہو تی گئیں۔ راج کرشنا کی آواز سب سے اونچی تھی، وہ شدت سے کسی نکتے پر اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اُن کی آوازیں جمع انداز کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ وہ ایسی بات نہیں تھی کہ آدمی اُسے سُن کے کسی اور طرف متوجہ ہو جائے۔ وہ راج کرشنا سے متعلق بات تھی، اُس کے ماتحت افسر اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے اور مشورہ دے رہے تھے کہ اُسے براہِ راست ملوث نہیں ہونا چاہیئے، شاید راج کرشنا نے اُن کی بات مان لی میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔

وہ لوگ چلے گئے تو راج کرشنا میرے پاس آ گیا۔ اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں، میں نے گزشتہ تین روز میں اُسے اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی باتیں اُسے کب بتاتا تھا۔ پھر بھی میں نے دبی زبان میں اُس سے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "کہتے ہیں کہ یہ بمبئی ہے۔"

"لیکن بمبئی ہے تو کیا ہوا ؟" میں نے تجسّس سے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ بہت جمے ہوئے لوگ ہیں۔ اونہہ" پھر اُسے کچھ خیال آیا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہی پرانے قصے ہیں۔ انھیں چھوڑو، تم اپنی سناؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے پر پہلے سے زیادہ رونق ہے، خوشی ہوئی۔"

"یہ آپ ہی کی دی ہوئی رونق ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دن بھر خالی پڑا رہتا ہوں، مجھے بھی تو کوئی کام بتائیے۔"

وہ اچھل پڑا۔ اُس کے گال تمتمانے لگے۔ "کام ! اِس دُنیا میں کام کی کیا کمی ہے لیکن تمھیں پیسہ کمانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام مصروف رہنے کے لیے کرنا چاہیے۔ پیسے تو میں خوب کما رہا ہوں، ٹھیک ٹھاک حالات ہیں۔ پھر بھی اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں تمھیں بہت سے کام بتا سکتا ہوں۔"

"بہت سے کام نہیں، مجھے تو آپ اپنا کوئی کام بتائیے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو میں آج سے سوچنا شروع کروں گا۔ آج اس خوشی میں ہم شام کو پھر سیر کریں گے۔ اس شہر میں ایک سے ایک قابلِ دید جگہ ہے۔ دُنیا ہر طرح دیکھنی چاہیے۔"

شام ہونے میں کچھ دیر نہیں تھی مگر راج کرشنا ایک فون آنے سے اچانک متفکر ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے معذرت کی اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کے کہیں روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اُس نے یہ عذر کر دیا تھا کہ وہ ایک بہت اہم میٹنگ میں جا رہا ہے۔ فون کی تمام گفتگو میں نے سُنی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر یوں ہی خاموش بیٹھا رہا، پھر میں نے کوٹ اُتارا، پتلون کی جگہ رات کے سونے کا پاجامہ پہنا اور اُس کے ساتھ قمیص پہن کے بنگلے سے باہر آ گیا، دروازے پر کھڑا ہوا ایک سپاہی مجھے اِس حلیے میں دیکھ کے چیں بجبیں ہوا۔ میں ایک بس میں بیٹھ کے بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا اور سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہاں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس لیے میں نسبتاً ایک گنجان علاقے میں آ گیا۔ ایک چھوٹے سے چائے کے اسٹال پر میں نے چائے پی اور سفید بنارسی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا اور کمر پر ایک ہاتھ ٹکا کے کھڑا ہو گیا۔ ابھی مجھے اس طرح کھڑے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دم بہت سی نظریں مجھے اپنے اطراف منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سر پر بہت کم بالوں والا ایک نوجوان میرے قریب آیا اور اُوپر سے نیچے تک میرے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے

بھی اُس کے ساتھ یہی عمل کیا اور اُس کے سینے پر کرختگی سے ہاتھ مار کے اُسے خود سے دُور کیا۔ وہ گرنے لگا مگر گرتے گرتے سنبھل گیا اور فوراً مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر پڑا ہوا تھا۔ بمبئی میں راہ گیر اکٹھے ہونے میں وقت نہیں لگتا اور پھر ایسے شخص کے لیے جس کا چہرہ اس علاقے میں شناسا ہو۔ چائے کے اسٹال اور پان والا دونوں اپنے ٹھیے سے اُٹھ کے اُس کی مدد کو دوڑے، اُدھر سے ایک تنومند ادھیڑ عمر شخص تیزی سے نوجوان کی طرف بڑھا اور اُسے بازو سے پکڑ کے اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا ماسٹر تارا! یہ سالا تم فٹ پاتھ پر کیا ڈانس کر رہا ہے۔"

"ابھی ہم بتاتا ہے۔" ماسٹر تارا نے آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے غصّے سے کہا اور کسی تاخیر کے بغیر دوبارہ مجھ پر لپکا۔ میں نہ صرف اُس کا بلکہ اُس کے ساتھیوں کا بھی منتظر تھا مگر وہ نہ جانے کیوں دیر کر رہے تھے۔ ماسٹر تارا نے تیسری بار پینترا بدل کے میری ٹانگ میں اپنی ٹانگ مار کے مجھے گرا دینے کی کوشش کی مگر وہ غیظ و غضب میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ موقع و محل بھول گیا۔ یہ موقع اس داؤ کا نہیں تھا۔ اس کے لیے دونوں فریقوں کے درمیان فاصلہ کم ہونا چاہیے۔ میں نے کچھ پیچھے ہٹ کے اپنے دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ وہ میرے ہاتھوں پر آیا اور اب کے میں نے اُسے سر کے بل زمین پر اُلٹ دیا۔ ماسٹر تارا کے سر میں گہری چوٹ آئی ہوگی۔ اس بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی یا اُس سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ مجمع خاصا بڑھ گیا تھا اور ماسٹر تارا کے گرتے ہی لوگ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنا چاہا، کچھ ماسٹر تارا کا حال دیکھنے کے لیے اُس پر جھک گئے۔ میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کو دُور رہنے کی تنبیہہ کی۔

"اوئے ہٹو۔" ایک دوسرا شخص مجمع چیرتا ہوا دَرانہ میری طرف آیا۔ وہ چہرے مہرے سے ماسٹر تارا کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے آناً فاناً میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ "اوئے چل۔" اُس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے مکا تان لیا اور مجھے گھسیٹتا ہوا گرجنے لگا۔ "اوئے چل۔" میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے اُس کا پہلا مکا اپنے گال پر برداشت کر لیا لیکن دوسرے مکے سے پہلے میں دونوں اطراف سے اُس کی کمر مضبوطی کے ساتھ پکڑ چکا تھا اور میری انگلیاں اُس کی کھال میں پیوست ہو چکی تھیں۔ یہ صورت دیکھ کے وہ گڑبڑا گیا اور اُس کا دوسرا مکا فضا ہی میں معلق رہ گیا کیونکہ اب وہ اپنی کمر کی رہائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے مہلت نہیں دی۔ سانس اندر دبا کے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے زمین سے چند انچ اُوپر اُٹھایا مگر اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ذرا سی اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ اُس کا وزن میری توقع سے زیادہ نکلا۔ میں نے اُس کی کمر فوراً چھوڑ دی اور صرف ایک ثانیے کی سرعت میں اُس کے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں ماریں۔ وہ بلبلا اُٹھا پھر جیسے ہی اُس نے میرے بال چھوڑے میں نے اُس کی گردن پر ٹیڑھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ وہ ایک چیخ مار کے پیچھے ہٹا اور کسی شخص سے جا ٹکرایا۔ پھر کسی اور آدمی کو میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایک کانسٹیبل بھی سیٹی بجاتا ہوا اِدھر آنکلا تھا اس لیے مجمع منتشر ہونے لگا۔ پنواڑی کود کے دوبارہ دکان پر چلا گیا اور چائے کے اسٹال والا اپنے اسٹال کی طرف بھاگا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔

کانسٹیبل نے ماسٹر تارا کی گردن پکڑ لی۔ "اوئے دادا! خیر مناؤ۔ تم پھر اِدھر مسخری کرتا پھرتا ہے؟ بہت سختی ہو گئی ہے چھوکرا! ابھی ٹائم بہت خراب ہے بابا! بھاگ جاؤ۔ وہ سالا اِدھر ہی راؤنڈ پہ ہے۔" کانسٹیبل تیزی سے بولا۔

ماسٹر تارا ابھی مجھے گھور رہا تھا اور وہ شخص بھی جس کی گردن پر میں نے ضرب لگائی تھی لیکن انھوں نے کانسٹیبل کے لیے میری جانب کوئی اشارہ نہیں کیا البتہ کانسٹیبل نے خود اُن کی نگاہیں تاڑ لیں۔ وہ میری طرف پلٹ پڑا اور مجھے دھکا دے کے چند قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں نے اُس سے کوئی تلخی مول لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ گیا تو میں دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا اور چائے کے اسٹال پر جا کے میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ ایک منٹ سے زیادہ نہیں گزرا تھا کہ میرے سامنے پیالی رکھ دی گئی۔ پورا اسٹال خالی ہو چکا تھا۔ اُس گلی نما لمبی دکان میں ایک لمبی بینچ اور اُس کے سامنے ایک لمبی میز رکھی ہوئی تھی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ حلق سے اُتارا تھا کہ وہ دونوں اور اُن کے مزید دو ساتھی میرے سر پر آ گئے۔ "ابھی اپن تم کو دوبارہ اِدھر نہیں دیکھے۔ ہم بولے دیتا ہے، ہاں۔" ایک شخص نے مجھے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ اُس کے گلے میں میلا مفلر لٹکا ہوا تھا۔

"کیا تم مجھ سے بول رہے ہو؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"اور کس سے بولتا ہے۔ ابھی تم اِدھر سے جاؤ۔ علاقے کا یہ حصّہ اُستاد مستانہ نے ماسٹر تارا کو دیلا ہے۔ تم سالا کس نشے میں ہے۔ یہ بائی کلّا ہے۔ یہاں آدمی تڑی دکھاتا ہے تو اُس کا کھوپڑی پھیر دیا جاتا ہے۔"

"یہ علاقہ اب میرا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اوئے!" وہ اچھل کے بولا۔ "سالا تم کیا پاگل ہے ایک دم؟" پھر اُس نے مصنوعی قہقہہ لگا کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم نے سُنا یہ بودم کیا جوکری کرتا ہے۔"

"میں اِدھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں دلّی سے آ کے کیا یہاں خالی پھروں گا؟ ماسٹر تارا! تمھارے اندر دم ہو تو نکال کے دکھاؤ مجھے اِدھر سے ورنہ ہاتھ بڑھاؤ۔ اب میں اِدھر ہی بیٹھوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تم اِدھر کیسے بیٹھیں گا؟" ماسٹر تارا کا ترجمان مجھے شعلہ بار آنکھوں

سے گھورتے ہوئے بولا: "میں کہتا ہوں تم سالا بہت چریا پن کر رہا ہے۔ ابھی اپن نرمی گرمی سے سمجھاتا ہے۔ بعد کو ٹیم نکل جائیں گا۔ تم سالا بہت پچھتائیں گا۔"

"دیکھ لیں گے۔ میں بھی کچھ سمجھ کے ہی اِدھر بیٹھا ہوں۔ تم کیسے آدمی ہو۔ آدمی نہیں پہچانتے۔" اُسے نظر انداز کر کے میں نے چائے والے کو پکارا: "اے چائے والا سیٹھ! کل ادھر کے تمام لوگوں سے کہہ دو کہ اب ہم کو بھتا پہنچائیں۔ استاد مستانہ آئے گا تو میں خود بات کر لوں گا۔ کیا تمھیں کچھ اور سننا ہے؟"

اُن چاروں نے یکے بعد دیگرے مجھے دھمکیاں دیں، استاد مستانے کی شخصیت سے خوف زدہ کرنا چاہا مگر میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بات بڑھی تو یہی کسی کے منہ پہ اُلٹ دوں گا مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ مجھے اُس وقت چاقو کی کمی شدت سے محسوس تو ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سب کچھ چھن گیا تھا، صرف میں باقی رہ گیا تھا۔ ماسٹر تارا اور اُس کے ساتھی ڈھیٹ پنے سے میرے سر پہ کھڑے رہے۔ وہ معمولی درجے کے لوگ تھے اس لیے مجھے اُن کی طرف سے خطرہ تھا۔ وہ کوئی بھی اوچھا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اوچھے ہاتھ سے اور کچھ تو نہیں ہوتا مگر بچّل کہتا تھا کہ اوچھا ہاتھ ڈالنے والے کو اس کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑتا ہے اور اُسے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ہمیشہ کے لیے جسم پر داغ پڑ جاتا ہے اور جواب دینے والے کو ہمیشہ ملال رہتا ہے کہ اُسے ایک نا اہل آدمی کو ایسا جواب دینا پڑا۔ میں نے پہلے ہی مرحلے پر انھیں اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے بات آگے بڑھائیں۔ بچّل نے ایک بات اور کہی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی پھرتی سے زیادہ آدمی کو آنکھ کا پھرتیلا ہونا چاہیے۔ آنکھ ایک کسوٹی، ایک تھرمامیٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اُس میں مقابل کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اُن میں سے ایک نے بھنّا کے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اُس کے ساتھی نے اُسے جھڑک کے باز رہنے دیا۔ اسٹال کی لمبی میز کو کئی چھوٹی چھوٹی میزوں سے ملا کے ایک بڑی میز کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی نچلی سطح پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ چائے والا سہمی ہوئی نظروں سے بار بار چھت دیکھتا تھا: "بابا! اے بھائی! ادیر کا بھی کچھ خیال کرو۔" اُس نے عاجزی سے کہا: "ابھی سالا ادھر صبح صبح نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں سر جھٹکنے لگا۔

"تم لوگ ادھر وقت خراب کر رہے ہو۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "تجھے یہاں سے کوئی نہیں اُٹھا سکتا اور سُن لو، اگر اب تم نے کوئی حماقت کی تو بہت بُرا ہوگا۔"

تیونس کے فیلڈ مارشل لارڈ الیگزینڈر نے لکھا ہے "دوسری عظیم جنگ میں کیسرٹا اتحادی فوجوں کا مرکز تھا۔ میری ماتحتی میں جو فوج تھی اُس کے آدھے سپاہی برطانوی تھے، آدھے امریکن۔ ایک دن چند برطانوی اور چند امریکن سپاہی میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ 'ہم ایک مشکل سے دوچار ہو گئے ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کیجیے۔' قصہ یہ تھا کہ جب امریکن سپاہی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوتے تو یہ چاہتے کہ تمام کھڑکیاں مضبوطی سے بند ہوں اور جب برطانوی سپاہی داخل ہوتے تو یہ چاہتے کہ تمام کھڑکیاں چوپٹ کھلی ہوئی ہوں۔ میں نے یہ دل چسپ قصہ سُنا تو خاصے غور و خوض کے بعد اس مسئلے کا یہ حل تجویز کیا کہ خواہ امریکن ہوں یا برطانوی، جو بھی سپاہی ہیڈ کوارٹر کی حدود میں پہلے داخل ہوگا، اُسے حق ہوگا کہ وہ کھڑکیاں چاہے بند رکھے چاہے کُھلی۔

"میرے اس فیصلے کا ردِ عمل حیرت انگیز ہوا۔ میرے ماتحت سپاہی پہلے کئی کئی گھنٹے لیٹ آتے تھے مگر اب مقررہ وقت سے ایک گھنٹے پہلے پہنچنے لگے۔"

* کراچی سے رحمت اللہ کی ڈاک *

"اپن تم سے سمجھ لیں گا،" سالا ادیر کرشن کا ٹیم ہے ورنہ اپن تم کو بتا دیتا کہ اپن کون ہے۔ تمھارا سارا ہیکڑی دیکھ لینا اور تم کو بائی کلا میں پاؤں رکھنے کے قابل نہیں رکھتا۔" میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ پان والے کو آواز دے کے ایک اور بنارسی پان بنانے کے لیے کہا: "ابھی تم اصل سے پیدا ہوا ہے تو ادیر ہی بیٹھا رہنا۔ اپن واپس آتا ہے۔"

"تم جاتے ہی کیوں ہو۔" میں نے زہر خند سے جواب دیا۔

"اپن بتائیں گا کہ اپن کیوں جاتا ہے، ادیر نٹا ہوئیں گا تو وہی منہ بنائیں گا۔ استاد مستانہ نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں چھوکرا! ٹیم دو رہا ہے۔"

"جاؤ جاؤ۔" میں نے دھتکار کے کہا۔

وہ چند لمحے ٹھیرے پھر گرجتے برستے گالیاں دیتے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اسٹال والا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانے کے مشورے دینے لگا۔ وہ استاد مستانہ کے قہر و غضب کا ذکر بہت خوف زدہ انداز میں کر رہا تھا۔ پان والے نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ دونوں اصرار کرنے لگے کہ اگر مجھے اپنی جان عزیز ہے تو ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں، بس میں بیٹھوں اور بائی کلا کا علاقہ فوراً چھوڑ دوں۔ میں نے اُن کی مخلصانہ تجویز سُنی اَن سُنی کر دی۔ آخر پان والے نے میرے پیر پکڑ لیے مگر میں وہاں سے نہیں ٹلا۔ "استاد مستانہ بہت بڑا چاقو باز ہے۔ تمنچہ بھی ساتھ رکھتا ہے۔ ادھر اُس کے سب لڑکے گھومتے رہتے ہیں اور وہ خود ان کی نگرانی کرتا ہے۔" ہر بات ٹھیک تھی مگر مجھے زندگی کی ایسی کون سی فکر تھی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس درمیان چائے کے اسٹال پر بہت سے لوگ چائے پینے کے لیے آئے اور اپنے

اپنے راستے پر لگ گئے۔ ماسٹر تارا کسی کو ہدایت دے گیا ہوگا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے۔ ایک شخص کو میں نے کئی بار چائے کے اسٹال کے نزدیک پھیرے کرتے ہوئے دیکھا پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ماسٹر تارا کے ساتھ سات آٹھ آدمیوں کا ایک گروہ اسٹال پر آیا۔ وہ سب خاص قسم کے لوگ تھے۔ اُن کے چہروں پر درشت لکیریں کٹے پھٹے نشانات نمایاں تھے۔ آنکھوں میں چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ اُن کے درمیان سانولے رنگ، گٹھے ہوئے جسم اور اوسط قد کا ایک شخص کھڑا تھا، وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ صرف وہی شخص تھا جس کی آنکھوں میں شعلوں کے بجائے شعلوں کی چمک تھی، ہونٹوں کا ایک کنارہ مسکراہٹ میں دُور تک کھنچ جاتا تھا، بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے، ٹھوڑی پر چاقو کا ایک ترچھا نشان تھا، ایسا ہی ایک نشان پیشانی پر بھی تھا، کان کی ایک لو کٹی ہوئی تھی گلے میں زنجیر کے ساتھ گیندے اور گلاب کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ گلا ایک ہری چُنریا سے لپٹا ہوا تھا۔ چُنریا کے پلّو سینے پر بالوں کی دو چوٹیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ استاد مستانے کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اُس کے ابروؤں میں جنبش ہوئی، بھویں تھرتھرائیں سلب ایک آن کے لیے کپکپائے، پھر اُس کی نشیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ وہ دھوپ کے رُخ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے اُن پر پلکوں کا آدھا غلاف چڑھا لیا، نیم باز آنکھیں کچھ اور اثر انگیز ہوئیں وہ مجھے کسی استاد سے زیادہ جادوگر معلوم ہوا۔ اُس کے ساتھی پر تولے کھڑے تھے۔ اُس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ میں نے میز مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ضرورت کے وقت پیچ آدھی کر کے اس سے چاقو کا کام لوں گا۔ چائے والا سیٹھ اسٹال سے باہر آ گیا تھا۔

مستانے نے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک شخص کو ابرو کا اشارہ کیا۔ وہ قد و قامت میں میرے برابر ہوگا، عمر میں مجھ سے زیادہ تھا، اُس کے اعضا میں لچک نہیں تھی، چہرہ بھی بے رحمی کا غمّاز تھا، صرف ایک لمحے میں وہ میرے رو بہ رو موجود تھا، میں نے میز ایک طرف دھکیل دی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اپنے ساتھیوں کی طرف اُچھال دیا کیونکہ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے بھی پیچ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا اور میرا فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس نے اپنا اُلٹا ہاتھ تیزی سے اٹھایا تاکہ میرے کاندھے پر ضرب لگا کے پہلے ہی وار میں مجھے زمین پر بٹھا دے۔ میں اُس کی ضرب کمزور کرنے کے لیے خود ہی نیچے جھک گیا چنانچہ جب اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر پڑا تو اُس میں اتنا زور نہیں تھا، جتنے زور کی توقع میں اُس نے اُسے اُٹھایا تھا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ میں نے نیچے جھک کے گویا ایک طرح کا دفاعی انداز اختیار کر لیا ہے لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اُوپر سے میرے کندھے پر ضرب لگائے اور میں نیچے جھک کے اُس کی بغل پر ضرب لگاؤں۔ بغل کی ضرب سے بہت سے لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ یہی ہوا جب بالکل غیر متوقع طور پر میں نے زمین سے اچک کر اُس کی بغل نشانہ بنائی تو وہ گھبرا اُٹھا اور اُچھل کے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ قدم پیچھے کرنے کی مہلت میں اگر حملہ نہ کیا جائے تو فریق کو سنبھلنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کے ساتھ ہی آگے بڑھا اور میں نے اُس کا وار اُسی پر آزمایا البتہ فرق یہ تھا کہ وہ صرف کندھے پر ضرب لگا کے مجھے جھکانا چاہتا تھا، میں نے اُس کی گردن کے جوڑ پر ضرب لگائی۔ وہ بوکھلاہٹ میں اوندھے سیدھے ہاتھ چلانے لگا جو چھچھلتے ہوئے میرے سر اور پسلیوں میں لگے۔ پتھل نے نصیحت کی تھی کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں کھائے جائیں اور ایسے نشانے کی تاک میں رہا جائے کہ جہاں ضرب لگانی مقصود ہو وہاں سے مقابل کا ہاتھ فاصلے پر ہو۔ وہ کہتا تھا کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے والا دیر تک محتاط نہیں رہ سکتا بشرطیکہ مقابل کا آدمی جان بوجھ کے اُس کے حملے برداشت کر رہا ہو اور مناسب موقع کی تاک میں ہو ورنہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ آدھی لڑائی تو محض احتیاط اور کوشش سے جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں مکمل طور پر اپنی ذات کے احاطے میں رہنا چاہیے اور مقابل کو اپنی آنکھ کے حصار میں رکھنا چاہیے۔ میں اِدھر اُدھر پینترے بدل بدل کے اُس کی ضربیں نامکمل کر رہا تھا۔ ابھی اُس کی ضربیں پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھیں کہ آخر مجھے ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ میرا بھرا ہوا پنجہ اُس کی ناک پر پڑا۔ اُس نے تلملا کے برق رفتاری کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اب اُس کی یہی خواہش ہونی چاہیے تھی کہ وہ جوابًا میرے چہرے کے کسی حصّے پر خون کی لکیر اُبھار دے جیسی اُس کے چہرے پر اُبھر آئی تھی۔ اپنا خون دیکھ کے آدمی پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے بس اُس کے گردن پکڑنے کی دیر تھی، میں نے اپنا وہی جکڑا ہوا سر اُس کی ٹھوڑی کے نچلے حصّے پر مارا۔ اُس کے کئی دانت آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے۔ ایک بلند کراہ کے ساتھ ہی اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے کسی وقفے کے بغیر اُس کے پیٹ میں مکّا مار کے پہلے تو اپنی گردن آزاد کرائی اور اُسے پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

آگرے میں نوشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اُس کی ٹھوڑی میرے سر کے بجائے موتیا بائی کے صندوق سے چکنا چور ہوئی تھی۔ وہ ضرب اس ضرب سے زیادہ شدید تھی۔ نوشہ فرش پر بلبلانے لگا تھا۔ یہاں مستانہ کے آدمی کی ٹھوڑی مخدوش ہو جانے کے باوجود مجھے پے در پے ضربیں لگانی پڑیں تب کہیں اُس کے حواس بجا طور پر باختہ ہوئے۔ وہ گرنے لگا۔ نوشہ کے مقابلے میں یہ شخص ہر پہلو سے دُگنا تھا، داؤ پیچ بھی اچھّے خاصے جانتا تھا۔ مستانے کی وجہ سے یہاں بھیڑ بھی زیادہ اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے آدمیوں نے بھیڑ اکٹھی نہیں ہونے دی۔ اسٹال کی کئی میزیں ٹوٹ گئیں۔ پانی کا فلٹر بھی ٹوٹ گیا۔ تقریباً سارا اسٹال چند منٹوں میں الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ شخص ابھی تک اُلٹے سیدھے ہاتھ چلا رہا تھا اس لیے اچانک مستانہ کے اشارے پر اُس کے دو آدمی اُسے بازوؤں سے



پکڑ کے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میری لاج رہ گئی۔ نصیب میاں ہوتے تو کہتے، کیا برجستہ اور بے ساختہ وار تھے۔ جب میں نے جیل میں کانتے کو گرایا تھا تو وہاں میرا ایک وار فی البدیہہ وار سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں مستانہ کے سامنے بھی اتنی ہی جلدی اور تیزی سے فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا آدمی پاگل ہوا جا رہا تھا اور اپنے ساتھیوں کے قبضے سے آزاد ہو کے دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا مگر انھوں نے اُسے بہ مشکل تمام روکے رکھا اور اسٹال والے کی میلی تولیا سے اُس کا خون آلود چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا مگر خون نہیں رُکا تو اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اُسے کلیاں کرائی جانے لگیں۔ سادہ پانی اُس کے منہ سے سرخ ہو کے واپس آ رہا تھا۔

مستانہ کی آنکھوں کی نشیلی چمک گہری ہو گئی تھی اور اب اُس کی پلکیں پوری طرح اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ نہیں تھا، مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا، پھر وہ آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا اور اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک نعرہ لگا کے بے تابانہ میرے دائیں بازو کو بوسہ دیا اور لپٹنے لگے ... کے میرے گلے میں ڈال دی۔

وہ جگہ گراؤنڈ فلور کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھی جہاں مستانہ اپنے آدمیوں کی معیت میں مجھے لے گیا، مجھے اُس نے چوکی پر اپنے برابر کی جگہ دی پھر لڈوؤں کا ایک طشت آ گیا۔ لڈوؤں پر پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ ایک بڑا گلاس اور دودھ کی بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے دودھ کا بھرا ہوا گلاس مجھے پینے کے لیے دیا۔ ابھی میں نے صرف ایک گھونٹ لیا تھا کہ اُس نے گلاس مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر وہ گلاس باری باری تمام لوگوں میں گھومتا رہا اور سب اُس سے ایک ایک گھونٹ پیتے رہے۔ ساتھ ہی دو دو لڈو تقسیم کیے جانے لگے۔ مستانہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ وہ بات کم کرتا تھا، اشارے زیادہ کرتا تھا۔ ”تارے!“ دفعتہً اُس کی آواز گونجی۔ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تارے! کاشی! بابُل! دودھ پی لیا؟“

”پی لیا۔“ وہ تینوں مُرجھائی ہوئی آوازوں میں بولے۔

”پی لیا؟“ مستانہ نے اپنی کھنک دار آواز میں دوبارہ پوچھا۔

”پی لیا استاد!“ اس بار تینوں بیک وقت بولے۔

”پی لیا؟“ مستانہ نے نسبتہً اونچی آواز میں پھر تکرار کی۔

”جی استاد!“ اُن تینوں نے پھر سر جھکا لیے۔

مستانہ نے ایک لمبی ہوں کی اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا ”بول کون سا ٹھکانا چاہیے؟“ اُس کی آواز میں لچک اور کھنک تھی جیسے پیتل کا برتن بول رہا ہو۔

”یہ تمھاری مرضی پر ہے استاد! میں نے خود کو تمھارے ساتھ باندھ دیا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں اس شہر میں نیا ہوں، بمبئی میں تمھارا ذکر سنا تھا، سوچا ٹرائی کر دیں، سو اِدھر چلا آیا۔“

”اپن کا ذکر بمبئی میں کیدر نئیں ہے۔ تو نے اچھا کیا، ایدر آ گیا پر تجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھا اپن کے پاس آتا۔“ مستانہ شرابی لہجے میں بولا۔

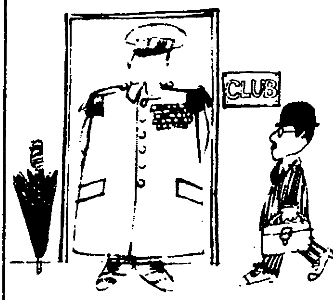
”میں نے سوچا، جان پہچان میں ٹائم لگے گا۔ پہلے ہی استاد کو کانٹے پہ رکھ کے بتا دوں تو اچھا ہے۔ یہ شہر بہت ظالم ہے کئی دن سے میں اِدھر پھر رہا ہوں پر شرافت یہاں چھو کے نہیں گئی۔ کوئی ہمارے شہر میں آ کے دیکھے اسے سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں، یہاں تو تارا جیسا گھوسٹ نظریں ٹیڑھی کرنے لگا تھا۔“

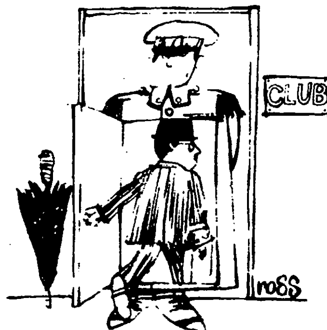
”تارا حرامی ہے۔“ مستانہ برہمی سے بولا۔ ”تو نے ایدر آ کے دیکھا ہوتا، مستانے کی آنکھ اُڑتی چڑیا کا تول کر لیتی ہے۔ اپن تارا و دار تجھے پہلی نظر دیکھ کے ہی ہاتھ اُٹھا دیتے پر اپن نے بھی سوچا، ان سالوں کی تسلی ہو جائے۔ خیر بھول جا سب کچھ، اب یہ سب تیرے بھائی ہیں۔“

”اپن نے اِسے کچھ نہیں بولا تھا استاد!“ ماسٹر تارا نے احتجاج کیا۔

”چپ رہ۔“ مستانہ نے اپنی سرخ آنکھیں ماسٹر تارا پر جما کے للکارا۔ ”دلی سے شہزادہ آیا ہے۔ اب اگر زبان کھولی تو قینچی سے کتر لوں گا۔“

نوجوان ماسٹر تارا نے بڑھ کے اُستاد کے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، میں نے اُسے پاس ہی بٹھا لیا، پھر سب نے





ماسٹر تارا کی تقلید کی۔ ہر شخص پہلے اُستاد کے پاؤں چھوتا پھر مجھ سے مصافحہ کرتا۔ میں نے مستانہ کو اپنا نام سکندر بتایا تھا۔ ماحول میں اجنبیت کا جو غبار چھایا ہوا تھا، وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں راج کرشنا گھر واپس نہ آ گیا ہو۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں صرف قمیص پاجامے میں گھر سے نکل گیا ہوں تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ میں مستانہ سے کہہ چکا تھا کہ بمبئی میں میرا کوئی تنہا سا کوئی گھر نہیں ہے۔ اب اگر میں جانے کی جلدی کرتا تو سب بنی بنائی خاک ہو جاتی لیکن ظاہر تھا کہ وہ کب تک اس طرح بیٹھے رہتے۔ مستانہ نے مجھ سے بائی کلّا کا کوئی بھی علاقہ مانگ لینے کی پیش کش کی تھی، مجھے اس سلسلے میں کوئی واقفیت ہی نہیں تھی اور نہ میرا مقصد کوئی علاقہ حاصل کرنا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا کہ پہلے میں سارے علاقے کا جائزہ لوں گا، پھر اُسے بتاؤں گا، مستانے کی بھی شاید یہی خواہش تھی کہ میں اُس کے ساتھ رہوں اور علاقے میں اُس کا نمائندہ بن کے آدمیوں کی نگرانی کرتا رہوں۔ وہ ابھی روپے پیسے کا کوئی اعتبار مجھ پر نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ وہ ابھی مجھے اور پرکھنا چاہتا ہوگا۔ میری بات سے وہ خوش ہوا، پھر اُس نے سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور مجھ سے دلّی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کلکتے کی جو معلومات تھیں، وہ میں نے دلّی پر منطبق کر دیں۔ میں سات سال جیل میں رہ کے ہر طرح کی بات سے واقف ہو ہی چکا تھا اس لیے مستانہ نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔ جس شخص کے میں نے دانت توڑے تھے اور ناک پھوڑی تھی، وہ مرہم پٹی کرا کے آ گیا تھا۔ مستانہ نے باقی دودھ اُسے پلا دیا۔ اُس کا نام دلیرا تھا۔ دلیرا کا چہرہ بجھا ہوا تھا مگر وہ مستانہ کے اشارے پر مجھ سے گلے مل لیا۔

رات کا کھانا میں نے مستانہ اور اُس کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے بعد ایک آدمی نے اُسے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ مستانہ فوراً اُٹھ گیا۔ میں نے کچھ دیر اُس کا انتظار کیا پھر باہر چلا آیا اور جو پہلی بس نظر آئی، اُس میں سوار ہو گیا۔ میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ جب بس خاصی دُور آ گئی اور میرے خیال کے مطابق بائی کلّا کا علاقہ دُور رہ گیا تو میں نے اُتر کے نپے تلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بہت گنجان تھی۔ ایک بڑا میڈیکل اسٹور ابھی تک کھلا ہوا تھا، میں نے اُس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لے کے فون کرنے کے لیے اسٹور کا رُخ کیا۔ اسٹور کے مالک نے مجھے آسانی سے فون نہیں کرنے دیا لیکن جب میں نے ایک روپیہ اُس کے سامنے رکھا تو ۲ آنے کاٹ کے باقی ۱۴ آنے اُس نے میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ راج کرشنا نے میری آواز سنتے ہی ڈھیروں سوال شروع کر دیے۔ میں نے سرگوشی میں کہا کہ میں آج رات شاید گھر نہ آ سکوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ راج کرشنا تفصیل پوچھتا، میں نے فون بند کر دیا۔

میں دوسرے دن بھی راج کرشنا کے پاس نہیں جا سکا اور فون بھی نہیں کر سکا۔ مستانہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میرا اُس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنا ضروری تھا۔ اس طرح ایک تو میں زیادہ محفوظ تھا کیونکہ ممکن تھا، مستانہ کے آدمیوں کے دلوں میں اب بھی کوئی پھانس رہ گئی ہو۔ دوسرے میں اپنے آپ پر جبر کر کے جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اُس کی تکمیل جتنی جلدی ہو جاتی، اچھا تھا۔ جھلّل اور موجمدار کی طرح مستانہ کے پاس داؤ پیچ سکھانے کے لیے بڑی جگہ نہیں تھی۔ ویسے بھی مستانہ بمبئی کے ایک چھوٹے سے علاقے کا مختار تھا، جھلّل اور موجمدار کے پاس جتنا بڑا علاقہ تھا، یہ اُس کا عشرِ عشیر نہیں تھا۔ ویسے مستانہ چاقو چلانے میں بہت پھرتیلا تھا۔ یہ مقام اُس نے چاقو بازی ہی کا جوہر دکھا کے حاصل کیا ہوگا۔ دوسرے یہ اُس کا وہ بہروپ تھا جو خواہ مخواہ اُس کے آدمیوں پر دہشت طاری کیے ہوئے تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مستانہ کی آنکھ میں رحم بالکل مفقود تھا۔ وہ کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی ہوگا۔ تیسرے دن صبح جب اُس نے اپنے کئی آدمیوں کے سامنے داؤ پیچ کی مشق کی اور اُن کے چاقو گرا دیے تو میرا جی چاہا کہ میں بھی

اُس سے دو دو ہاتھ کروں مگر میں دُور ہی کھڑا رہا البتہ میں نے اُس کے آدمیوں سے پنجہ آزمائی اور چاقو بازی ضرور کی اور ہاتھ ذرا دبے دبے رکھے۔ اس کے باوجود مستانہ عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کی موجودگی میں مجھے اپنے ساتھ چاقو آزمائی کے لیے للکارا۔ اُس کی للکار میں تمسخر تھا، غصّہ نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور پہلی بار مستانہ کا قہقہہ سُنا۔ وہ اُکھڑا اُکھڑا سا قہقہہ جس کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ "دلّی کا شہزادہ سکندر رجانتا ہے" اُس نے سینہ پُھلا کے کہا۔ "کہ اُس کے سامنے ایک مستانہ کھڑا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے مستانہ نے ایک جُھرجُھری لی، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور نعرہ نما آواز میں بولا۔ "مالک! راجا ہی رکھیو"۔ پھر وہ اچانک دیوار سے سر پھوڑنے لگا اور اُس نے اپنا گریبان چاک کر کے "تار تار کر دیا۔ اُس کے آدمیوں نے اُسے پکڑنا چاہا تو اُس نے اُن دونوں کو جُھکائی دے کے فرش بوس کر دیا اور کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے گم سم کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جیب سے چاقو نکالا اور سامنے کی دیوار پر ایک نظر کی۔ چاقو ٹھیک چھپکلی کے سر پر لگا۔ چھپکلی دو ٹکڑے ہو کے زمین پر گر گئی۔ اُس کے آدمیوں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا۔ میری زبان سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ نشانہ لگانے کا موقع آئے تبھی تو کوئی نشانہ لگا سکتا ہے۔

*

تیسرے دن دوپہر کو مجھے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔ راج کرشنا موجود نہیں تھا۔ مجھے جلد واپس پہنچنا تھا۔ اس لیے میں بکھو کو اپنی حاضری نوٹ کرا کے چلا آیا۔ مستانہ نے مجھے کچھ پیسے دیے تھے "تاکہ میں نئے کپڑے خرید لوں۔" میں نے انھی لوگوں کے رنگ ڈھنگ کے مطابق کپڑے بنوا لیے اور دن دن بھر بائی کلا کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ دو دن اور گزر گئے۔ ان دو دنوں میں مجھے مستانہ سے کچھ اور قریب ہونے کا وقت مل گیا۔ خوشامد مستانہ کو بہت پسند تھی مگر میری زبان سے خوشامد کا ایک لفظ بھی نہیں چھوٹتا تھا اس لیے میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔ اس خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کے آدمی میری عزّت کرنے لگے۔ خود مستانہ نے اسے میرے عجز پر محمول کیا۔ مستانہ کی زبان کچھ صاف تھی۔ وہ سی پی کے کسی گاؤں سے ممبئی آیا تھا۔ رات گئے اُس کے پاس بھانت بھانت کی عورتیں آجاتی تھیں جنھیں لے کے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ کمرے سے رات بھر ناچ گانے، راگ رنگ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اُس کمرے میں اُس کے دو چار ہی آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت تھی اور وہ دروازے کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ کوئی عورت باہر نکلتی تو وہ اُسے بُری طرح دبوچ لیتے۔ وہ بھی اتنی بے غیرت ہوتیں کہ کوئی مزاحمت نہ کرتیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور چپٹ جاتیں۔ میں آنکھیں پھیر لیتا۔ شام اور صبح دونوں وقت بھنگ گھوٹی جاتی تھی۔ ایک بار انھوں نے میری طرف بھی پیالے بڑھائے۔ میں نے کہا ماں نے قسم دلا دی ہے۔ رات گئے مستانہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلتا تو اُس کے آدمی اندر گھس کے عورتوں پر جھپٹ پڑتے اور انھیں اپنے ساتھ کمروں میں لے جاتے۔ اگر کسی کی آج باری نہ آتی تو وہ دوسرے دن بازی لے جانے کی کوشش کرتا۔

دن بھر تاش کھیلے جاتے اور علاقے کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے لوگ مستانہ کے سامنے جیبیں خالی کر دیتے اور پولیس والوں کی سختی کی شکایتیں کرتے۔ کبھی کسی دکان دار کا رونا رونے۔ مستانہ کے خاص خاص آدمی آتے تو مستانہ اُٹھ کے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ابھی تک میری پہنچ نہیں ہوئی تھی۔ مستانہ کے اڈّے پر باہر کے لوگ بھی ملنے کے لیے آتے۔ میرے آنے سے قبل دو کانسٹیبلوں کا قتل ہو چکا تھا اور مستانہ کے کئی آدمی جیل میں بند ہو چکے تھے مگر کسی نے قبول کر کے نہیں دیا تھا اس لیے بائی کلا میں پولیس کی نفری بڑھا دی گئی تھی اور مستانہ انھیں کچھ دنوں سنبھلے رہنے کی ہدایت دیتا رہتا تھا۔ پولیس کی سختی کی زیادہ شکایتیں سُن کے اُس کی آنکھیں شراب کے بجائے خون اُگلنے لگتیں اور وہ پھنکارتا ہوا کہتا۔ "ابھی دو چار اور جائیں گے۔ مالک ابھی دو چار اور اپنے پاس بُلانے کی فکر میں ہے۔ بھیجوں گا مالک! تیرا حکم ہے بھیجنا ہی پڑے گا۔"

مستانہ کو کسی کام سے عار نہیں تھا، کام کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ ممبئی کے دوسرے علاقے کے لوگ جب اُس سے ملنے آتے تو وہ اُن کی بڑی خاطر تواضع کرتا اور جب اپنے کسی آدمی کو سزا دینے پہ آتا تو اُس کی اُنگلی کا کوئی پوروا کاٹ لیتا یا کان کی لَو کتر لیتا یا کہیں سے ذرا سی کھال اُتار لیتا یا پھر سکّے کی شکل کی دھات سے اُس کی کمر میں داغ ڈلے جاتے مگر ایسا کم ہوتا تھا۔ اُس کے آدمی غلطیاں کم ہی کرتے تھے اور کرتے تھے تو سزا میں رتّی بھر رعایت بھی نہیں کی جاتی تھی۔

چونکہ بائی کلا میں پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور افسروں کا گشت جاری تھا اس لیے میں نے باہر نکلنا اور کم کر دیا تھا۔ راج کرشنا کے کئی ماتحت افسران مجھے اُس کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ مجھے مستانہ کے ہاں اپنے دن کھینچتے ہوئے دو ہفتے گزر گئے۔ یہ دو ہفتے میں نے کسی جیل میں گزارے تھے۔ کبھی میرے خون کی گردش اتنی تیز ہو جاتی اور کبھی دماغ اتنا بھک جاتا کہ میرے ہاتھ خود اپنا گلا گھونٹنے لگتے۔ ایک ایک دن گنتا تھا، ایک ایک گھڑی بِتانا مشکل تھا۔ سولھویں دن ہی میں وہاں سے چلا آتا کیونکہ وہاں مزید ٹھیرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور میرا سینہ پک رہا تھا اور ویسے بھی مجھے جلد سے جلد اُن لوگوں سے دُور ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب مستانہ مجھے اپنے خاص آدمی کا سا رتبہ دینے لگا تھا اور کوئی اہم کام سونپنے ہی والا تھا۔ وہ کام کسی کا خون کرنے کا بھی ہو سکتا تھا۔ سولھویں دن دوپہر کے وقت مستانہ نے مجھے اپنے خفیہ کمرے میں بلوایا۔ وہاں دیواروں پر عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور چھوٹے چھوٹے پایوں کی ایک بڑی چوکی بچھی


My-T
ATL

دھنک دھنک

غزل ناظر کی کاوش

- تعلیم نے آبادی کی بہت بڑی تعداد کو پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے لیکن یہ تمیز نہیں دی کہ کون سی چیز پڑھی جائے ——— جی۔ایم۔ٹریویلین
- غلط بات جاننے سے نہ جاننا بہتر ہے ——— جوش بلنگ
- خالص اور مکمل غم خالص اور مکمل خوشی کی طرح ناممکنات میں سے ہے ——— ٹالسٹائی
- مجھے آج تک تنہائی سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ملا ——— ٹالسٹائی
- تقدیر ہمیشہ دلیروں کا ساتھ دیتی ہے ——— ٹیرینس
- کبھی محبت نہ کرنے کے مقابلے میں محبت کر کے محبت میں دھوکا کھا لینا بہتر ہے۔
- جس نے دشمن نہیں بنایا، وہ دوست بھی نہیں بنا سکتا ——— ٹینی سن

ہوئی تھی۔ مستانہ کے کچھ خاص آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مستانہ نے دروازہ بند کروا دیا اور ہمیں سرگوشیوں میں ہدایت دینے لگا۔ اُس کی ہدایت سُن کے میرے ہوش اُڑنے لگے، رگیں پھٹنے لگیں۔ مستانہ نے میری طرف خشونت سے دیکھا اور درشتی سے بولا۔ ”کیوں سکندر! تو نے اپن کی بات دھیان سے نہیں سُنی؟“

میں نے بوکھلا کے کہا۔ ”سُن لی ہے استاد!“

”تو پھر تیرے منہ کو سیل کیوں لگ گئی۔ تیرے لیے یہ کام نیا ہو گا۔“ وہ بگڑتے ہوئے تیوروں سے بولا۔ ”پر تجھے کسی بڑے کام سے تو لگانا ہو گا۔ تو نے اچھا کیا، جلدی ہنس کی علاقہ نہیں لیا، نہیں تو ٹھوکریں کھاتا رہتا سالا! اب خوش ہو جا، آگے مال ہی مال ہے۔“ میری زبان کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ”سُن لیا؟“ وہ چیخ کے بولا۔

”سُن لیا۔“ میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

میں وہاں سے جلد چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بار بار برف ہو جاتے تھے اور بار بار اُن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ شام تک مستانہ نے اس بات کا التزام رکھا کہ کوئی آدمی اُس سے دُور نہ رہے حالانکہ بہ ظاہر وہ ہمیں حکم دے کے جیسے بھول گیا تھا۔ جیسے یہ اُس کا معمول ہو۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنی فہمیدہ یاد آ گئی۔ میری جان، میری بہنو۔ میرا کلیجا پھٹنے لگا۔ چراغ جلنے کے خاصی دیر بعد مجھے بھاگ جانے کا ایک موقع ملا لیکن میرے قدم مستانہ کے فلیٹوں کے تنگ راستے میں زمین نے جکڑ لیے۔ اگر مستانہ کو فوراً خبر ہو گئی کہ میں اڈّے پر موجود نہیں ہوں تو وہ میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دے گا اور اگر مجھے وقت پر کوئی سواری نہ ملی تو میں بائی کلا کے علاقے میں کسی بھی جگہ پکڑا جاؤں گا۔ میں چند لمحے راستے ہی میں ٹھہرا ہوا سوچتا رہا اور سوچنے کے نتیجے میں واپس آ گیا۔ میرا اندیشہ درست تھا۔ مستانہ کے آدمی دروازے سے باہر آ گئے تھے مگر مجھے واپس آتا دیکھ کے لوٹ گئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا گچھا نہیں کیونکہ میں چند ہی لمحوں میں واپس آ گیا تھا۔ مستانہ نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

رات کے بارہ بجے ہم لوگ، ہم آٹھ آدمی دو گاڑیوں میں اڈّے سے روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی لمبی تھی، دوسری چھوٹی۔ میں چھوٹی میں تھا۔ پون گھنٹے بعد ہم اپنے مقررہ مقام پر پہنچے، دونوں گاڑیاں کچھ کچھ فاصلے پر ٹھیرائی گئی تھیں۔ میرا کام باہر ہی کھڑے رہنا تھا۔ مستانہ کے تین آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے آپس میں کچھ اشارے کیے۔ اُس وقت رات کا ایک بجا ہو گا، دھیمی دھیمی روشنی تھی، یہ بنگلوں کا علاقہ تھا۔ چار آدمی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی کانسٹیبل اِدھر نکل آیا تو آپس میں دنگا کر کے اُسے اُلجھا لیا جائے گا۔ میں گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا ہوتا تو چپکے سے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا۔ کل گیارہ آدمی تھے۔ گیارہ میں سے دو ایک کو مار کے یا شور مچا کے بھی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی اور کھڑا تھا، چار آدمی کچھ فاصلے پر ٹہل رہے تھے، چار آدمی بنگلے کی دیوار کود گئے تھے۔ اُن کے جانے کے چند منٹ بعد بنگلا اندھیرے میں ڈوب گیا۔

کوئی دس منٹ بعد اِدھر اُدھر شی شی، شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں، تین آدمی بھاگتے ہوئے فٹ پاتھ پر آئے، ایک کے کندھے پر چادر میں لپٹی ہوئی بے ہوش لڑکی تھی، گاڑیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لڑکی بجلی کی تیزی سے بڑی گاڑی میں ڈال دی گئی اور دو آدمی پچھلی سیٹ پر کونوں میں اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ اگلی نشست پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے، باقی آدمی چھوٹی گاڑی میں ٹھنس گئے۔ اس بار چھوٹی گاڑی آگے تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کچھ فاصلے سے چل رہی تھیں۔ بائی کلا کے علاقے میں چھوٹی گاڑی اڈّے کے قریب روک دی گئی اور تمام لوگ باہر اُتر پڑے۔ دو آدمی ایک دوسرے سے اُلجھ گئے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شور مچنے لگا۔ دو کانسٹیبل سیٹیاں بجاتے بھاگتے ہوئے آئے اور لڑنے والوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگے۔ دونوں فسادی ننگی ننگی گالیوں کا آزادانہ تبادلہ کر رہے تھے، باقی آدمیوں نے کانسٹیبلوں کے گرد گھیرا ڈال دیا، اس اثنا میں بڑی گاڑی یہ احوال دیکھے بغیر آگے نکل گئی اور جب تک وہ اڈّے کی گلی سے واپس نہیں چلی گئی، لڑائی جاری رہی اور پھر کچھ تُوتُو مَیں مَیں کے بعد بات صلح صفائی پر آ گئی، کانسٹیبل دونوں جھگڑالو آدمیوں کو تھانے لے جانے پر مصر تھے مگر اُن کے باقی ساتھیوں نے معافی تلافی کرا لی۔ دو آدمیوں کے سوا باقی گاڑی میں سوار ہوئے بغیر آہستہ آہستہ پیدل ہی اڈّے کی طرف چل پڑے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اڈّے پر بھیڑ نہیں تھی، ہم لوگوں کو علیحدہ کر کے مستانہ کے ساتھ تین آدمی تھے۔ مستانہ نے سب کے بازوؤں کا بوسہ لیا اور میرا کندھا خاص طور پر تھپتھپایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ کے سبھی کو پہلے سے تیار کیے ہوئے بھنگ کے پیالے پیش کیے گئے۔

بھنی ہوئی مرغیاں تھے اور کباب تیار تھے۔ مستانہ کی یہ مستانہ روی دیکھ کے کسی نے خوشامدانہ آواز میں کہا، "استاد! ذرا دیدار تو کرادو۔" اُس کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔

"یہ اپن لوگوں کے لیے نہیں ہے اس سے سَو بنائی جائیں گی تو۔ یہ تو کیش ہے،" مستانہ معمول سے زیادہ چہک رہا تھا اُس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استاد! بس ذرا ایک سیکنڈ درشن۔"

"آؤ" مستانہ نے ہاتھ پھیلا کے تمکنی سے کہا۔ "آؤ آؤ سالا! تم بھی کیا یاد کروگے، مر جائیں گا تو سالا یاد کروگے، روؤگے۔" وہ چیخ کے بولا۔

ہم سب اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی چوکی پر بے سُدھ پڑی تھی اُس کے بدن پر ایک چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ مستانہ ڈگمگاتا ہوا اُس کے پاس گیا۔ "بتی جلاؤ۔" اُس نے منہ پر انگلی رکھ کے ہولے سے کہا۔ روشن کمرہ مزید روشن ہوگیا۔ مستانہ نے لڑکی کے پہلو میں بیٹھ کے دھیرے دھیرے چادر ہٹانی شروع کی۔ پھر دفعتاً ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ گندمی رنگ کی ایک پری رُو لڑکی تھی۔ اُس کی عمر ۱۶، ۱۷ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اُس کا چہرہ شائستگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور پورا بدن کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پلکیں لمبی لمبی آنکھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی، بال سیاہ اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے وہ شب خوابی کا جدید لباس پہنے ہوئے تھی۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اُس کی طرف سب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ سب کی آنکھیں گنگ اور زبانیں دنگ تھیں۔ مستانہ نے انگلیوں سے اُس کے رخسار سہلائے اور پھونکوں سے اُس کے گیسو اُڑائے، پھر لوپرے بدن پر سر سے پیر تک احتیاط سے ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں کسی نے منہ سے سیٹی بجا دی۔ مستانہ نے پلٹ کے ہم سب کی طرف غصے سے دیکھا اور جھٹ چادر سے لڑکی کا بدن ڈھانپ دیا۔ "ہٹو۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"ماسٹر قسم سے گرینڈ ماسٹر نے چھوکری اپنے ہاتھ سے بنا لی ہے، ماسٹر تمی لجلجاتی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماسٹر! دل گھبرا رہا ہے، اسے اوپر پہنچا دو ورنہ....."

"چپ رہ۔" مستانہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اسے اوپر پہنچا دو چھوکری تمھاری ماں کی طرح اُس وقت تک یہاں رہے گی جب تک....." مستانہ بولتے بولتے کہیں گم ہوگیا۔

"استاد چھوکری اپن اوپر پہنچاؤں گا۔"

"نئی استاد! یہ لونڈی کا بچہ دس سیر کا بورا بھی نہیں اُٹھا سکتا، چھوکری کو اپن پریم سے اوپر پہنچاؤں گا۔ استاد! ایک چانس دو۔"

"استاد! اپن پہنچاؤں گا، ایک دم فس کلاس....."

سمندر سمندر

بتول فاطمہ کی غواصی

♥ جنگ جیسا اہم اور سنگین معاملہ محض فوج کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ——— چارلس موریس ڈی ٹیری لینڈ

♥ بہترین خدمت کرنے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔ اے ایف شیلڈن

♥ ضرورت کوئی قانون نہیں دیکھتی ——— پبلیس سائرس

♥ جو شخص اپنی عظمت کے گن خود گائے وہ ہرگز عظیم نہیں ہوسکتا۔ آر ایس سرٹیس

♥ نہایت سنگدلانہ جھوٹ خاموشی کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ رابرٹ لوئی اسٹیونسن

♥ دُنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ بیچ کر زندہ رہتا ہے ——— رابرٹ لوئی اسٹیونسن

♥ بیرونی دُنیا کی سیاحت پر جانے والوں کو اپنے ملک کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ معلومات ضرور رکھنی چاہئیں ——— لارنس اسٹرن

♥ دُنیا میں کتنے عجوبے ہیں لیکن انسان سے بڑا عجوبہ کوئی نہیں ہے۔ سوفوکلیس

"آئیں آئیں" مستانہ کی گرج دار آواز سے وہ سب خاموش ہوگئے، کیا لفڑا ہے تم سالا رنڈ چھوکریاں دیکھتا ہے۔ ایک چھوکری بچا نہیں سکتا۔ دھندا کریں گا تم سالا سب کچے ماس کا بنا ہے،" مستانہ باری باری سب پر غصے کی نگاہیں پھینکنے لگا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر ٹک گئی میں الگ تھلگ خاموش کھڑا تھا۔ "ادھر آ سکندرا!" اُس کی آواز میرے جسم میں سن سنا گئی۔ میری ہچکچاہٹ پر اُس نے کرخت لہجے میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ "اِسے تو اوپر لے جائے گا اور تو..... تو" اُس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ جائے گا سلما باہر پہرہ دے گا۔ روم نمبر ۸ میں سمجھا! اب تم سب میرے ساتھ آؤ۔ ڈھائی بج رہا ہے اور وہ چھوکریاں تھک کے سو گئی ہوں گی۔ آج اپن نے تم لوگ کے لیے خاص انتظام کیا ہے۔"

اُس کے اشارے پر میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈال لیا۔ سبھوں کی ہنسی چھوٹ گئی مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش اُٹھائے ہوئے ہوں فہمیدہ کی لاش۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا، میرے پیر لرز رہے تھے میں نے اپنا چہرہ اُس کے کپڑوں سے خشک کیا۔ اُوپر کا راستہ ایک الماری سے گزر کے جاتا تھا۔ وہ صرف بظاہر الماری تھی اور کمرہ کیا تھا، ایک بڑا مچان تھا جس میں نیچے ہولکے لیے فرش پر بنا ہوا چھوٹا سا سلاخوں والا روشن دان۔ لڑکی اگر چیختی تو اُس کی آواز نچلے کمرے تک نہ جاتی۔ لڑکی سے رابطے کا واحد ذریعہ یہ روشن دان تھا وہاں ایک بستر کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف غسل خانے کا تنگ حصہ تھا سلما باہر کھڑا رہا میں نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا اور اُس کے بازو کی چٹکی لے کے اُسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا میں نے اُس کے بال درست کیے، سر کے نیچے تکیہ رکھا اور گردن تک چادر ڈال دی۔ وہ ہوش ہی میں نہیں آئی کہ میں اُس سے کچھ کہہ سکتا۔ میرا ہاتھ خود بخود چاقو پر پہنچ گیا۔ میں اُس کے سینے میں چاقو گھونپ سکتا تھا لیکن یہ بھی نہ کر سکا میرے ساتھ آنے والے آدمی

نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ ہم نیچے آ گئے۔ سلمان نیچے کمرے ہی میں رہ گیا۔ یہ کمرہ چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا اور صحن باہر جانے والے راستے سے دور تھا۔ ایک عقبی راستہ بھی تھا مگر وہ عموماً بند رہتا تھا۔ بس کمرے میں سلمان رہ گیا تھا اُس کے بعد بھی کئی کمرے تھے۔

صحن میں شور مچا ہوا تھا، رنڈیوں کی کلکاریاں، مستانہ کے آدمیوں کے قہقہے۔ ہم دونوں جا کے اُن کے درمیان بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مستانہ کے پہلو میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ جتنے آدمی تھے، اتنی عورتیں نہیں تھیں۔ کوئی تین تین آدمیوں کے پاس ایک ایک عورت تھی۔ مستانہ نے مجھے دیکھ کے ایک مستانہ نعرہ لگایا۔ پھر اُس کے حکم پر میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اچک کے میرے گال کا پیالہ لے لیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اُسے پرے دھکیل دیا مگر میری اس بات پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ "استاد! اسے تو ناتھی کے پاس پہنچا دو۔ وہ اسے ٹھیک کر لے گی۔" اُس نے زنخوں کی طرح نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سُنتا اور دیکھتا رہا، وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ نڈھال ہونے لگے اور عورتوں کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ ایک ایک عورت کے پیچھے تین تین چار چار مرد دوڑے اور واپس نہیں آئے۔ پھر سب چلے گئے۔ مستانہ بھی چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اندازاً ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ کمرے میں چھوڑی ہوئی ہڈیاں، ادھ کھائی بوٹیاں، چادر پر سالن کے دھبے اور پیالے تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کی کچلی ہوئی پتیاں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میرا جسم ایک پہاڑ بنا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کسی دوسرے کے اعضا معلوم ہوتے تھے۔ میں اُٹھ کے باہر آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میں بے آواز چاپوں سے جنھیں صرف میں سُن سکتا تھا، سلمان کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے گردن ڈالے پڑا تھا۔ میں نے صحن کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپ کے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا اور وہیں سانس روکے کھڑا رہا۔ پھر جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں باہر جانے والے تنگ راستے میں آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے قریب کوٹھریا میں چوکیدار رہتا ہے، راستہ روشن تھا۔ چوکیدار کے کمرے میں ایک رسی تھی۔ وہ رسی کھینچنے سے اندر چند کمروں میں ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ گھنٹیاں میری موجودگی میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ دروازہ ایک زنجیر سے بند کیا گیا تھا۔ کنڈے میں لوہے کی بڑی میخ ڈال دی گئی تھی۔ میخ نکالنے اور وزنی کنڈا کھولنے کی آواز سے پہرے دار جاگ سکتا تھا۔ وہ اگر اندر جاگ رہا تھا اور میں گردن آگے بڑھا کے جھانک کے دیکھتا تو کام بگڑ جاتا، چنانچہ میں نے اُسے آواز دی۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا، سٹ پٹا کے بولا۔ "کون ہے؟"

پھر اُس نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ میں نے اُسے چیخنے کی مہلت نہیں دی۔ میری پہلی ہی ضرب سے وہ اپنے پیروں پر قائم نہیں رہ سکا اور سسکاری بھر کے اندر کمرے میں لڑھک پڑا۔ اِس کے باوجود میں نے دو تین ضربیں اور لگانا مناسب سمجھا۔ پھر میں دروازہ بھیڑ کے سن سن کرتے ہوئے پیروں سے واپس آ گیا۔ خاص دروازے کے کنڈے کی میخ نکالنے میں مجھے چند منٹ اور لگ گئے حالانکہ یہ کام سیکنڈوں کا بھی نہیں تھا۔ گلی میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس کوئی اِکّا دُکّا گاڑی گزر جاتی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہاں کھڑے رہنے سے بہتر تھا کہ آگے بڑھ جاؤں۔ آگے ایک چوراہے پر وکٹوریا اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ سب ٹیکسی والے مستانہ کو جانتے ہوں گے مگر میرے پاس چارہ نہ تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو جگایا۔ "یہ نہیں جائیں گا۔" وہ حقارت سے بولا۔

"جتنا روپیہ کہو گے، دوں گا۔" میں نے اُسی کے لہجے میں تیزی سے کہا۔ "باندرے تک جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک شخص بیمار ہے، ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

اُس نے منہ بنایا۔ "کتنا روپیہ دے گا؟"

"بیس روپیہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں اُس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چاقو میں نے ہاتھ ہی میں دبائے رکھا۔ ٹیکسی والے نے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ تیز رفتاری سے مجھے باندرے لے گیا۔ میری جیب میں بیس روپے نہیں تھے اس لیے مجبوراً ٹیکسی راج کرشنا کے بنگلے پر ٹھہرانی پڑی۔ بنگلے کے دو محافظ سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔ انھوں نے بندوقیں کندھوں سے اُتار لیں لیکن جب مجھ پر نظر پڑی تو تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے اُن کے قریب جا کے سرگوشی کی۔ "ٹیکسی والا جانے نہ پائے۔" ایک سپاہی احتیاطاً میرے ساتھ آیا، اُسے میری نیت پر بھی شبہ ہو گیا۔ بجلی کی گھنٹی کی ٹرٹر پر راج کرشنا گاؤن پہنے ہوئے اندر سے برآمد ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں تمنچہ تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اُس نے تمنچہ دور پھینک دیا اور بے قرار ہو کے میرے سینے سے لپٹ گیا۔



سڑکوں پر گاڑیوں کی آمدورفت میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی کہ مستانہ کے اڈے پر جتنے لوگ موجود تھے سب منتقل کر دیے گئے۔ اِدھر سے فون کر کے راج کرشنا روانہ ہوا، اُدھر سے پولیس کی بھاری جمعیت پہنچی۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور دروازہ کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ راج کرشنا نے مجھے اپنے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ جب میں دو سپاہیوں کی مدد سے

لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال کے لا رہا تھا تو میرے پیر بار بار زمین سے اکھڑ جاتے تھے۔ میں نے کسی کو اُس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اب وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، میں نے اُسے تسلی دی کہ "روؤ نہیں" تم اپنے گھر واپس جا رہی ہو۔" پولیس افسران تفتیش کے لیے اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کی کہ "وہ سیدھی گھر جائے گی" اس سے پہلے کہ پاس پڑوس والوں کو خبر ہو۔" میں نے کسی کو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ نہ اُسے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا۔ اُسے گھر پہنچاتے وقت، میں اُس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا، مجھ سے اُس کے گھر والوں کے چہرے نہ دیکھے جاتے۔

راج کرشنا کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ خود راج کرشنا بائی کلا ہی میں رہ گیا کیونکہ ابھی اُسے وہاں موقع پر مزید گرفتاریاں کرنے اور کئی عمارتیں سیل کرنے کا حکم دینا تھا اور یہ کام خاص طور پر اپنی نگرانی میں انجام دلوانا تھا۔ راج کرشنا جلد سے جلد میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہوگا مگر بائی کلا میں مستانہ کے اڈے کے بعد جو کام اُسے کرنا تھا، وہ اس سے زیادہ اضطراب کا تھا اسی لیے وہ وہاں ٹھہر گیا اور مجھے اُس نے گھر روانہ کر دیا۔ گھر آ کے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے راج کرشنا کے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے، کپڑے بدل کے کچھ سکون ہوا، جیسے کپڑے پہنے نہ ہوں بلکہ پی لیے ہوں۔ پھر میں نے کرسی کی پشت سے کمر ذرا لگائی تھی کہ مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

راج کرشنا شام سے پہلے گھر نہیں آ سکا اور جب آیا تو اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے پاس آ کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اندر ہی اندر دعا کرتا رہا، کاش کرشنا وہ لفظ خود تک محدود رکھے جن کی ادائی کے لیے اُس کے سینے پر بوجھ ہوگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ نہ اُس نے کچھ بات کی، نہ میں نے۔ ہم دونوں بس ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے اور میں اپنی انگلیوں سے مختلف چیزوں مختلف جانوروں کی شکلیں بناتا رہا پھر میں نے ہی ابتدا کی کیونکہ سکوت ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں نے بہت ہلکی آواز میں اُس سے پوچھا "سب کام ٹھیک تو ہوا؟"

"ہاں۔" وہ ایک لمبی آہ بھر کے بولا "سب ٹھیک ہو گیا۔"

"اب.. اب تو کہیں نہیں جانا؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"نہیں، اب شاید نہ جانا پڑے یا شاید جانا پڑ جائے۔" اُس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا پھر چُپ ہو گیا۔

"کپڑے بدل لیجیے۔" میں نے ڈرڈر کے زیرِ لب کہا۔

"ہونہہ۔" وہ اپنے گال رگڑتے ہوئے بولا "تمھیں تو اب کہیں نہیں جانا؟" اُس کے لہجے میں نہ تلخی تھی، نہ طنز تھا۔ البتہ شکایت تھی۔

"نہیں اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے دبلے دبلے لفظوں میں کہا۔

مجھ پر صبح سے گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ گھر آنے کے بعد بہت سی باتیں کہے گا، بہت سی باتیں پوچھے گا اور میں اسے ساری باتیں کس منہ سے بتاؤں گا۔ میں نے تو خود ہی ان باتوں کا دروازہ کھولا ہے اب اسے بند کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں اچانک وارد ہوا تھا تو میں نے اسے یہ سب کچھ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ اس وقت وقت بھی کم تھا، ہمیں روانہ ہونے کی جلدی تھی کیونکہ لمحوں میں اندھیرے کا پردہ چاک ہو جاتا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ وہ ایک با اصول شخص تھا۔ پورے سولہ دن اچانک غائب رہنا اور آنا تو اس انداز سے آنا، یہ سب کچھ اس جیسے ذہین شخص کے سوچنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اب کچھ بھی ہو مستانہ کے ہاں خلاف توقع دیر ہو گئی تھی، مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے، میں سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں واپس آجاؤں گا اور اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ معاملات کسی اور طرح اس کے گوش گزار کر دوں گا۔

"آپ نے میری بات کا خیال رکھا۔" میں نے اس سے نگاہیں ملانے کی ناکام کوشش کی۔ صبح میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا نام کہیں استعمال نہ کرے۔

اس نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ سب کیا ہے؟" آخر اس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ وحشت سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں ڈارلنگ! میں پاگل ہو سکتا ہوں۔" وہ تقریباً چیختا ہوا بولا۔ "میری مدد کرو، میرے دماغ پر پانی ڈالو۔"

"دیکھیے۔" میں نے جھجکتے جھجکتے التدعا کی۔ "اب آپ کچھ نہ پوچھیں اور کسی قسم کا تردد نہ کریں تو اچھا ہے، میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "جانتے ہو اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے؟ آج کے دن پر مجھے یقین نہیں آتا، کسی کو بھی یقین نہیں آتا، وہ حیران ہو ہو کے مجھ سے پوچھتے تھے کہ رشنا جی! یہ کیا ہوا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے ابھی وہاں اور ٹھہرنا چاہیے تھا مگر میں اُن کی نگاہوں سے بچ کے یہاں بھاگ آیا۔ شہر بھر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ وہ سب اندر چلے گئے ہیں اور اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہم نے تمہارے بتائے ہوئے تمام ٹھکانے آزمائے۔ ہم نے کسی کو بھی سنبھلنے اور بھاگنے کی فرصت نہیں دی۔ شہر کے معزز ترین لوگ اس میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم یہاں سکون سے کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا دماغ معطل ہو چکا ہے، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنا سنگین معاملہ تھا اور اب کس قدر اہم ہو گیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا خون ہو چکا تھا۔ یقیناً پولیس کا ایک گروہ بھی اُن کی پشت پناہی کرتا ہوگا۔ جعلی دولت سازی، زیر زمین منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ۔ اُف!" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "نہ جانے ابھی اور کیا کیا انکشافات ہوں۔ دوپہر گورنر نے ذاتی طور پر مجھے مبارک باد دی ہے۔ مجھ سے شکریے کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں کہا گیا۔ رات ہی پولیس افسروں سے اس معاملے میں میری بات ہو رہی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ جعلی کرنسی بائی کلا کے علاقے سے آرہی ہے مگر کہاں سے۔ ہم نے اس علاقے کی چند ممتاز مشتبہوں کے ناموں پر سُرخ دائرہ بنا دیا تھا مگر شواہد ناکافی تھے اس لیے اُن پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا، میں اپنے ساتھی افسروں سے بار بار جھگڑتا تھا کہ ہمیں کسی کا لحاظ کیے بغیر اچانک چھاپا مار دینا چاہیے مگر وہ ڈرتے تھے۔ مجھے فون پر دھمکیاں دی جارہی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ فوراً ممبئی سے نکل جاؤ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اوپر سے سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہی معاملے نمٹانے کے لیے ممبئی میں میرے قیام کی مدت بڑھائی گئی تھی حالانکہ شہر کے کئی پولیس افسر ایک باہر کے آدمی کی مداخلت پر سُبکی محسوس کرتے تھے مگر اچانک — اچانک صبح تم آگئے۔ اس سے پہلے شہر کا ایک اور گروہ ختم کرنے میں بھی تم شامل تھے، اب بھی تم تھے۔ میری رہبری کرو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "ورنہ میرا ذہن بھٹکتا رہے گا۔ پولیس والے کا ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا مگر ڈارلنگ! میں عہد شکنی کرتا ہوں، مجھے معاف کر دو۔" اس نے شدت سے کہا اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ بھی نہیں، ذرا سی بات ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے دو چار داؤ پیچ آتے تھے، آپ نے ریل میں خود اس کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ انہیں ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں سولہ دن وہیں اُن کے ساتھ رہا اور واپس آگیا۔ ممکن ہے میں اُن کے ساتھ دو چار روز اور گزارتا اگر وہ لڑکی لے کے نہ آجاتے۔ اس طرح میرا فوراً نکلنا ضروری ہو گیا۔ اس وقت تک میں آپ کو بتانے کے لیے اُن کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم وہاں گئے کیوں؟" وہ جز بز ہو کے بولا۔

"آپ پریشان جو تھے۔" میں نے فون پر آپ کی گفتگو سن لی تھی۔ اس دن میٹنگ میں آپ لوگ اس معاملے پر بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے، میں نے سوچا، ایک کوشش کر دیکھوں مگر وہاں دن زیادہ لگ گئے۔ ویسے بھی میں ایک بے کار آدمی تھا، خالی بیٹھے رہنے سے کوئی کام کر لینا ہی ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ کام!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ میں سولہ دن پریشان ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار کے بعد تمہاری کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔"

"مجبوری تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر تم... تم اتنی جلدی وہاں قبول کیسے کر لیے گئے؟"

"شاید میری صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "میں انھیں اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی نظر آیا ہوں گا۔ خود میں نے بھی انھیں یہی جتانے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اُن کے دو چار آدمیوں کو زمین پر بٹھا دیا تو انھیں میری ضرورت کا احساس ہوا لیکن اب میں یہاں آ گیا ہوں۔" راج کرشنا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑکتے رہ گئے۔ مجھے اپنے لہجے پر شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اب کہیں نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا۔" میرے اصرار پہ وہ تھکے ہوئے انداز میں اُٹھ گیا اور نہا دھو کے کسی قدر ترو تازہ نظر آنے لگا، پھر بھی اُس کی بھوؤں کے درمیان کی جگہ سکڑی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس افسران آ گئے۔ اُن سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ انھوں نے صبح مجھے راج کرشنا کے ساتھ مستانہ کے اڈے پر سرگرم دیکھا تھا۔ میں لڑکی کو اُن کے سامنے اُٹھا کے نیچے لایا تھا۔ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ممکن ہے مستانہ اور اُس کے ساتھیوں نے بازپرس کے دوران میں مجھے بُرا بھلا کہا ہو۔ ہر چند راج کرشنا نے مستانہ اور اُس کے ساتھیوں کو یہ تاثر دینے کی احتیاط کی تھی جیسے میں بھی اُن کے ساتھ پھنس گیا ہوں۔ حوالات میں بھی انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ میری خواہش پر سب سے پہلے لڑکی بازیاب کی گئی تھی تاکہ اُسے کسی قسم کی زک پہنچنے کا احتمال نہ رہے مگر راج کرشنا کی یہ احتیاط بے معنی تھی۔ مستانہ اور اُس کے آدمیوں کو جلد یا بدیر اس نتیجے پر پہنچنا ہی تھا کہ وہ بے وفا کون شخص ہو سکتا ہے اور پولیس افسران کو بھی معلوم ہونا تھا کہ راج کرشنا کی معلومات کا ذریعہ کون سا تھا۔ وہ سب میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ اُن کی خواہش راج کرشنا کی توقع سے مختلف نہیں تھی کہ میں انھیں بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔ مگر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور راج کرشنا کے بنگلے پہ رات کو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر نہیں ہے کوتوالی ہے۔

ناشتے کی میز پر صبح کے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ تمام کے تمام انگریزی کے تھے۔ میں نے جان بوجھ کے ہاتھ نہیں لگایا۔ راج کرشنا سر جھکائے انھیں پڑھتا رہا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے۔ اخباروں نے جو کہانیاں لکھی تھیں، اُن میں سے بہت سی میرے لیے بھی نئی تھیں۔ اخبارات نے شہر کی اُن شخصیتوں کے نام چھاپنے سے گریز کیا تھا جنھیں آگے پیچھے گرفتار کیا گیا تھا لیکن روداد پوری چھاپی تھی۔ کہاں کہاں کیا کیا ملا، سکوں کی ڈھلائی، نوٹوں کی چھپائی، شراب اور دیگر منشیات کا ذخیرہ۔ جہاں جہاں یہ ذکر تھا، وہاں ہر جگہ راج کرشنا کا نام موجود تھا۔ اُس کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں لکھی گئی تھیں،

اُس نے اب تک کتنے گروہوں کو عُریاں کیا اور پولیس میں اُس کی خدمات کا کتنا بڑا ریکارڈ ہے۔ ایک اخبار نے "ایک سچا پولیس مین" کے عنوان سے راج کرشنا پر مختصر مضمون بھی چھاپا تھا۔

اُس کے بارے میں اگلے پچھلے اتنے بہت سے واقعات پڑھ کے مجھے کمرے میں حبس سا محسوس ہوا۔ یہ تو دو واقعات تھے جو میرے سامنے پیش آئے۔ اس سے پہلے راج کرشنا کی پوری زندگی جُرم کُشی میں گزری تھی۔ مجرموں کے لیے اُس کا نام تازیانہ تھا۔ اگر کسی موقع پر راج کرشنا کو یہ معلوم ہو گیا کہ اُس کے ساتھ رہنے والا آدمی بھی تین قتل کرنے کے الزام میں سات سال جیل میں گزار کے آیا ہے اور یہ سزا کاٹنے کے بعد بھی اُس نے بس نہیں کیا بلکہ بدھ گیا میں ایک شخص کو چھرا مار کے ختم کر دیا۔ کلکتے میں چاند میاں اور موجمدار جیسے بدمعاشوں کو چاقو مار کے ہلاک کر دیا اور اُس کا تعلق کلکتے کے مشہور آدمی تھّل سے رہا ہے، اُس کی بہن کوٹھے پر ناچتی تھی اور اُس کے گھر کے باقی آدمیوں کا کچھ اتا پتہ نہیں ہے، وہ سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک کم سن لڑکی کو گھر سے لے کے فرار ہو گیا تھا۔ اگر راج کرشنا کو یہ ساری باتیں یا اِن میں سے کوئی ایک بات معلوم ہو جائے تو اُس کے ذہن پر کیا اثر ہو گا؟ اگر وہ میرا خیال کرے گا تو اُس کے اُصول مجروح ہوں گے۔ اتنی عمر سچائی کی گزارنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنا، جھوٹ سہنا پڑے گا۔ میں نے پہلے ٹھیک فیصلہ کیا تھا، مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، میں خود وضاحت بھی نہیں کر سکوں گا کہ یہ سب مجھ سے کیوں ہو گیا۔ مجھ سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ میں نے آپا جان اور اتی پر شبہ کیا کہ وہ کورا کو کہیں باہر نہ نکال دیں اس لیے میں کورا کو وہاں سے لے کے چلا آیا تھا۔ اگر میں وہیں بیٹھا اُن سے رٹتا رہتا تو شاید وہ میری بات مان لیتے اور کورا کو گھر میں رکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کیسے رکھتے اور میں نے کیا غلطی کی۔ جب تک کورا رہی اُسے اُوپر چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا تاکہ محلّے والوں سے کب تک چھپا کے رکھا گیا تھا تاکہ محلّے والے اُسے
والے اُسے نہ دیکھ سکیں، اُسے رشتے داروں اور محلّے والوں سے کب تک چھپا کے رکھا جا سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اُس کا راز فاش ہونا ہی تھا۔ میں اسے غلطی نہیں کہتا کہ مجھے کورا کا خیال ترک کر دینا چاہیے تھا۔ میں اُسے بمبئی گیا چھوڑ آتا یا آپا جان کی خواہش پر تھانے میں رپورٹ درج کرا دی جاتی، میں مر جاتا مگر مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا۔ سو جو کچھ ہوا، اُس میں میری مرضی کہاں شامل تھی۔

میں نے قلم اُٹھایا اور کاغذ پر راج کرشنا کے نام خط لکھنا شروع کیا، کوئی لقب سمجھ میں نہیں آیا، میں قلم ہاتھ میں رکھے رکھے سوچتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے نیچے اپنا نام لکھ دوں مگر کون سا نام؟ بابر لکھوں، ظہیر خاں لکھوں، لاڈلا لکھوں، فقیرا لکھوں، سکندرا لکھوں، شہزادہ لکھوں، کیا لکھوں اور جاؤں گا کہاں؟ زرّیں کے پاس کہ وہ میرے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی ہے اور میرے لیے دعائیں کر رہی ہو گی، میری زرّیں، پتہ نہیں وہ اکیلی رہ گئی ہے یا تھّل ابھی تک اُس کے پاس موجود ہے۔ میں زرّیں کے پاس جا کے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاؤں گا مگر وہ جب سامنے آتی ہے تو کورا کی یاد آتی ہے اور دل ہولنے لگتا ہے۔ تو جب تک بن رہی ہے، راج کرشنا کے پاس ہی کیوں نہ ٹھہرا رہوں۔ فہمیدہ کے پیروں میں گھنگرو دیکھ لیے، اُس کے حُسن کے بارے میں تماش بینوں کے تبصرے سُن لیے تو اب راج کرشنا کی آنکھیں دیکھنے اور باتیں سُننے سے کیا اثر پڑتا ہے۔



شام کو گھر واپس آ کے راج کرشنا اِس کی معذرت کرنے لگا کہ مجھے دن بھر تنہا گھر میں رہنا پڑا اور وہ مجھے خیریت کا فون بھی نہ کر سکا۔ وہ کچھ مطمئن مطمئن خوش خوش لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے خیال سے اپنے چہرے پر جبری خوش حالی طاری کی۔ اُس نے مجھے فی الفور لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی، وہ میرے لیے نئے سوٹ لے کے آیا تھا جس کے ناپ پہلے دن درزی نے لیے تھے۔ میری ٹائی کی گرہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے درست کی۔ جدید وضع کے اس لباس میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ "ایک دم فرسٹ کلاس"۔ وہ مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ "اے جنٹلمین پرفارمینس"۔ وہ گفتگو میں بار بار انگریزی بولنے لگتا تھا پھر اُسے میرا خیال آتا تھا تو فوراً زبان بدل دیتا تھا۔

ہماری گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی، اُس کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا، خاصی دُور جا کے شاہی محلات کے طرز کی ایک شاندار عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے راج کرشنا کے ساتھ قدم ملانے میں دشواری ہوتی۔ وہ ایک ایک قدم ناپ تول کے اُٹھا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ پگڑی والے ایک دربان نے جھک کے راج کرشنا کو سلام کیا، مجھے بھی کیا۔ میرے ہاتھ خود بخود مصافحے کے لیے اُٹھ گئے پھر ٹھٹک کے رہ گئے۔ راج کرشنا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ میں بھی تیز قدموں سے اُس کے برابر ہو گیا۔ ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دھیما دھیما سا شور تھا، عورتیں مردوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ راج کرشنا کی آمد پر ہال میں ایک سناٹا چھا گیا پھر کئی لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے اور زور زور سے مصافحے کرنے لگے۔ کسی نے اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے اُسے گلے لگا لیا۔ راج کرشنا مہذب انداز میں سب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں اُس کے ساتھ تھا۔ "میرا چھوٹا بھائی ظہیر خاں"۔ اُس نے لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت اُبل پڑی۔ "آپ کا بھائی؟" کسی نے تعجب سے پوچھا۔ راج کرشنا نے سر اُٹھا کے کہا۔ "ہاں میرا بھائی، میرا دوست، میرا بیٹا"۔ لوگ مسکرا مسکرا کے خاموش ہو گئے۔ پھر اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا، رستم جی تھے۔ وہی رستم جی جو پہلے دن ریستوران میں ملے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی بھی تھی۔ "میں

نورین ہوں۔" اُس نے شوخی سے کہا۔

"مجھے..... مجھے آپ کا نام معلوم ہے۔" میں نے سٹ پٹا کے جواب دیا۔

"ہائیں۔" وہ جھلملاتی ہوئی نظروں سے بولی۔ "میں سمجھی کہ آپ میرا نام بھول گئے ہوں گے۔ آپ دونوں کو اُس دن کے بعد سے آج دیکھا ہے۔"

"فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"پاپا بتا رہے تھے کہ کل آپ لوگوں نے بہت بڑے بڑے مجرم پکڑے ہیں، دیو جیسے۔ مجھے تو کپکپی آگئی۔ پاپا نے مجھے اخبار بھی دیا تھا مگر مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔"

"میں نے نہیں کرشنا جی نے پکڑے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"دو باتیں ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"چلیئے دو سہی۔" اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت کھِل کھِلا پڑے۔

راج کرشنا لوگوں کے درمیان اس قدر گھر چکا تھا کہ میری طرف توجہ نہیں دے سکا۔ وہاں زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ میں وہاں کے طور طریق سے بالکل نا آشنا تھا جب نورین نے مجھے اپنی میز پر لے جانے کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان کسی اجنبی لڑکی کا ہاتھ تھام کے گھومنا پھرنا میرے لیے عجیب سی بات تھی مگر وہاں مردوں اور عورتوں میں ایسا کوئی تکلف نظر نہیں آ رہا تھا،

مجھے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا۔ میں نے جھٹ اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اُس کے ساتھ جا کے ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ "کچھ کھیلیں گے؟" اُس نے مجھے متجسس نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر کن چیزوں سے دلچسپی ہے آپ کو؟"

میں اُس کے سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"کسی نہ کسی چیز سے تو ہوگی؟"

"نہیں۔"

"یعنی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"حیرت ہے۔" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کھانے کون کون سے پسند ہیں؟"

"جو مل جائیں۔ ویسے مجھے میٹھے چاول بہت پسند ہیں۔"

"میٹھے چاول۔" وہ ہنس پڑی۔ "اور لباس کون سا؟"

"سبھی۔" میں نے اُکتا کے کہا۔ "آپ ایسے سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"پھر ہم کیا باتیں کریں؟" وہ چونک کے بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے اپنے شانے اچکائے۔ "کیا میں اچھی باتیں نہیں کرتی؟"

"نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی اچھی کرتی ہیں مگر... مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی چھوتے ہوئے کہا۔ "ٹمپریچر تو نارمل ہے۔ اوہ۔" اُس کے چہرے سے گھبراہٹ دُور ہوئی۔ "آپ کو اپنی زمینیں یاد آرہی ہوں گی؟ سب کھُلا ہی کھُلا، ہریالی ہی ہریالی۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"اور آپ کو کرشنا جی روکے ہوئے ہوں گے۔ اچھا ہے، مجھ سے ملیں گے تو میں کہوں گی، آپ کو ابھی اور روکیں۔"

"کیوں؟ آپ کو کیا مزہ آئے گا؟"

"پھر آپ بہت دنوں بعد جب اپنے گھر جائیں گے تو آپ کو اپنی پُرانی چیزیں نئی معلوم ہوں گی اور آپ پہلے سے زیادہ سکون محسوس کریں گے۔"

"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"آپ کچھ اُداس اُداس رہتے ہیں۔"

"نہیں تو۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"باتیں بھی کم کرتے ہیں حالانکہ اُس دن کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ آپ جب باتوں پر آتے ہیں تو سب کو خاموش کر دیتے ہیں، آپ کا موڈ بھلا کب ایسا ہوتا ہے؟"

"موڈ کا پتہ کیسے ہوتا ہے۔"

"اگر آپ کا جی گھبرایا کرے تو آپ ہماری طرف آجایا کیجیے۔ پاپا کی کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں، اُن کے دو جہاز بھی ہیں، جب اِدھر ساحل پر ہوتے ہیں تو ہم چند روز وہیں رہتے ہیں۔ اب جہاز آنے ہی والا ہے، اس بار آپ بھی ساتھ چلیے گا۔ ہم ساحل سے بہت دُور رہیں گے۔ ہیں نا! کیسا پروگرام رہے گا۔"

"بہت اچھا رہے گا۔" میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ راج کرشنا ہماری طرف آگیا۔ اُس نے مجھے نورین کے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا، یہ سوچ کے مجھے جھینپ آنے لگی۔

"شکریہ نورین کہ تم نے ان کا خیال رکھا۔" کرشنا نے کہا۔ اُس کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بینڈ باجے والوں نے ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اور مرد ہال کی خالی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں، میں نے کتابوں میں پڑھا تو تھا کہ لوگ اس انداز سے رقص کرتے ہیں۔ "آئیے میرے ساتھ رقص کیجیے۔" نورین نے اشتیاق سے کہا۔

"تم آج کیوں رقص کر رہی ہو؟ رقص تو روز ہوتا ہے اور تم گم سُم بیٹھی دیکھتی رہتی ہو۔ آج کیا بات ہے؟" کرشنا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"آج۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "بس آج جی چاہ رہا ہے، آؤ۔"

اُس نے میری جانب ہاتھ پھیلایا۔ میں نے بے چارگی سے راج کرشنا کو دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" کرشنا نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر تھرکنے لگے۔ میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ یقیناً میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ سازندے دھن بدل لیتے تو کبھی رقص میں تیزی آجاتی کبھی مندی، مرد عورتیں بدل دیتے اور عورتیں مرد بدل دیتیں لیکن وہ سب سنجیدہ تھے، بہت شائستہ۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی اوچھی بات نہیں کی، نہ کوئی فقرہ کسا، نہ سیٹی بجائی۔ شوجی جان اور شبہ پارہ وغیرہ کے رقص کے دوران میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ بھی میں نے سُنی تھیں۔ رقص کے بعد کھانے کی میزوں پہ کھانا چُن دیا گیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے کھانے سے پہلے انگریزی میں اعلان کیا کہ کلب کے معزز ارکان کی خواہش کے مطابق آج کی رات کلب کے ریکارڈ میں مسٹر راج کرشنا کی رات کے طور پر درج کی جائے گی۔ کلب کے معزز ارکان کی درخواست ہے کہ مسٹر راج کرشنا شہ کرسی پر تشریف لائیں۔" اعلان کرنے والے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "مسٹر راج کرشنا نے اس شہر کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، یہ کلب کی طرف سے اُن کے اعتراف کا ایک حقیر اظہار ہے۔ اِس سلسلے میں کلب مسٹر راج کرشنا کے اعزاز میں ایک رسمی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تقریب کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔ تمام بہترین خواہشات راج کرشنا صاحب کے لیے، بمبئی کے معززین انھیں خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔" ایک بار پھر ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

نورین میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔ "کلب میں یہ اعزاز بہت دنوں بعد کسی کو ملا ہے۔" راج کرشنا آنکھیں بند کیے، سر جھکائے ہمارے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نورین نے اُسے ٹوکا کہ اُس کے لیے شہ کرسی خالی پڑی ہے اور سب لوگ منتظر ہیں۔ واقعی سب لوگ منتظر تھے۔ راج کرشنا سے دوبارہ بہ آوازِ بلند درخواست کی گئی۔ راج کرشنا جھجکتا ہوا اُٹھا اور آہستہ قدموں سے شہ کرسی پہ جا کے بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کھڑے ہو کے تالیاں بجاؤں۔ میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ میں اکیلا کھڑا تھا اور پشیمانی سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ راج کرشنا کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اُس نے چاروں طرف سر گھمایا، پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ اُس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ "خواتین و حضرات! اس اعزاز کا شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" اِس

کی آواز بہک رہی تھی۔ "یہی باتیں، یہی احساسات کام کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے کبھی ستائش کے خیال سے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا تھا مجھے خوشی ہے کہ اُسی پہ کاربند ہوں۔ ایک یہی مقصد، یہی جذبہ میری رہبری کرتا رہا ہے۔ آج کے واقعات کے بارے میں آپ میری زبانی کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے مگر یہ ایک مناسب موقع نہیں ہے۔ میں۔ میں۔" اُس کا گلا رُندھنے لگا اور آواز لڑکھڑا گئی۔ "آج کے واقعات کے لیے آپ نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے میں اصل میں اُس کا مستحق نہیں ہوں۔" یہ کہہ کے وہ رُک گیا ہال میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ سب ٹکٹکی باندھے راج کرشنا کو دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں خون جم گیا تھا۔ "کل کے واقعے کے تمام اعزاز کا مستحق میرا عزیز ظہیر خاں ہے۔ وہ وجیہہ اور دل کش نوجوان جو پہلی قطار میں منہ چھپائے بیٹھا ہے، یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور نہ آپ براہِ مہربانی تفصیل پوچھنے کے لیے اصرار کریں۔ اس شہ کرسی پر بیٹھنے کا سزاوار ظہیر خاں ہی ہے، میں اُس کے لیے اپنی نشست خالی کرتا ہوں۔"

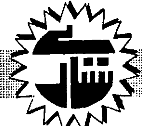
پہلے تو ہال میں جیسے سارے لوگ آوازوں سے محروم ہو گئے پھر دفعتًا ایک شور گونجا۔ نورین بے طرح مجھے جھنجوڑنے لگی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ سب سے بڑی مشکل مجھے اپنا رویّہ متعین کرنے میں پیش آئی۔ عقل جواب دینے لگی کہ اس موقع پر کس تاثر کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اصولاً راج کرشنا کو یہ تاثر دینا چاہیے تھا کہ اُس نے میرے بارے میں جو کہا ہے، وہ میں نے انگریزی میں ناواقفیت کے سبب سے نہیں سنا ہے اور اگر میں اسی طرح بُت بنا بیٹھا رہتا تو اِن پڑھے لکھے معزز لوگوں کے سامنے راج کرشنا کی توہین ہوتی کہ وہ اپنے جس عزیز کو اتنی عزّت دے رہا ہے، وہ ایک جاہل شخص ہے۔ میرا دل جھٹکے کھانے لگا اور جسم کی تمام طاقت خاک ہونے لگی مجھے ایسا لگا جیسے میں مٹی کا پتلا ہوں اور ابھی ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میری یہ گنگ کیفیت انکسار پر محمول کی گئی، ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں پھر راج کرشنا ہی نے میرے اوسان بحال کیے۔ اُس نے اردو میں مجھے آواز دی "ظہیر خاں! ادھر آؤ اور یہ کرسی سنبھالو۔"

سب لوگوں کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، میری ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش پر۔ نورین نے مجھے زبردستی اٹھا دیا اور میں اٹھنے کو تو اُٹھ گیا مگر راج کرشنا تک پہنچنے کا گزوں کا فاصلہ میلوں برابر ہو گیا۔ ہر قدم پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا لپکتا رہا، بجلی تڑختی رہی۔ ہال سے نکلنے کے کئی دروازے تھے، یک بارگی میرے جی میں آیا کہ بس یہاں سے فوراً بھاگ نکلوں، راج کرشنا کا یہ مذاق بہت ستم ناک ہے مگر کرسی کے قریب راج کرشنا مجھے لینے آ گیا۔ اُس نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے کسی قدر توانائی محسوس ہوئی لیکن شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جب میں اُن سب کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے کسی کی شکل صاف نظر نہیں آئی۔ وہاں ہیولے بیٹھے ہوئے تھے اور سارا ہال لرز رہا تھا۔ دیواریں مجھ پر گری پڑ رہی تھیں اور میں فرش میں دھنسا جا رہا تھا۔ میرے سارے حواس منتشر منتشر ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا۔

یقیناً لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب میں اپنی زبان سے کچھ کہوں گا مگر کسی کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ کچھ کہتا بھی۔ میری زبان پر تو فالج گر گیا تھا۔ راج کرشنا خود اُٹھ کھڑا ہوا۔ "خواتین و حضرات مجھے اندازہ ہے کہ آپ ظہیر خاں کی زبانی کچھ سننے کے مشتاق ہوں گے۔ میری بھی یہی خواہش ہے مگر میں آپ سے درخواست کروں گا۔" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ "کہ یہ ایک موزوں وقت نہیں ہے یہ گفتنی ناگفتنی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اُس نے میرا بازو کھینچ کے مجھے جلدی سے اٹھا لیا۔ "میں اپنی اور ظہیر خاں کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آئیے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" راج کرشنا نے سب کے سامنے سر جھکایا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی اور جب اُس نے آخری مرتبہ شکریہ ادا کیا تو میں نے اُس کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش بھی کی۔ میری آواز تالیوں میں ڈوب گئی۔ میرے حواس کچھ کچھ درست ہونے لگے تھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میرے دل میں کچھ بولنے کی خواہش اُبھری لیکن ہمّت نہیں پڑی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنی نشستوں سے اُٹھ گئے تھے اور میرے اردگرد اژدہام ہو گیا تھا۔ راج کرشنا پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آج کے واقعے کے بارے میں اُس سے کسی قسم کی تفصیل طلب نہ کی جائے چنانچہ لوگ پُراسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ نورین کے رخساروں پر سرخی دیکھ کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے کوئی ایسی نمایاں بدتہذیبی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ میں شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جو کچھ اپنے اندر، اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا شکر ہے کہ اُس کی خبر لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ راج کرشنا نے بہت خوش اسلوبی سے بات نبھالی تھی اور وہی تھا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک بُرا وقت ٹل گیا۔

سب لوگ کھانے کی میزوں پر آ گئے۔ لوگوں کی ہمّت افزا باتیں سُن کے اور تجسس شناس نگاہیں دیکھ کے میری حالت کہیں معمول پر آئی۔ نورین اب بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی اُس بڑی میز کے اطراف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد اُس ماحول سے میری اجنبیت کسی حد تک ضرور دور ہو گئی۔ لوگ مشروبات پی رہے تھے اور پورے ہال میں بے ترتیبی ہو گئی تھی۔

سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے تھے۔ کئی عورتیں اور کئی



☆ وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا لہٰذا آج "بڑے گھر" چلا گیا۔

☆ وہ سفر کے دوران میں بات بے بات مُسکراتی رہی کیونکہ اس کے مُسکرانے سے رُخساروں میں ایک دل آویز گڑھا پڑ جاتا تھا اور یہ بات اُسے اچھی طرح معلوم تھی۔

☆ کسی میلے میں ایک لڑکی لڑکوں کے غول میں گھر گئی۔ اُس نے زمین پر قدم رکھے بغیر ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا۔

☆ اُس نے تین شادیاں کیں اور اُن کے جملہ جہیز سے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کر دی۔

☆ وہ کہتا تھا کہ "اگر تم نے بے وفائی کی تو میں خودکشی کر لوں گا"۔ جب اُس کی محبوبہ کی شادی کسی اور سے ہونے لگی تو اُس نے محبوبہ کی ناک کاٹ لی۔

مرد پھر ناچنے لگے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے فرش پر رینگ رہے ہوں یا کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ راج کرشنا نے مجھ سے چپکے سے پوچھا "کہو تو چلتے ہیں؟"

"ہاں"، میں نے تیزی سے کہا "چلیے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے"۔

اپنے پاس بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے راج کرشنا نے مصروفیت کا عذر کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ نورین کہنے لگی کہ مجھے وہ یہیں چھوڑ جائے پھر رات کو کسی وقت وہ مجھے گھر پہنچا دے گی۔ راج کرشنا نے اُس کی فرمائش مسترد کر دی۔ نورین کا چہرہ بجھ گیا اور وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئی۔ جن جن میزوں کے درمیان سے ہم گزرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے مگر آخری میز سے پہلے والی میز سے گزرتے وقت مجھ سے آگے نہیں بڑھا گیا۔ وہ ۳۰، ۳۵ سال کی ایک صحت مند، خوبصورت اور خوش لباس عورت تھی جو اپنی کرسی سے اُٹھ کے ہمیں وداع کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے راج کرشنا کو پرنام کیا پھر مجھے، میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی جانب میری نگاہ کے ارتکاز سے اُس کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنی ساڑی درست کی۔ اُس کا بدن سمٹنے لگا مگر میری نگاہ متزلزل نہیں ہوئی۔ راج کرشنا نے بھی میرا یہ انہماک دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھنے کے بجائے عورت سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس طرح عورت راج کرشنا کی جانب متوجہ ہو گئی اور مجھے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جب نورین نے مجھے آگے کی طرف کھینچا تو مجھے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا اور میں ندامت سے آگے بڑھ گیا۔ میرے چلتے ہی راج کرشنا نے بھی اُس عورت سے باتیں بند کر دیں اور ہمارے پاس آ گیا۔ دروازے پر ایک بار پھر میں نے گھوم کے اُسے دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی اُس نے نگاہیں جھکا لیں، میں بھی سٹ پٹا گیا۔ نورین نے ہمیں رخصت کرتے وقت بہت سے وعدے لیے، نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ وہ واپس اندر چلی گئی اور ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے سوچا میں راج کرشنا سے اُس عورت کے بارے میں پوچھوں جو آخری میز سے پہلے والی میز پر ملی تھی۔ راج کرشنا جیسے میرے دل میں گھسا بیٹھا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم اُس عورت کو جانتے ہو؟"

"نہیں"، میں نے بے قرار لہجے میں جواب دیا "وہ کون ہیں؟"

"وہ ایک ستم رسیدہ عورت ہے، بہت مال دار۔ ابھی ایک سال ہوا اُس کا شوہر ایک حادثے میں مارا گیا مگر تم اُسے اس طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا "کیا تمھیں وہ عورت اچھی لگی؟"

"نہیں"، میں نے جھینپ کر کہا "ایسی بات نہیں ہے بات کچھ اور تھی"۔ میں نے ایک بار پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا ٹٹول کے دیکھی۔

"مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"میں۔۔۔ میں" میری زبان ہکلانے لگی "کیا آپ اُس عورت سے کوئی بات پوچھ سکتے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے کہیں یہ بُری بات تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں" اس نے مسکرا کے کہا۔ "پولیس والے ہر قسم کا سوال کر لیتے ہیں"۔

میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُسے بتاؤں یا خاموش رہوں۔ میں نے سوچا یہ ایک باریک بین آدمی ہے، بات سے بات نکال لے گا لیکن تسلی کیے بغیر میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی اس لیے میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"اُس عورت کے گلے میں جو ہار ہے، میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں"۔

"ہار!" وہ حیرت سے بولا "مگر۔۔۔ مگر وہ کیسا ہار ہے؟"

"کیا آپ اُس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نے کہاں سے خریدا ہے؟ بس آپ اتنی بات پوچھ لیجیے"۔ میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ سوچ میں پڑ گیا "یہ تو بہت معمولی بات ہے میں اُس سے ابھی پوچھے لیتا ہوں لیکن اگر اُس نے کوئی اور سوال کیا؟"

"کیا آپ اُسے علیحدہ کسی کمرے میں نہیں بلا سکتے؟"

"میں اُسے کہیں بھی بلا سکتا ہوں"۔

"تو بلا لیجیے"۔

"اچھا"۔ وہ کچھ دیر ٹھیرا رہا، پھر واپس عمارت کی طرف چل پڑا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ دروازے پر پہنچ کے وہ کچھ جھجکا اور اُس نے دربان کو حکم دیا کہ وہ مسز روپ پٹیل کو باہر بھیج دے۔ ہم دروازے سے ہٹ کے

کھڑے ہو گئے۔" دربان فوراً واپس آگیا۔ اُس کے ساتھ رُوپ بھی تھی۔ اُس کا چہرہ فق تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے اس زحمت کے لیے معافی چاہی تو اُس کا رنگ واپس آگیا۔ "مسز رُوپ! کیا آپ مجھ سے کچھ سلوک کریں گی؟" راج کرشنا نے شرم سار لہجے میں پوچھا۔

"ضرور، آپ کہیے، میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرا دوست ظہیر خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ نے یہ ہار جو آپ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے کس طرح حاصل کیا ہے؟ کس طرح سے مراد یہ ہے" راج کرشنا نے وضاحت کی "کہ کب اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟ بےشک آپ جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بے حد نجی بات ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہم نے اسے کوئی تین سال ہوئے خریدا تھا۔ یہ چار موتی اور یہ ہیرا، مجھے ان کی قیمت کا تو پتہ نہیں ہے مگر یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے اور ٹیل صاحب نے ہماری شادی کی تیسری سال گرہ پر مجھے پہنایا تھا۔ یہ ہار میں نے ہی پسند کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اسے خرید بھی لیا ہے، سال گرہ آئی تو میں اسے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔"

"بہت شکریہ۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اسے کہاں پسند کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے بیشتر جواہر نانا بھائی کے ہاں سے خریدے ہیں، یہ ہار اُنھی کے ہاں سے خریدا تھا۔ وہ اسے عام نمائش کے لیے نہیں رکھتے تھے۔"

"کیا انھوں نے اس ہار کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

"کچھ ایسا یاد پڑتا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "انھوں نے کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے اُن کے ہاتھ بیچ گیا ہے مگر ایسی باتیں تو تمام جوہری کرتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ کیا اس ہار سے کوئی انوکھی بات وابستہ ہے؟"

"ہو سکتی ہے۔" راج کرشنا نے کہا "مگر نانا بھائی سے تصدیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی انوکھی بات ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ چاہیں تو یہ ہار لے جائیں، اس طرح آپ کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ پھر میں آپ سے واپس لے لوں گی۔" رُوپ نے ہار اُتارتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے آنکھوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔" راج کرشنا نے کہا۔

"کیا آپ ہار مجھے دکھائیں گی؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

مسز رُوپ نے ہار میرے سپرد کر دیا۔ میں نے غور سے وہ ہیرا اور موتی دیکھے اور ہار میری انگلیوں میں کانپنے لگا۔ بالکل وہی، یہ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے گئے تھے اور یہ ہیرا، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہی جسامت، وہی نیلا رنگ، وہی چمک دمک، اسے میں نے سب سے پہلے بدھ گیا میں انجین کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو اُس نے اسے مجھ سے چھپا لیا تھا، پھر یہ ہیرا کوراکی اُس پوٹلی میں بھی موجود تھا جسے وہ انجین کی موت کے بعد بدھ گیا سے ہمارے گھر لائی تھی اور جب ابّا جان نے وہ پوٹلی کھول کے دیکھی تھی تو اُس میں دوسرے ہیروں کے ساتھ یہ ہیرا بھی دمک رہا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان جواہر میں میری مالا جیسے چند موتی بھی تھے۔ ابّا جان نے پوٹلی فوراً بند کر لی تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں تک تو مکان کی رقم سے اُن کا گزارا ہوا ہو گا پھر مہینوں کی تنگی سے، پھر ابّا جان کو یہ جواہر بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہو گی۔ انھوں نے یہ قدم سب سے آخر میں مجبوراً اٹھایا ہو گا۔ شبہے کی بس یہی گنجائش تھی کہ ممکن ہے مسز رُوپ کے ہار میں، یہ ہیرا اُس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہیرا ہو اور موتی بھی میرے موتیوں سے اس حد تک محض مشابہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ دُنیا میں صرف یہی ہیرا اور موتی ہوں۔ اس شکل وصورت کے اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ شہر، اس شہر میں ابّا جان کا قیام، مولوی اکرم کی زبانی سنے ہوئے اُن کے حالات، اسی شہر میں ہیرے کی فروخت، نانا بھائی کا یہ کہنا کہ اسے ایک ضرورت مند بیچ گیا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے میرے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہار واپس کر دیا۔ مجھ سے اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جا سکا۔

"کیا آپ کی اس ہار سے کوئی وابستگی ہے؟" مسز رُوپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے دہشت سے کہا "آپ کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں، جب بھی آپ کو اس ہار کی ضرورت ہو، بے تکلف مجھ سے مانگ لیجیے گا۔" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا "اور کرشنا جی! آپ نے ظہیر خاں صاحب کی اتنی تعریفیں کی ہیں، کبھی انھیں ہمارے گھر لائیے۔"

"ضرور مسز رُوپ!" راج کرشنا نے یہ کہتے ہوئے میری کمر تھپکی۔ "آؤ چلیں۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راج کرشنا تمام راستے خاموش رہا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت ڈرائنگ رُوم میں شام سے راج کرشنا کی منتظر ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

بازیگر
زندگی زندگانی کے لیے
ایک نوجوان کی خونی رنگ سرگزشت
بابر زمانی حنائی کی
آپ بیتی، جگ بیتی
باقی آیندہ شمارے میں پڑھیے!



گورڈن جیفریز ★ نکہت انصاری

مغرب سے درآمدہ، تازہ تر

اکثر وقت بالا ایشر تحریریں

ایک سرکش نوجوان کی عبرت انگیز داستان

سلو کیفے میرا پسندیدہ ریستوراں نہیں تھا۔ مجھے اس قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھنے سے سخت کوفت ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے میری بس چند منٹ پہلے جا چکی تھی اور دوسری بس آنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ یہ آدھا گھنٹہ بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے نہیں گزارا جا سکتا تھا اس لیے میں طوعاً و کرہاً سلو کیفے کی طرف بڑھ گیا کیفے میں داخل ہوتے ہی سماعت کو ناگوار گزرنے والی موسیقی کی تیز لہر نے میرا استقبال کیا۔ میں بوکھلا گیا۔ مجھے موسیقی پسند ہے لیکن ایسی نہیں جس سے کانوں کے پردے متاثر ہو جائیں۔ کیفے میں گویا در و دیوار سے موسیقی کی لہریں نکل رہی تھیں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن بس اسٹاپ پر آدھے گھنٹے کھڑا رہنا میرے بس میں نہیں تھا اس لیے میں بُرا سا منہ بنا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

چند نوعمر لڑکیاں موسیقی کے بکس پر جھکی ہوئی تھیں۔ کیفے میں چھ سات لڑکے بھی موجود تھے، لڑکوں نے اپنی ٹانگیں میزوں پر پھیلا رکھی تھیں۔ انھیں دیکھ کے یہ احساس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوں۔ ایسے ہوٹلوں میں اسی قماش کے لڑکوں اور لڑکیوں کی نشست رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں ان ہنگامہ خیز کیفوں سے دور بھاگتا تھا۔ میں طبعاً ایک پُرسکون پسند آدمی ہوں۔

میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ کافی آنے میں دیر نہیں لگی۔ اگرچہ وہ زیادہ خوش ذائقہ نہیں تھی لیکن بس اسٹاپ پر ٹانگیں تھکانے سے اُسے حلق میں اتارنا بہتر تھا۔ ابھی میں نے پیالی سے تیسری یا چوتھی چسکی لی تھی کہ لڑکوں میں سے ایک دراز قد لڑکا کرسی سے اُٹھا اور تیر کی طرح سیدھا میری طرف

آیا۔ اُس کا چہرہ کرخت تھا اور آنکھوں سے سفاکی جھلک رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے عجیب انداز میں ماچس مانگی جیسے کوئی قرض خواہ اپنی رقم کا تقاضا کر رہا ہو، میں نے خاموشی سے ماچس نکالی اور اُس کے حوالے کر دی۔ اُس نے مغربی فلموں کے کسی ہیرو کی طرح سگریٹ سُلگایا اور ماچس میز پر پھینک دی وہ پھسلتی ہوئی فرش پر جا گری۔ لڑکے کا یہ انداز انتہائی تکلیف دہ اور گستاخانہ تھا لیکن میں ضبط کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔ لڑکے نے ماچس فرش سے اٹھا کر مجھے دینے اور معذرت کرنے کے بجائے اپنے بھاری جوتوں سے اُسے کچلا اور اطمینان سے اپنی میز پر چلا گیا۔ میرے پورے جسم میں آگ سی لگ گئی لیکن میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

میں نے کنکھیوں سے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ کاؤنٹر کی اوٹ سے ایک بوڑھا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اُس سے میری نگاہیں چار ہوئیں تو اُس نے اپنی بھنویں آسمان کی طرف اُٹھا کر بے بسی ظاہر کی۔ غالباً اُس نے میرے چہرے پر ناگواری دیکھ لی تھی۔ بڈھے نے انگلی سے اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اُٹھ کے گیا تو اُس نے کہا ”جناب! میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔ شاید آپ اُس نوجوان سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہوں گے کہ اُس نے اپنا اخلاق کہاں کھو دیا ہے مگر آپ کو اس سے یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اُس میں اخلاق نام کی کوئی صفت کبھی دیکھی ہی نہیں گئی۔“ میں بے بسی سے پہلو بدل کے رہ گیا۔ ”بہرحال آپ کو ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ یہ نوجوان اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ اس کا نام ہالام ہے۔ اگر آپ نے ذرا بھی چھیڑ چھاڑ کی تو آپ کو کیفے سے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا جائے گا۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں، ضبط کا مظاہرہ بہادری ہے اور مصلحت کے عین مطابق بھی ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں دراصل یہ نہیں چاہتا کہ ان لونڈوں کی وجہ سے یہاں کوئی ہنگامہ ہو۔“

”یہ لڑکے نہایت ہی اعلا خاندانوں کے چشم و چراغ نظر آتے ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ کا اندازہ دُرست ہے۔ رئیسوں کے لڑکے اسی طرح بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بدتہذیب، ذلیل اور کمینے ۔۔۔ خصوصاً ہالام ان تمام لڑکوں سے زیادہ خطرناک ہے، بہت ہی بدمعاش۔ میں نے اسے کبھی کوئی کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا معلوم نہیں یہ اپنے اخراجات کے لیے رقم کہاں سے حاصل کرتا ہے۔“

”آپ کا بل تو ادا ہو جاتا ہو گا؟“ میں نے طنز سے پوچھا۔

”بل وِل چھوڑیے جناب! مجھے بل سے زیادہ اُس ٹوٹ پھوٹ کی فکر رہتی ہے جو ان لوگوں کی وجہ سے کسی بھی وقت ممکن ہے۔ میں اُس روز خود کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی تصور کرتا ہوں جب یہ لوگ کیفے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے اور بل ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔“

”آپ کو ان کے داخلے پر پابندی لگا دینی چاہیے۔“

”تاکہ یہ ہر روز کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور کرتے رہیں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”نہیں جناب! میں آپ کا یہ مشورہ قبول نہیں کر سکتا لیکن یاد رکھیے میں کسی نہ کسی دن ہالام سے انتقام ضرور لوں گا۔ یہ لڑکا میرے لیے سوہانِ روح ہو کے رہ گیا ہے۔“

”کیفے چلانا واقعی بہت ہمت کا کام ہے۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

”جی ہاں۔ آپ کا اندازہ دُرست ہے۔“

میں نے کنکھیوں سے ہالام کا جائزہ لیا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا مالک تھا۔ اُس کے چہرے سے درندگی ٹپکتی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہر شخص پہلی نظر میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ ایک غنڈا ہے اور اُس سے لحاظ و مُروّت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ”میرا خیال ہے اس لڑکے میں تمام ترعیوب کے باوجود کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ضرور ہو گی؟“ میں نے کہا۔

بوڑھے نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ میں نے تو اس میں آج تک کوئی اچھائی نہیں دیکھی، یہ متعدد بار قانون کی زد پر آ چکا ہے۔ کئی بار جرمانہ ادا کر کے چھوٹا ہے ۔۔ دو ایک بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے اب اسے پولیس کی طرف سے آخری بار تنبیہ کی گئی ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کے باوجود ہر بُرے شخص میں کوئی نہ کوئی اچھی بات بھی ضرور ہوتی ہے۔“

”یہ آپ دیکھ رہے ہیں؟“ بوڑھے نے اپنے بائیں گال کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تحفہ اسی کا دیا ہوا ہے۔“ اُس نے اپنے گال پر ایک گہری خراش سہلاتے ہوئے کہا۔ ”جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو اس نے زبردست ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے باہر نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں مجھے یہ تحفہ پیش کیا گیا۔“

بوڑھا ایک بوڑھی خاتون کو کافی دینے کے لیے کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ خاتون موسیقی کے بکس کے قریب کی ایک میز پر بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ میری طرح وہ بھی اس ماحول سے نفرت کرتی ہے لیکن کسی وجہ سے مجبور ہو کر یہاں آ بیٹھی ہے۔ ممکن ہے اُسے بھی بس اسٹاپ پہنچنے میں تاخیر ہو گئی ہو۔

قریب بیٹھے ہوئے لڑکوں میں اچانک کسی بات پر تکرار شروع ہو گئی اور وہ اُٹھ اُٹھ کے اُچھل اُچھل کے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگے۔ معاً ایک لڑکا لڑکھڑا کے بڑھیا کی میز سے جا ٹکرایا۔ میز اُلٹ گئی۔ بڑھیا کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کے فرش پر گری۔ کافی کے گرم چھینٹے اُس کے بے داغ لباس پر گرے۔ اُس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا اور وہ کانپنے لگی۔ ہالام دوسرے لڑکوں کی

حرکتوں سے بے نیاز تھا اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس نے ایک دم ناخنوں سے توجہ ہٹا کے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ پھر اُس لڑکے کو حکم دیا جو میز سے ٹکرایا تھا۔ "خاتون کے لیے کافی کی دُوسری پیالی لائی جائے۔"

لڑکا کھِل کھِلا کے ہنس پڑا لیکن شاید ہالام کا حکم ٹالنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کاؤنٹر پر آیا، اُس نے بوڑھے سے کافی طلب کی اور پیالی لے جاکے بڑھیا کے سامنے رکھ دی۔ ہالام نے شاہانہ انداز میں بڑھیا کو کافی پینے کا اشارہ کیا مگر اسی اثنا میں ایک اور لڑکے کی ٹانگ کام کر گئی اور پیالی ایک بار پھر فرش پر گر کے چکنا چور ہو گئی۔ "دوسری پیالی لاؤ۔" ہالام غرّایا! اس بار اُس کا لہجہ انتہائی خطرناک تھا۔

"لیکن ہ...." قصوروار لڑکے نے کچھ کہنا چاہا۔

"بکواس بند کرو۔ جو کہا گیا ہے وہ کرو۔" ہالام نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ اُس کے لہجے میں عجیب تاثر تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی سن سنانے لگی۔ دوسرا لڑکا بُرا سا منہ بناتے ہوئے کاؤنٹر پر آیا اور کافی لے کے واپس چلا گیا۔

ہالام بڑھیا کی طرف جھکا۔ "ان لڑکوں کو معاف کر دینا ماں! دراصل ہم لوگوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔"

"زبان بند رکھو۔" بڑھیا ہذیانی انداز میں چیخی۔ "تم غنڈے ہو، میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ان کے سرغنہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تربیت بھی تم ہی کرتے ہو۔ یہی سکھایا ہے تم نے؟"

"کافی پیو ماں! میں عموماً یہ ملامتیں سُن کر محظوظ ہوتا ہوں لیکن اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں تمھیں دیکھ لوں گی۔" بڑھیا نے پیالی ہالام کے منہ پر دے ماری اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ہالام کے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔ ایک لڑکے نے لپک کے بڑھیا کو پکڑنا چاہا لیکن ہالام نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔

میں نے جھک کے کاؤنٹر والے بوڑھے سے کہا۔ "دیکھو، میں تم سے کہہ رہا تھا ناکہ اس لڑکے میں کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور ہوگی۔"

تین پیالیاں ٹوٹ جانے سے بوڑھے کا منہ بگڑ گیا تھا۔ اُس نے ناگواری سے کہا۔ "ہاں۔ یہ حرکت اگر بڑھیا کے بجائے کسی اور نے کی ہوتی تو اُس کی گردن یقیناً ٹوٹ جاتی۔" اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ "بوڑھی عورتوں کے متعلق ہالام کا رویّہ واقعی حیرت انگیز ہے۔"

میں نے کافی ختم کی اور بل ادا کر کے باہر نکل آیا۔ بس کا وقت ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔

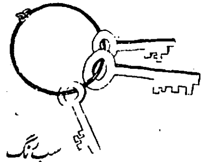
کوئی ایک مہینے بعد پھر یہ اتفاق ہوا کہ میری بس نکل گئی اور مجھے آدھا گھنٹہ گزارنے کے لیے سلو کیفے میں جانا پڑا۔ کیفے میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ آج ہالام موجود نہیں ہے البتہ اُس کے دُوسرے دوست دکھائی دے رہے تھے۔ ایک تعجب خیز بات اور نظر آئی۔ ہالام کے گروہ کے لڑکے آج میز پر ٹانگیں پھیلا کر نہیں بیٹھے تھے اور اُن کے اطوار سے بھی بدمعاشی یا غنڈا گردی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ غالباً ہالام کی غیر حاضری کے باعث ایسا ہو۔ سردار موجود نہ ہو تو فوج خود کو قابو میں رکھتی ہے۔ میں سیدھا کاؤنٹر پہ پہنچا کاؤنٹر والے بوڑھے نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ "کیوں جناب!" میں نے اُس سے کہا۔ "آج آپ کا پُرانا دوست ہالام دکھائی نہیں دے رہا ہے؟"

بوڑھا چند لمحوں تک گہری نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔ "ہالام اب دس مہینے سے پہلے دکھائی نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اُس کے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آگیا ہے۔" بوڑھے نے کاؤنٹر کے نیچے سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ "لیجیے آپ خود پڑھ لیجیے۔"

میں نے اخبار پڑھا۔ ہالام کو دس مہینے کی قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ خبر کے مطابق وہ ایک مکان میں نقب لگاتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ خبر کے نیچے ہالام کا بیان بھی شائع ہوا تھا۔ بیان میں اُس نے نقب زنی کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ "شہر کے ایک مکان کے باہر ایک بڑھیا بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اتفاقاً میں وہاں سے گزرا۔ میں نے بڑھیا سے اُس کی پریشانی کی وجہ معلوم کی۔ بڑھیا نے بتایا کہ یہ اُسی کا مکان ہے مگر وہ مکان کی چابیاں اندر بھول گئی ہے اور تالا لگا ہوا ہے اس لیے وہ اندر جانے سے قاصر ہے۔ اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں اُس کی مدد کروں۔ چنانچہ میں نے اُس کی مدد کی اور مکان میں داخل ہونے کے لیے اپنا مخصوص طریقہ اختیار کیا۔ یہ میرے لیے ایک معمولی کام تھا۔ ویسے بھی مجھے اطمینان تھا کہ مکان کی مالکہ نے خود مجھ سے اپنے مکان میں داخل ہونے کی درخواست کی ہے لیکن جب میں اندر گھسا تو انکشاف ہوا کہ بڑھیا نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ مکان اُس کا نہیں، کسی اور کا تھا۔ میں دندناتا اندر پہنچا تو وہاں کے مکینوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے انھیں صورتِ حال سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ خوف زدہ اور حواس باختہ ہو گئے تھے اس لیے انھوں نے مجھے دھکیل کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور فوراً پولیس کو اطلاع دے دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے پہنچ کے مجھے حراست میں لے لیا۔ میں نے ایک سپاہی کو بڑھیا کے متعلق بتایا اور اُس کی نگرانی میں باہر پہنچ کے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔"



خوش ذوق قارئین کے لیے

اِس ماہ کی خاص کہانی

آرک برٹن * اظہر کلیم



وہ کہانیاں جو صِرف مغرب میں لکھی جاتی ہیں!

خاص کہانی کے اِتنے صفحات کی تمام روایتوں کے مطابق

ایک نوجوان کی کہانی جس کی بیوی اُس سے ناراض تھی

وہ دو گھنٹے سے اسٹور میں گھسا ہوا ہے وہاں نہ جانے کیا کر رہا ہے؟ اُس کی بیوی سیو نے غصّے سے سوچا۔ سیو باورچی خانے میں تھی۔ ناشتے کے برتن دھونے اور باورچی خانہ صاف کرنے کے بعد اب وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اُس کا شوہر فان اسٹور میں کیا کر رہا ہے۔ وہ یہ بات تو کسی حد تک سمجھ رہی تھی کہ فان کوئی چیز تلاش کر رہا ہو گا لیکن یہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سی چیز تلاش کر رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ فان یقیناً کوئی ایسی چیز ڈھونڈ رہا ہے جو اسٹور کے بے ترتیب سامان میں کہیں دَب گئی ہے۔

فان کو اسٹور میں گئے ہوئے واقعی دو گھنٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ سیو کو اس کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اُسے تو فان سے ایک لمحے کی دوری بھی گوارا نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ فان صرف پندرہ منٹ پہلے اسٹور میں گیا تھا اور سیو کو یہ پندرہ منٹ بہت طویل مدّت محسوس ہوئی تھی۔ فان اسٹور میں جیک

تلاش کر رہا تھا تاکہ اپنی کار کی مرمت کرنے کے لیے اُسے جیک پر کھڑی کر سکے۔ اُس نے مرمت کے دوسرے اوزار تلاش کر لیے تھے لیکن جیک نہ معلوم کہاں دب گیا تھا۔ اُس کے پاس کسی کباڑی سے خریدا ہوا ایک پرانا جیک تھا۔ یہ پرانا جیک استعمال کرنے کی اُسے کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اس لیے اب اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں رکھا ہے۔ اسٹور میں بتی نہیں تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ روشن دان سے آتی ہوئی سورج کی شعاعیں اسٹور کی تاریکی پوری طرح دور نہیں کرتی تھیں۔ گویا وہ مٹیالے اجالے میں اوزار تلاش کر رہا تھا۔

آخر پرانا جیک مل گیا۔ فان نے ایک طویل سانس لے کے آستین سے اپنی بھیگی ہوئی پیشانی صاف کی۔ اوزاروں کی دھول اور سیاہی اُس کی آستین پر لگ گئی تھی۔ پسینہ پونچھتے وقت وہ چہرے پر بھی منتقل ہو گئی۔ پھر وہ اسٹور سے باہر نکلا تو سیو نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”تمھیں اِس کاٹھ کباڑ کی تو اتنی پروا ہے اور میری کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ تم خود کو ہر وقت مصروف رکھنے کے عادی ہو۔ کیا تمھاری مصروفیات میں مَیں شامل نہیں ہوں؟ کیا تمھارے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم کار کی مرمت کرنے جا رہے ہو۔ اُسے تم کار کہتے ہو کار، حالانکہ وہ صرف کاٹھ کباڑ کا مجموعہ ہے۔ اِس کھٹارے کا تو تمھیں اتنا دھیان رہتا ہے اور بیوی کی طرف دیکھنے تک کی فرصت نہیں ہے۔“

”تمھیں تو ہر وقت بس بہانے کی تلاش رہتی ہے تاکہ مجھ سے لڑ سکو۔“ وہ زیرِ لب مسکرایا۔

”میں کیا دیوانی ہوں جو خواہ مخواہ لڑوں گی۔“ وہ چیخی۔ ”تم لڑنے کا موقع ہی کیوں دیتے ہو؟“

”موقع نکالنا تو تمھارا دل پسند مشغلہ ہے ڈارلنگ!“ اُس نے شریر نگاہ سے بیوی کی طرف دیکھا۔ ”بھلا بتاؤ، یہ بھی کوئی لڑنے کا موقع ہے، میں کار کی مرمت......“

”جہنم میں جائے تمھاری کار اور اُس کی مرمت۔“ اُس نے پاؤں پٹخ کے باورچی خانے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر لیا۔ فان کارڈ بورڈ کا ڈبا اُٹھائے ہوئے سیڑھی پہ کھڑا رہ گیا۔ اُس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے سیو سے اُس کی آنکھیں ٹکرائیں۔ سیو نے ہونٹ سکوڑ کے منہ پھیر لیا۔

فان خوش دلی سے مسکرا دیا۔ اُسے اپنی بیوی غصے میں بہت حسین لگتی تھی۔ وہ اُسے بے حد چاہتا تھا لیکن مصروفیت کی وجہ سے چاہت کے اظہار کا موقع کم ملتا تھا۔ غالباً اسی لیے سیو یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اُسے مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔ وہ اُس کی مصروفیات سے چڑنے لگی تھی۔ ”ٹھیک ہے۔“ فان نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے۔ ”اس وقت کچھ فرصت ہے، بہتر ہوگا کہ میں وہ کام مکمل کر لوں، جو ایک عرصے سے ادھورا پڑا ہے۔“ اُسے خیال آیا کہ اُس کی بیوی کو اسپورٹ کار پسند ہے۔ پھر اُس نے اپنی کار کے متعلق سوچا کہ بے شک وہ ایک پرانی کار ہے اور اُس کے پہیوں میں چال آگئی ہے، آئل پریشر کم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی موٹی خرابیاں اور ہیں لیکن یہ خرابیاں مرمت کر کے درست کی جا سکتی ہیں۔

اُس نے کار لکڑی کے گیراج سے دھکیل کے باہر نکالی اور گھر کے سامنے سڑک کے دوسری طرف بجری اور سیمنٹ کے فرش پر کھڑی کر دی۔ یہ جگہ اُس کے گھر سے بے حد قریب تھی۔ اُس نے کار کے پچھلے پہیوں کے نیچے ایک ایک اینٹ رکھی اور سامنے کی طرف جیک لگا کے گاڑی فرش سے اوپر اٹھا دی۔ گاڑی فرش سے اُٹھ گئی تو اُسے سامنے کے پہیے نکالنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اُس نے اُنھیں گاڑی سے الگ کر دیا۔

ڈبے نکال کے اُس نے گاڑی کے نیچے رکھے۔ ہر ڈبے میں مختلف اوزار رکھے جا سکتے تھے۔ فان نے چند خالی ڈبے پیٹرول کی ٹنکی کے نیچے رکھے اور ٹنکی سے سارا پیٹرول نکال لیا۔ ٹنکی کے تمام نٹ آسانی سے کھل گئے تھے۔ ایک نٹ تو بہت جلدی کھل گیا تھا مگر آخری نٹ کچھ ضدی نکلا۔ وہ چھوٹے پیچ کس سے نہیں کھلا تو فان کو پلاس استعمال کر کے اُسے الگ کرنا پڑا۔ اب اُسے رینچ کی ضرورت تھی۔ اُس نے گاڑی کے نیچے لیٹے لیٹے ہاتھ اِدھر اُدھر گھمایا اور رینچ تلاش کرنے لگا۔ اسی اثنا میں اُسے ایک پیاری سی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو!“

اُس نے سر گھما کے دیکھا تو اُسے دو ننھے ننھے جوتے نظر آئے۔ جوتوں پر خوش نما بٹن لگے ہوئے تھے۔ فان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ہیلو کلیر۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ ”کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟“

کلیر محلے کی ایک ننھی بچی تھی۔ وہ ایک ٹائر پہ بیٹھ گئی۔ یہ ٹائر فان ہی نے گاڑی سے الگ کر کے کار کے سامنے رکھا تھا۔ ٹائر پر بیٹھنے کے بعد ننھی کلیر نے سر جھکایا۔ غالباً وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ فان گاڑی کے نیچے لیٹا ہوا کیا کر رہا ہے۔ اُس نے اپنا سر اس حد تک جھکا لیا کہ وہ فرش سے مَس ہونے لگا۔ اب وہ فان کا چہرہ آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے فان کے چہرے پر سیاہی لگی ہوئی دیکھی تو کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ ”انکل! انکل! آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟“

”یہ تم کہاں بیٹھ گئیں کلیر! پیاری بچی! تمھارے کپڑے خراب ہو جائیں گے، چلو اٹھو، شاباش۔“

”دیکھیے انکل میرے پاس کیا ہے۔“ کلیر نے فان کی ناک کے سامنے ربڑ کی ایک سرخ گیند لہرائی۔

”واہ وا، یہ تو بڑی خوب صورت گیند ہے۔ کہاں سے لائی ہو؟ مجھے دے دو۔“

"واہ! آپ... لا دیں دے دوں؟ میری گیند ہے میرے ڈیڈی لائے ہیں۔"

"ہاں مت دو۔ ہم اس سے اچھی گیندلے آئیں گے۔" یہ کہہ کے فان پھر کار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پیٹرول کی ٹنکی کا ایک نٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس نے ٹوٹا ہوا نٹ نکالنے کے لیے رینچ ٹٹولا۔ رینچ اُس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اُس کی پوری توجہ ٹوٹے ہوئے نٹ کی طرف مرکوز ہوگئی وہ اُسے رینچ کی مدد سے گھماکر کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

کلیر نے اُسے گیند کی طرف متوجہ نہیں دیکھا تو اُس کا منہ بن گیا۔ شاید وہ اپنی گیند کی اور تعریف سننا چاہتی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر فان کو مخاطب کیا۔ "انکل! میری گیند دیکھیے۔" دیکھیے کا لفظ اُس نے کھینچ کے ادا کیا۔

"بعد میں دیکھوں گا کلیر۔" فان ٹوٹے ہوئے نٹ سے الجھا رہا۔

ننھی کلیر نے چڑ کے گیند اُس کے چہرے کی طرف اچھالنے کی کوشش کی لیکن گیند اُس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل گئی اور فان کے قریب سے لڑھکتی ہوئی گاڑی کے بالکل نیچے چلی گئی۔ "ہا، میری گیند نیچے چلی گئی۔ میری گیند نیچے چلی گئی۔ ذرا اٹھا دیجیے انکل۔"

"ایک منٹ انتظار کرو۔" فان نے کہا۔ "یہ نٹ نکال لوں پھر اٹھا دیتا ہوں۔" اُس نے رینچ ایک بار پھر نٹ پر جمایا اور زور لگانے لگا مگر نٹ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ رینچ بار بار نٹ کے پہلوؤں میں پھسل کر گولائی میں گھوم جاتا تھا۔ فان نے رینچ اچھی طرح کس دیا پھر رینچ کے دندانے نٹ کی کچی دھات میں پوری طرح پھنس گئے تو اُس نے قوت لگانی شروع کر دی۔

"اٹھا دیجیے نا۔ میری گیند اٹھا دیجیے۔" کلیر نے اصرار کیا۔

نٹ قوت لگانے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا مگر کلیر یہی رٹ لگائے جا رہی تھی کہ "گیند اٹھا دیجیے، گیند اٹھا دیجیے۔" فان کو کلیر بہت پیاری لگتی تھی مگر اُس کے بے وقت اصرار پر اُسے جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ نٹ سے الجھا ہوا تھا اور نٹ کھولنے میں اُسے پے در پے ناکامی ہو رہی تھی پھر بھی اُس نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ "ابھی دیتا ہوں کلیر! ابھی دیتا ہوں تم اتنی بے تاب کیوں ہو رہی ہو؟ اور ہاں، کیا تمھاری ممی کو معلوم ہے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟"

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ گاڑی کے نیچے تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ جائے تو نٹ پر زیادہ زور لگا سکتا ہے چنانچہ اُس نے اپنی ایڑیاں فرش پر جمائیں اور پیچھے کی طرف سرکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اُس کی قمیص کا ایک بٹن ٹوٹے ہوئے نٹ سے الجھ گیا۔ فان کو مجبوراً اُسی جگہ رُک جانا پڑا۔

"میری گیند دے دیجیے نا۔" کلیر نے ضد شروع کر دی۔ "انکل! کیا

ایک پادری نے ایک شخص سے پوچھا کہ تم گرجا سے کتنی دُور رہتے ہو اور کتنی دیر میں گرجا پہنچ سکتے ہو؟ اُس آدمی نے ترتیب سے دونوں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا (۱) آدھے میل (۲) تین گھنٹے۔

اوپیرا کا مشہور گلوکار رچرڈ ٹکر ایک بینک میں سَوڈالر کا چیک بھُنوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بینک میں اُسے کوئی پہچانتا نہیں تھا اور نہ اُس کے پاس اپنی شناخت کا کوئی ثبوت تھا۔ بینک منیجر نے اُس سے کہا۔ "میں آپ کو صرف اس صورت میں رچرڈ ٹکر تسلیم کر سکتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ گا کر سنائیں۔"

ٹکر نے چیک اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں صرف سَوڈالر کے لیے آپ کو کچھ گا کر سُناؤں تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں رچرڈ ٹکر نہیں ہوں۔"

کیلیفورنیا کا واقعہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص اپنی گاڑی کی چابیاں اگنیشن میں چھوڑ کر بینک میں گھس گیا ہے۔ بوڑھی عورت نے اگنیشن سے چابیاں نکالیں اور اُس کے پیچھے پیچھے بینک میں داخل ہوگئی۔ نوجوان شخص بینک کے خزانچی سے گفتگو کر رہا تھا۔ عورت نے قریب پہنچ کے اُس کا شانہ ہلایا اور کہا۔ "نوجوان یہ لو اپنی چابیاں۔ اگر تم انھیں اسی طرح بھولتے رہے تو اپنی کار سے بہت جلدی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

نوجوان شخص خزانچی کو پستول دکھا کر اس امر پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ ساری رقم اُس کے تھیلے میں ڈال دے۔ بوڑھی عورت کی آواز سن کے وہ ایک جھٹکے سے مُڑا، اُس نے مذمت کی نگاہ سے عورت کو دیکھا، ایک دم چابیاں جھپٹیں، پستول جیب میں ڈالا اور بجلی جیسی تیزی سے فرار ہوگیا۔

رحمت اللہ کا تحفہ

آپ میری گیند سے کھیلنے لگے؟ لائیے، مجھے دیجیے میری گیند۔"

فان نے سُنی اَن سُنی کر کے اپنا ایک ہاتھ آزاد کیا اور الجھا ہوا بٹن نٹ سے نکالنے لگا۔ اب تک اُس کے دونوں ہاتھ رینچ کے دستے پر جمے ہوئے تھے لیکن قمیص چھڑانے کے لیے ایک ہاتھ اُس نے ہٹا لیا تھا۔ اُس نے قمیص کو جھٹکا دیا تو اُس کے دوسرے ہاتھ کا بوجھ رینچ کے دستے پر بڑھا اور نٹ کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا پوری کار کو برداشت کرنا پڑا اور اس کا اثر جیک پر بھی پڑا۔ فان کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ "پیچھے رہو، پیچھے رہو۔" اُس نے بچی سے کہا۔ بچی اپنی گیند دیکھنے کے لیے گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل فرش پر جھک گئی تھی۔ "پیچھے رہو۔" فان نے پھر کہا۔ اُس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ بچی چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی اور دوبارہ ٹائر پر جا بیٹھی۔ فان کی قمیص بری طرح نٹ میں اُلجھی ہوئی تھی اور چونکہ وہ ٹنکی کے نیچے سے ہٹ گیا تھا اس لیے اُس کا چہرہ نٹ کے بجائے ٹنکی کے آخری حصے سے بھی کچھ دُور تھا۔ اب وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ قمیص کیسے اُلجھی ہوئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُسے اُلجھاؤ کی نوعیت نظر آجائے تو قمیص چھڑانا آسان ہو جائے گا۔ اُس کے سر کے اوپر بہت ذرا سی جگہ تھی لہٰذا اب وہ صرف سر اٹھا کے ٹنکی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے ذہن میں



یہ بات بھی گھوم رہی تھی کہ جیک کچھ اور اوپر اُٹھا دینا چاہیے تھا تاکہ اُسے گاڑی کے نیچے کھسکنے اور سرکنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟" کلیر خاموش نہ رہ سکی۔ غالباً اُس کے دماغ سے وقتی طور پر گیند کا خیال نکل گیا تھا۔

فان ابھی تک قمیص چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب پیٹرول کی ٹنکی اُسے اپنے سینے پر کسی شہتیر کی طرح محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسی عجیب بات ہے۔ قمیص ایک نٹ میں اُلجھ گئی ہے اور اُس کی وجہ سے وہ گاڑی کے نیچے قید ہو گیا ہے۔ مجھے قمیص کی قربانی دینی ہی پڑے گی۔ اُس نے خود کو سمجھایا اور خالی ہاتھ سے قمیص کا جتنا کپڑا ہاتھ میں آیا، اُسے جکڑ کے کھینچنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے یکایک اُسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے۔ کار آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہی تھی۔

غالباً پرانا جیک کار کا بوجھ اور جھٹکے برداشت نہیں کر سکا تھا اسی لیے فان کار کے نیچے دبنے لگا۔

اُس کے ذہن پر اچانک خوف حملہ آور ہوا اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے دیوانہ وار کوشش کی کہ وہ کار کے نیچے دبنے سے محفوظ رہے لیکن کار اُس کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار ثابت ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ کار کے بوجھ سے دب گیا اور اس حالت میں پھنسی ہوئی قمیص کی وجہ سے اُس کے لیے حرکت کرنا ممکن نہیں رہا۔ وہ فوراً ساکت و صامت ہو گیا اور غور کرنے لگا کہ اس ناگہانی اُفتاد سے محفوظ رہنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ وہ پچھتانے لگا کہ کاش اُس نے کار کے اگلے حصّے کے نیچے بھی ایک ایک اینٹ رکھ دی ہوتی۔ اب وہ بہت خطرناک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جیک ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے فان نے کرب سے سوچا جیک میں یقیناً کوئی خرابی ہے۔

وہ دھیرے دھیرے کار کے نیچے اور زیادہ، اور زیادہ دبتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے ذرا سی حرکت کی تو اُسے محسوس ہوا کہ اگر اب بھی قمیص آزاد ہو جائے تو وہ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح سرک سرک کے، سمٹ کے کار کے نیچے سے نکل سکتا ہے لہٰذا وہ اپنی قمیص دائیں بائیں جھٹکنے لگا اور اُس کے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ یہ اطمینان کی سانس تھی قمیص نٹ سے نکل کے آزاد ہو گئی تھی۔

اگرچہ کار انتہائی آہستگی سے زمین پر بیٹھ رہی تھی لیکن اب فان کے پاس نکلنے کا موقع نہیں رہا تھا۔ اُس نے دائیں بائیں کروٹ لینے کی کوشش کی، ایک دو بار ایڑیوں کے بل زور لگایا لیکن یہ کوشش بھی کامیاب ہونے کے بجائے الٹی زحمت کا باعث بن گئی پیٹرول کی ٹنکی کا نچلا حصّہ اُس کا سینہ بھینچے دے رہا تھا۔ اُسے اپنے سینے پر انتہائی خوفناک بوجھ محسوس ہوا گویا اُس کے سینے پہ ایک بھاری چٹان دھری ہو۔ اُس کے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے۔ آخر اُس نے ایک بار پھر سرکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ بدقسمتی سے قمیص کا ایک اور حصّہ ٹوٹے ہوئے نٹ میں پھنس گیا اور گاڑی آہستہ آہستہ اُس کے سینے پر بوجھ بڑھانے لگی وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔

فان کو اپنی بیوی سیو کا خیال آیا۔ سیو اُس سے صرف بیس گز کے فاصلے پر باورچی خانے میں موجود تھی۔ اُس نے زور سے "سیو، سیو" چیخنے کی کوشش کی لیکن اُس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اُس کے منہ سے صرف کراہ جیسی آواز نکلی اور وہ بھی فوراً دم توڑ گئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" بچّی نے اُس کی کراہ سُن کے پوچھا۔

یہ آواز سنتے ہی فان کی مایوسی ایک بار پھر اُمید میں بدل گئی۔ "کلیر! بیٹی کلیر!" اُس نے اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تمھیں وہ لیور نظر آ رہا

ہے۔ غور سے دیکھو جیک کے سوراخ میں ایک چھوٹی سی سلاخ ہے۔ اُسے ذرا اوپر سے نیچے ہلا دو۔"

کلیر کی طرف سے اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ایک ننھی بچّی اُس کی بات سمجھ سکتی ہے؟ اُسے کیا پتہ کہ لیور کیا چیز ہے۔ کلیر غالباً کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ فان نے ایک بار پھر اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو، تمھیں اپنے سامنے ایک سلاخ نظر آرہی ہو گی، لوہے کی چھڑی۔ اُسے اوپر سے نیچے ہلاؤ۔"

کیا کلیر جیسی ننھی بچّی جیک پمپ کر سکتی ہے؟ فان کی پیشانی ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئی۔ بچّی خاموش تھی۔ غالباً وہ اس امر سے آگاہ نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے آدمی کے قریب کھڑی ہے جو موت کے خوں خوار جبڑوں میں پہنچ چکا ہے۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ ابھی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی تھی۔

"کلیر!" فان نے چیخنے کی کوشش کی۔ "دوڑ کے جاؤ۔ میری بیوی، اپنی آنٹی کو بلاؤ یا اپنی ممّی کو بلاؤ۔ جلدی سے جاؤ اور انھیں بتاؤ کہ مجھے اُن کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ جلدی جاؤ کلیر! جلدی جاؤ۔"

"اوُں ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" بچّی نے کہا۔ "میری گیند۔"

"جہنّم میں گئی تمھاری گیند۔ اپنی ممّی کو بلاؤ۔" اُس نے پوری قوت سے چیخنے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز زیادہ بلند نہیں ہو سکی۔

کار کا بوجھ اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ اس حالت میں کلیر سے بات کر لینا ہی بہت تھا۔ فان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اُس کی پسلیوں پر اس قدر قوت صرف کر رہا ہے کہ پسلیاں ایک دم تڑاخ سے ٹوٹ سکتی ہیں۔ اُس کی سانس بُری طرح پھول گئی تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور پیشانی کے علاوہ پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس نے دائیں طرف سر گھمایا۔ اُسے بچّی کے ننھے ننھے جوتے نظر آرہے تھے۔ اُس نے کلیر سے پھر کہا "کسی کو بُلاؤ۔" اُس کی آواز سنتے ہی ننھے جوتوں نے حرکت کی اور اُس کی نگاہ کے سامنے سے ہٹ گئے۔ پھر کلیر کی مہین آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی "نہیں۔ میں نہیں بلاؤں گی۔ آپ نے مجھے میری گیند جو نہیں دی۔"

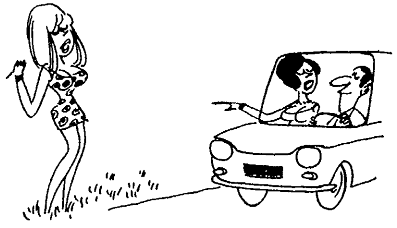
اب اُس کے سینے پر کار کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے اپنا دم گھٹتا ہُوا محسوس ہونے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنا سینہ فوراً آزاد کر لینا چاہیے ورنہ اُس کی پسلیاں چٹخ جائیں گی، ٹوٹ جائیں گی۔ کار بتدریج زمین پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ سامنے کے پہیّے الگ ہونے کی وجہ سے وہ فرش سے چپک کر اُسے پُوری طرح کچل سکتی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنی قمیص پکڑ کے کھینچنے لگا۔ "چھوٹ جا بدبخت چھوٹ جا۔" اُس نے بدحواسی میں قمیص سے کہا لیکن نٹ اور قمیص کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔

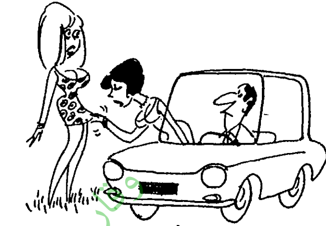
"آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟" کلیر نے دریافت کیا۔ اُس کا لہجہ تجسّس سے بھرپور تھا۔

وہ غرّایا۔ "اپنی ماں کو بُلاؤ کلیر! اپنی ماں کو بلاؤ۔ یہ کار مجھے کچل کر ہلاک کر رہی ہے۔ کیا تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں۔ اچھّی بچّی جاؤ، فوراً اپنی انٹی یا اپنی ممّی کو بلاؤ۔ کلیر! پلیز کسی کو بلا دو۔ جلدی۔"

اُسے سانس لینے میں شدید دشواری ہو رہی تھی، خون اُس کے سر میں چکرا رہا تھا، کان بہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بری طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ بے بسی سے اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آخر یہ بچے ویسا کیوں نہیں کرتے جیسا کہا جاتا ہے؟

اب بالکل وقت نہیں رہا۔ اُس نے خود کو سمجھایا۔ اپنی مدد خود کرو لیکن جلدی۔ اس مصیبت سے نجات کا کوئی راستہ جلد از جلد تلاش کرو۔ لمحوں میں، ثانیوں میں۔ سوچو، اور سوچو۔ اُس نے ذہن پر زور دیا۔ جلدی سوچو فان ورنہ کوئی تمھاری لاش بھی نہیں پہچان سکے گا۔ اُس کے ذہن میں اپنی مسخ لاش کا نقشہ گھوم گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر اُس کے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے۔ اُس کے جسم پر کار کا بوجھ تھا۔ رکاوٹ کی وجہ سے کار کا بیٹھنا کچھ سست پڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود فان کے سینے پر مسلسل بوجھ بڑھ رہا تھا۔ تیل کے ڈبے؟ اُس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ تیل کے ڈبّے یقیناً کارآمد ہو سکتے ہیں۔ وہ اُس کے قریب ہی تھے۔ معاً فان کے بازو میں نئی قوّت پیدا ہو گئی۔ وہ ایک ڈبّا پوزیشن میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کا آزاد ہاتھ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے رینچ پکڑ رکھا تھا تاکہ دائیں بائیں زور لگاتے وقت سہارا مل سکے







سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی۔ سیو اس سے صرف چند گز دور تھی مگر اُس کی آواز اُس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بوجھ نے اُس کی گویائی نہ چھین لی ہوتی تو وہ اُسے پکار سکتا تھا اور سیو آسانی سے اُس کی آواز سن سکتی تھی مگر اب؟

آخر ہار کے اُس نے جدوجہد ہی ترک کر دی۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، موت اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ اب مجھے صبر اور اطمینان سے اپنے بھیانک انجام کا انتظار کرنا چاہیے۔ اُس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

اچانک اُس کے کانوں میں بھاری آہٹیں ٹکرائیں۔ یہ ڈاکیے کے آنے کا وقت تھا۔ آہٹیں ابھی فان سے دور تھیں اور یہ امّید بھی نہیں تھی کہ وہ قریب آئیں گی مگر شاید ڈاکیے نے کار کے پاس کلیر کو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ قریب آ گیا۔ فان نے اُس کی آواز سنی "ہیلو ننھی گڑیا! مجھے افسوس ہے کہ آج تمہارے ہاں کا کوئی خط نہیں ہے مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کیا تمہاری ممّی کو معلوم ہے کہ تم سڑک پار کر کے یہاں کھڑی ہو؟"

"مدد کرو، اُف میری مدد کرو" فان نے چیخنے کی کوشش کی لیکن بوجھ اُس کے سینے کے ساتھ ساتھ اُس کی آواز بھی دبا چکا تھا۔ مدد اس قدر قریب دیکھ کے اُسے ایک بار پھر امید کی کرن دکھائی دی تھی لیکن وہ تو مدد کے لیے آواز بلند کرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ بوجھ خوف ناک انداز میں اُس کے سینے پر منتقل ہو رہا تھا۔

اُس نے پھر ڈاکیے کی آواز سنی "میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ آج تمہارے ہاں کا کوئی خط نہیں ہے"

"میں اپنی گیند لینا چاہتی ہوں" فان نے کلیر کی آواز سنی "اس کار کے نیچے انکل پتہ نہیں کیا کیا کر رہے ہیں مگر میری گیند اٹھا کر نہیں دیتے"

فان نے ڈاکیے کی ہنسی سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "تمہارے انکل اپنے کام سے فارغ ہو کے تمھیں گیند نکال دیں گے۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ اس وقت وہ کتنے مصروف ہیں" پھر اُس کی آہٹیں دور ہونے لگیں۔ وہ وہاں سے واپس جا رہا تھا فان کا دل ڈوبنے لگا۔

اُسی وقت فان نے کلیر کی رندھی ہوئی آواز سنی، وہ ڈاکیے سے کہہ رہی تھی "جائیے، اب میں آپ سے نہیں بولوں گی، کبھی نہیں بولوں گی"۔ وہ رونے لگی۔

"اچھّا اچھّا" ڈاکیا رک گیا "ارے تم تو اتنی سی بات پہ رونے لگیں۔ ٹھیرو، میں نکال دیتا ہوں تمہاری گیند" وہ کار کے قریب آیا اور نیچے جھکا۔ اُس کی نگاہ فان کے چہرے پر پڑی۔ فان کا چہرہ کفن کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ اُس پر نیم بے ہوشی طاری تھی لیکن ڈاکیا تو پوری طرح ہوش میں تھا۔ اُس نے کار آہستہ آہستہ بیٹھتے ہوئے دیکھ لی تھی اور فان کی ایک پسلی ٹوٹنے کی آواز بھی سن لی تھی۔ اُسے وہ ناکارہ جیک بھی نظر آ گیا تھا جو کار کا بوجھ سنبھالنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔



ڈبّا خاصا مضبوط تھا لیکن افسوس، اس قدر چھوٹا تھا کہ اسے سہارے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کار اُسے کچلنے کے بعد ہی کہیں ڈبّے پر جا کر رکتی۔ فان نے کسی دوسری چیز کے بارے میں غور کیا۔ اگر سنسی گاڑ دی جائے تو شاید وہ کار کا بوجھ سہار لے۔ اُس کے سینے پر مسلسل دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر ٹٹولا مگر ایک بھی سنسی اُس کے ہاتھ نہیں آئی حالانکہ وہ دو سنسیاں لے کے آیا تھا۔ شاید وہ اُس کے ہاتھ کی رسائی سے کہیں دور پڑی ہوئی تھیں۔

وہ دیوانہ وار ہاتھ چلانے لگا۔ فرش پر بار بار ہاتھ مارنے سے اُس کے ناخن ٹوٹ گئے اور اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ اُسے پورا بازو مفلوج محسوس ہونے لگا۔ اُس کا ذہن خوف سے جھن جھنا گیا۔ وہ ایک دیوانے قیدی کے مانند رہائی کے لیے بُری طرح الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے لگا لیکن اُس کی قوّت وزنی کار کی قوّت کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔ اُس کے سینے پر اس قدر بوجھ تھا کہ گھٹن کا احساس مزید بڑھ گیا۔

"سیو!" اُس نے بے حد مایوسی سے پکارا۔ اُس کی آواز سرگوشی